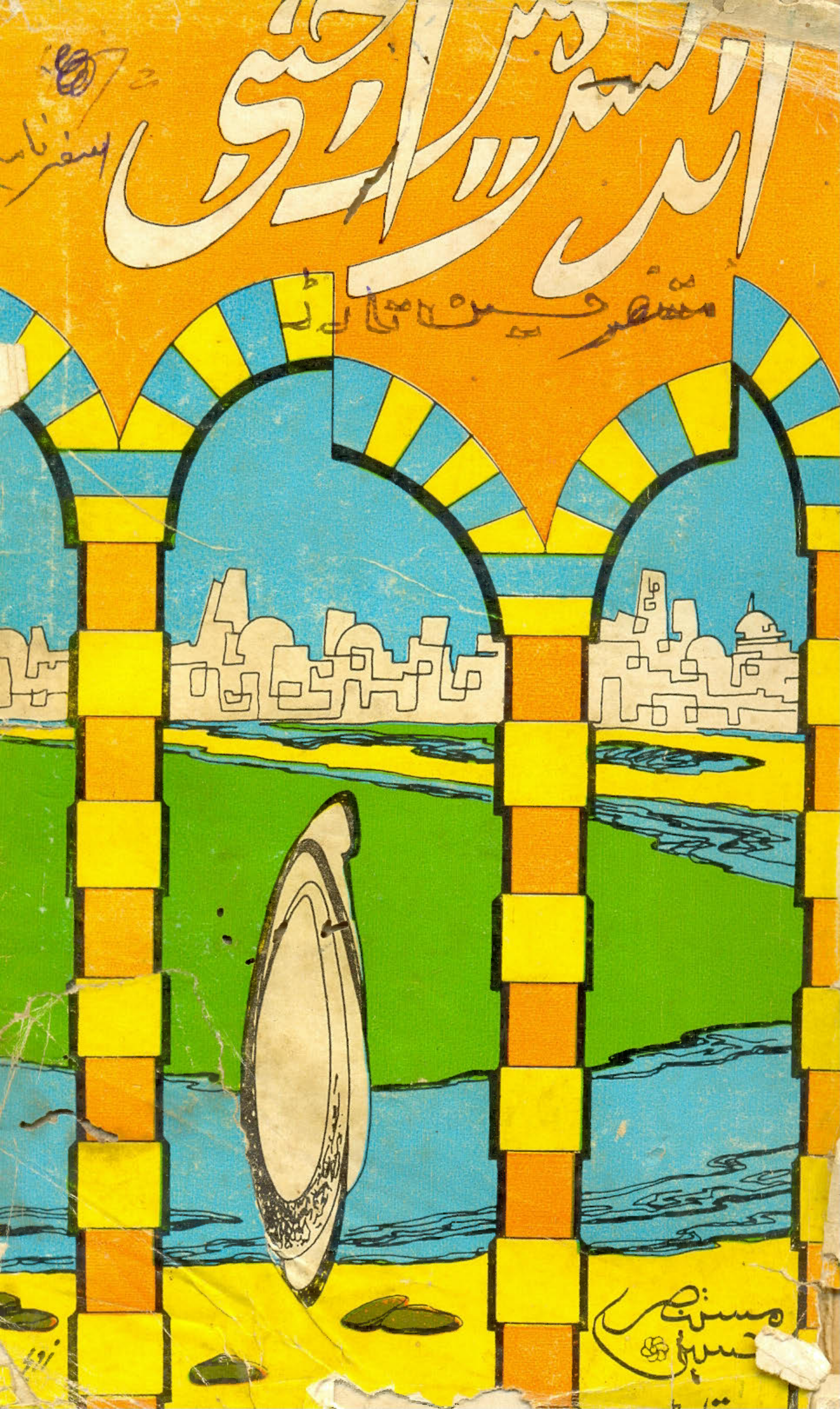
اندلس میں اجنبی
مستنصر حسین تارڑ

اُندلس میں اجنبی

مستنصر حسین تارڑ

التحریر • لاہور

اُردو بازار ○ کبیر سٹریٹ

اقبال بک ہاؤس صدر کراچی

پنجاب بک ہاؤس
فون نمبر ۲۱۲۲۳۵
اردو بازار کراچی

کتابوں میں
جدید اور
بلند معیار
ش کرنیوالے

جملہ حقوق محفوظ

بار اوّل : ستمبر ۱۹۷۶ء

ناشر : خالد سیف اللہ (التحریر، لاہور)

سرورق : آذر زوبی

مطبع : القائم پریس، لاہور

تعداد : گیارہ سو

قیمت : [redacted] روپے

کیپٹن پائلٹ

ساجد نذیر شہید* کے نام

کیسا ایسا ممکن ہے کہ میرے سامنے اب ہمیشہ کے لیے ایک خلا ہو گا، صرف ہوا ہو گی، ساجی کا جسم نہ ہو گا جس پر میں ہاتھ رکھ سکوں، جسے چوم سکوں، جسے گلے لگا لوں؟ کیا ایسا ممکن ہے؟

○

مرہمِ لطف و وفا تجھ کو کہاں آئے زخم
ہم سفر تجھ کو کہاں لے گئی تیری پرواز
آگ کس طرح ترے جسم کے نزدیک آئی
کیسے بزدل کے شعلوں سے دبا شعلہ ساز

(مصطفیٰ زیدی)

---

* میرا خالہ زاد بھائی، والدین کی اکلوتی اولاد، جو ۴۔ جولائی ۷۵ء کی صبح کوئٹہ میں کسی فنی خرابی کی بناء پر اپنے ہی ہوائی جہاز کے شعلوں کی لپیٹ میں آیا اور اُس کا سلگتا ہوا ۲۴ سالہ بدن ۶۔ جولائی ایک بجے دوپہر ہمیشہ کے لیے سرد ہو گیا۔

فہرست

۱- محبتوں' اذیتوں کی جانب ، ۱۳

۲- رہے تورو ، ۳۲

۳- تپتی دوپہر میں موت ، ۴۲

۴- گرم خوشبو کی شام ، ۵۵

۵- بدبخت قشتالیہ ، ۶۴

۶- ثوریا! ثوریا! ثوریا ، ۸۲

۷- مدینہ سالم ، ۱۰۵

۸- گویا کہ...... میڈرڈ ، ۱۰۹

۹ - قرطبہ ۔ دُور افتادہ ، ۱۲۳

۱۰ - قرطبہ ۔ دُور افتادہ اور تنہا ، ۱۴۱

۱۱ - ہجومِ تخیل ، ۱۵۰

۱۲ - واللہ! مستنصر باللہ ، ۱۷۶

۱۳ - ...... اور اشبیلیہ ، ۲۰۵

۱۴ - بادشاہ، بیگم اور غلام ، ۲۲۱

۱۵ - قدیم قرمونہ ، ۲۲۸

۱۶ - فلیمنکو ، ۲۳۸

۱۷ - جہاں حُسن رچ گیا ہے ، ۲۵۳

۱۸ - وہ کونسا فسوں ہے ، ۲۵۸

۱۹ - مرسیڈس ، ۲۷۶

۲۰ - غرناطہ تو نہیں چھن گیا ، ۲۸۵

۲۱ - کوئے یار کا مسافر ، ۲۹۷

۲۲ - اور ماریا زامبرا ناچ رہی تھی ، ۳۰۱

۲۳ - الحمرا میں ایک رات ، ۳۲۰

۲۴ - اندلس میں اجنبی ، ۳۳۴

کرنل محمد خان

مصنف عموماً اپنی پہلی کتاب پر دوسروں سے دیباچہ لکھواتے ہیں کہ قارئین سے تعارف بھی ہو جائے اور زبانِ غیر سے اپنے مخفی محاسن بھی آشکار ہو جائیں۔ بعد کی کتابوں پر دوسرے لوگوں کے دیباچوں اور مقدموں کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہی فارمولا علامہ اقبال نے برتا اور بے شمار یا دشما قسم کے مصنفین نے بھی، لیکن مستنصر حسین تارڑ اس قاعدے کے اُلٹ چلے ہیں۔ انھوں نے اپنے پہلے سفرنامے کا دیباچہ خود لکھا اور کسی بیرونی سفارش یا دباؤ کے بغیر اپنے گُن گوائے اور گنوائے۔ اب ان کے دوسرے سفرنامے پر ایک غیر کے لیے کچھ مقدمہ لکھنا گیسوئے تابدار کو اور تابدار کرنے کی کوشش ہے جو ایک لاطائل کوشش ہے کہ مستنصر کی دی ہوئی تاب میں کسی مزید تاب کی گنجائش نہیں اور اِدھر میری مشاطگی بالکل محدود بلکہ مفقود ہے۔

چند سال ہوئے میں نے پہلے مستنصر کا سفرنامہ "نکلے تری تلاش میں" پڑھا اور پھر مستنصر سے ملاقات ہوئی۔ دونوں کو ایک دوسرے سے بڑھ کر خوبصورت پایا اور یہ اسی دوہرے حُسن کا رعب ہے کہ جب مجھ سے موجودہ سفرنامے کا دیباچہ لکھنے کو کہا گیا تو میں نے چار و ناچار فی الفور لبیک کہا حالانکہ دیباچہ لکھنا تو درکنار، مجھ سے کوئی گرد پوش کے لیے چند سطور بھی لکھنے کو کہے تو مہینوں روپوش رہتا ہوں کہ سچ مچ لکھنی ہی نہ پڑ جائیں — میرا دیباچہ نویسی کا خانہ یکسر خالی ہے۔

مستنصر کا نیا سفرنامہ مجھ تک کتابی شکل میں نہیں، اجزا کی صورت میں پہنچا۔ کچھ یہاں سے کچھ وہاں سے۔ گویا اسے صحیح معنوں میں پڑھا نہیں، صرف چکھا ہے اور

چکھنے پر یہ معلوم ہوا کہ اس کی لذّت پہلے سفرنامے سے کسی طور کم نہیں۔ عین ممکن ہے کہ اُندلس کے تمام تر سفر میں ان کے ساتھ گھومتا تو اس کتاب مستطاب کی کئی خصوصی لذتوں سے آشنا ہوتا۔ بہر حال "اُندلس میں اجنبی" پڑھنے کے بعد ایک بات طے ہے کہ جوں جوں مستنصر کا قدم جوانی سے کہولت کی طرف بڑھتا ہے اس کی تحریر جوان تر ہوتی جارہی ہے اور ایک مصنف کی آبرو یا عظمت اس کی تحریر کی جوانی ہے جو لازوال ہے نہ کہ اس کا اپنا شباب جو بہر حال ناپائیدار ہے (خدا مستنصر کا شباب تا دیر قائم رکھے)۔

ادب میں آج کل سفرناموں کا فیشن بہت چل نکلا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس کے لیے تخلیقی کرب میں ڈوبنا پڑتا ہے نہ بحرِ علم میں شناوری کی ضرورت ہوتی ہے۔ بس سُوئی کے جس ناکے سے مسافر گزرا، اسی سے قاری کو بھی گزار دیا اور سفرنامہ بن گیا۔ بعض چلتے پھرتے لوگ سفر کو اس لیے بھی موضوع سخن بناتے ہیں کہ اس میں اہل وطن کی نظروں سے دُور، اجنبی دیار میں موضوع کے ساتھ اٹھکیلیاں کرنے کی خاصی گنجائش ہوتی ہے۔ نتیجتاً سفرنامہ کم اور رمزِ پارہ زیادہ بن جائے تو اسے گھاٹے کا سودا نہیں سمجھا جاتا۔ بحیثیتِ مزاح نگار میرا اپنا طریقۂ واردات بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

اس کے برعکس زمانۂ قدیم کے سفرنامے پڑھیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انسان تاریخی اور جغرافیائی کھنڈروں سے گزر رہا ہو اور مسافر راستے کی ہر سرائے اور کنویں پر علم کے انبار لگا کر اعلان کر رہا ہو کہ "لو بیٹا، جتنا ہضم کر سکتے ہو، کر لو اور باقی آئندہ نسلوں کے لیے چھوڑ دو۔"

مستنصر حسین تارڑ کے سفرنامے قدیم اور جدید سفرناموں کا سنگم ہیں۔ ان میں پرانے سفرناموں والی معلومات بھی ہیں اور ماڈرن سیاح کا چمکتا ہوا مشاہدہ بھی۔ اس کا قاری بیک وقت ماضی اور حال میں سفر کرتا ہے۔ ماضی کا نقشہ جمانے کے لیے مستنصر تاریخ کا سہارا لیتا ہے اور حال کو بیان کرنے کے لیے وہ اپنے مشاہدے پر اکتفا کرتا ہے۔ پہلی صورت میں اختلافِ رائے ممکن ہے کہ خود مؤرخین میں اختلاف ہے لیکن دوسری صورت میں نہیں کہ مستنصر کا مشاہدہ کھرا، خالص اور ناقابلِ تردید ہے۔

مستنصران سیاحوں میں سے نہیں جو جمبو جیٹ میں بیٹھ کر مہینوں کی مسافت گھنٹوں میں طے کرتے ہیں یا ایک 'اے کلاس' ہوٹل سے دوسرے 'اے کلاس' ہوٹل میں شب بسری کو سیاحت کا نام دیتے ہیں مستنصر دھرتی کے ساتھ چلتا ہے۔ لغوی معنوں میں بھی اور استعارۃً بھی۔ وہ آپ کو قریہ قریہ، نگری نگری، کوچہ کوچہ پیدل چلتا یا مقامی بس یا ریل میں سفر کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے مشاہدے میں آنے والے انسان ہیں۔ دھرتی پر چلنے پھرنے والے عام انسان! ان میں بوڑھے بھی ہیں اور جوان بھی، حسین بھی اور کریہہ بھی، عظیم بھی اور حقیر بھی۔ وہ ان میں سے کسی سے نفرت نہیں کرتا۔ کسی کو اپنے طنز یا تضحیک کا نشانہ نہیں بناتا۔ اس کا ظرف اتنا وسیع ہے کہ اسے دھرتی کے تمام باشندے ایک ہی برادری کے بکھرے ہوئے فرد لگتے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ اپنے وطن میں رہتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ وہ کولہو کا بیل ہے جس کے کندھے پر پنجالی، اور آنکھوں پر کھوپے ہیں اور وہ زندگی کے شب و روز ایک جانکاہ ڈگر پر گزار رہا ہے۔ چنانچہ وہ بقول خویش "رسّے تڑا کر" ملک سے باہر بھاگ نکلتا ہے لیکن دیارِ غیر میں پہنچ کر، خواہ وہ کتنے ہی "گلشرے" اُڑا رہا ہو، اسے ہر وقت محسوس ہوتا ہے کہ اس کے دل کے تار ارضِ وطن سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس کی ظاہری نگاہ غرناطہ پر ہوتی ہے لیکن باطن کی آنکھ لاہور پر۔

مجھے مستنصر کے سفر ناموں میں جس چیز سے جادو ہو جاتا ہے وہ ان کی فضا ہے:
وہ دلربا سی نیم اُداس فضا۔ نیم اُداسی جو مستنصر کی نشیلی آنکھوں میں ہے، اُس کی تحریر میں بھی محسوس ہوتی ہے۔ ایک ایسی نیم اُداس فضا جس میں غم کے گہرے بادل ہیں نہ خوشی کی چمکدار دُھوپ۔ بس دونوں کے بین بین رومانیت کی بھینی بھینی خوشبو سے معطر، ریشمی سی اُداسی میں لپٹا ہوا سفر جو محض سفر برائے سفر ہے۔ اس میں دُنیا کو فتح کرنے، علم حاصل کرنے یا معاشرے کو سنوارنے کی کوئی آلائش نہیں۔ مسافر کو صرف دُنیا دیکھنے اور اہلِ دُنیا کا تماشہ کرنے کی آرزو ہے ــ

اس آوارہ گردی میں جو مقامات اور شخصیات مستنصر کے مشاہدے میں آتی ہیں، وہ

جتنی غیر معمولی نہیں ہوتیں۔ داس کی رو داد کو امتیاز بخشیں۔ جو چیز اس کی تحریر کو پرکشش اور لازوال بناتی ہے وہ اس کا خوبصورت انداز بیان ہے۔ بعض حصّے تو اس قدر چلبلے اور شگفتہ ہیں کہ یہ شخص اگر سارا سفرنامہ اسی انداز میں لکھتا تو ہمارا مزاح کا کاروبار ٹھپ ہو جاتا۔

دُعا ہے کہ مستنصر بکثرت "شالا پردیسی تھیوے" تاکہ اُردو ادب میں حسین و جمیل سفرناموں کا اضافہ ہوتا رہے۔ یہ دُنیا مستنصر جیسے لوگوں ہی کے دم سے حسین ہے۔ وہ ملک وہ شہر کس کام کا جہاں کم از کم ایک مستنصر حسین تارڑ نہ ہو۔

ع ویراں شود آں شہر کہ مے خانہ ندارد

محبتوں، اذیّتوں کی جانب

ہسپانوی ادیب مگوئیل سروانتس اپنے شہرۂ آفاق ناول "ڈان کے خوتے" کے مرکزی کردار کا تعارف کراتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"اُس کے ذہنی خلفشار نے اتنی شدّت اختیار کر لی کہ وہ سوچنے سمجھنے کی قوتوں سے عاری ہوگیا۔ لاتعداد کتابوں کے مطالعے سے جنم لینے والے منتشر خیالات اور تصوّرات اس کے دل و دماغ پر بُری طرح حاوی ہوگئے۔ اس کا ذہن رعنائیوں، فسادوں، جنگوں، مقابلوں، زخموں، شکایتوں، محبتوں، اذّیتوں اور اسی قسم کے دیگر ناممکنات کی بہتات کی آماجگاہ بن گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ کتابوں میں پڑھی ہوئی تمام تخیّلاتی داستانیں اُسے مستند تاریخ کی مانند حقائق پر مبنی نظر آنے لگیں۔"

اور یوں ڈان کے خوتے نے مہم جوئی کی تلاش کی غرض سے سفر پر کمر باندھی۔ اس کا مطمعِ نظر شجاعت کے کارنامے دکھا کر دُنیا سے بُرائی کی قوتوں کا قلع قمع کرنا اور زخمی انسانیت کے زخموں پر مرہم رکھنا تھا۔

میں بھی ایک ایسے ہی سفر پر کمربستہ تھا مگر شاید میرا ذہنی خلفشار ڈان کے خوتے کی مانند شدید نہ تھا۔ میں نے ہسپانیہ کے بارے میں جو داستانیں پڑھ رکھی تھیں وہ تصوّراتی نہ تھیں بلکہ تاریخی حقائق پر مبنی تھیں۔ کے خوتے نے اس مہم جویانہ سفر کے آغاز سے قبل اپنے باپ دادا کی قدیم اور بوسیدہ زرہ بکتر نکال کر پہنی اور میں نے سامان کا تھیلا چند کتابوں، ایک پُرانی پوستین اور دو کیمروں سے پُر کیا اور کاندھے پر ڈال لیا۔ اس نے اپنے لاغر گھوڑے "روزی نانتے"

DON QUIXOTE

کو ذریعۂ سفر بنایا اور میں بھاپ کے دیو پہ سواری کر رہا تھا۔ اسے شجاعت کے کارنامے دکھانے کے لئے کسی ناقابلِ تسخیر قلعے کی تلاش تھی اور میں تسخیر ہو جانا چاہتا تھا۔ وہ شب بسری کے لئے کسی چرواہے کی جھونپڑی کا متلاشی تھا اور میں اپنی جھونپڑی ایک خیمے کی صورت میں کندھوں پہ اٹھائے پھرتا تھا۔

سفر کی مکمل تیاری کے بعد ڈان کے خوتے کو ایک ایسی خاتون کی تلاش ہوئی جس پر وہ اپنا دل نثار کر سکے اور بہادری کے کارنامے سرانجام دینے سے قبل اس کا نام لے کر اپنا نیزہ چوم سکے۔ کیونکہ بقول سروانٹس ایک مہم جو شخص محبوبہ کے بغیر ایسے ہی ہے جیسے ایک درخت پھل اور پتوں کے بغیر۔ چنانچہ ڈان کے خوتے نے ایک دیہاتی دوشیزہ کو اپنی محبوبہ قرار دے کر سفر کا آغاز کر دیا۔ میں اس معاملے میں ڈان کے خوتے سے پیچھے رہ گیا تھا کیونکہ لاہور شہر کی تنگ گلیوں میں اگر محبوبہ کی تلاش کی جائے تو سفرِ مہم جوئی کی بجائے سفرِ آخرت کا آغاز ہو جاتا ہے۔

ڈان کے خوتے کیل کانٹے سے لیس ہو کر اپنے مریل گھوڑے "روزی نانتے" پر سوار ہوا اور اس کی باگیں کھلی چھوڑ دیں کہ جدھر جی چاہے چل دے کیونکہ مہم جوئی کا یہی خاصہ ہوتا ہے۔ بھاپ سے چلنے والے جس آہنی دیو پر میں سوار تھا وہ میرے بس میں نہ تھا۔ وہ مجھے پیرس سے سیدھا سان سباستیان لئے جا رہا تھا۔ رعنائیوں کی جانب۔ اذیتوں کی طرف۔ محبتوں کی سمت ..... جن کے بارے میں میں اب تک صرف کتابوں میں پڑھتا آیا تھا۔

ساری رات ہماری گاڑی فرانس کے وسیع میدانوں اور جنگلوں میں دوڑتی رہی۔ میں نے اپنے ڈبے میں سوار مسافروں کا جائزہ لیا۔ ایک غلیظ ہسپانوی مزدور، دو راہبائیں، ایک فرانسیسی جوڑا اور گٹھے ہوئے جسم کی ایک نوجوان عورت جس کا سر نیند کی مدہوشی میں میرے شانے کے ساتھ آ لگا تھا۔

ڈبے میں بے پناہ گھٹن تھی۔ تمام مسافر سو رہے تھے مگر نیند مجھ سے کوسوں دور تھی .....

مُور کی واپسی۔ رُومیوں نے مغربی افریقہ کو ماریطانیہ کہا اور وہاں کے باشندوں کو مُوری کا نام دیا۔ یہی لفظ ہسپانوی میں مورو کہلایا اور انگریزی میں مُور ..... اور پھر تمام مسلمانوں کو بلاتفریق قومیت مُور کہا جانے لگا یہاں تک کہ فلپائن کے مسلمان اب بھی مُور کہلاتے ہیں کیونکہ یہ جزائر

ایک ہسپانوی میگالن نے دریافت کئے تھے۔ ہسپانوی جو ہر مسلمان کو مُور کہتے ہیں.... غرناطہ سے جلاوطن ہونے کے ۴۷۷ برس بعد.... ایک پاکستانی مُور کی واپسی..... اپنے وطن اُندلس کی جانب۔

ڈبے میں گھٹن ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ گئی تھی۔ فرانسیسی تازہ ہوا کو سم قاتل سمجھتے ہیں اور ہمیشہ اپنے گھر کی اور دورانِ سفر ٹرین کے ڈبے کی کھڑکیاں مضبوطی سے بند کر کے سوتے ہیں.... ہسپانوی مزدور منہ کھولے خراٹے لے رہا تھا۔ دونوں راہبائیں بالکل اکڑ دں بیٹھی سو رہی تھیں۔ جب کبھی پٹڑی بدلنے سے ٹرین جھولتی تو ان کے سر آپس میں ٹکرا جاتے مگر وہ فوراً سنبھل جاتیں اور پھر اکڑ کر بیٹھ جاتیں۔

فرانسیسی جوڑا آپس میں گڈمڈ ہو کر سو رہا تھا۔ نوجوان عورت کا سر بدستور میرے شانے پر آرام کر رہا تھا۔ اس کا سانس بے حد گرم تھا۔

"معاف کیجئے گا۔" میں نے آہستہ سے اپنا شانہ ہلایا۔

" اُوں " عورت نے نیند میں ڈوبی ہوئی دائیں آنکھ کھول کر کہا اور پھر مسکرا کر میرے اور قریب ہو گئی۔

" معاف کیجئے گا میں ڈبے سے باہر جانا چاہتا ہوں " میں نے شانہ جھٹک کر کہا۔

" اُوں۔ ہُوں " عورت نے سر اٹھایا میری جانب دیکھ کر مسکرائی اور پھر کندھے سکیڑ کر بڑے مزے سے دوسری طرف بیٹھے ہوئے ہسپانوی مزدور کے شانے پر سر رکھ کر سو گئی۔ مزدور کے خراٹے بند ہو گئے۔

میں ڈبے سے نکلا اور ٹرین کی لمبی راہداری میں آ کھڑا ہوا۔ یہاں پہیوں کی گڑگڑاہٹ اور ڈبوں کے آپس میں بھڑنے کا شور تو تھا مگر تمام کھڑکیاں کھلی ہونے کی وجہ سے ہوا میں تازگی تھی۔ میں نے اپنی سفید برساتی کا کالر گلے کے گرد اچھی طرح لپیٹ لیا اور کھڑکی سے سر باہر نکال کر ایک لمبا سانس لیا۔ ہوا میں گھنے جنگلوں اور سرسبز کھیتوں کی مہک تھی۔.... میں لمحہ بہ لمحہ اُندلس کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ اُندلس جو میرے طویل سفر کی معراج تھا۔ تہران میں سُکھدیپ چاہتا تھا کہ میں چند روز اور ٹھہر جاؤں۔ میں نے کہا تھا " قرطبہ کی محرابوں اور غرناطہ کے ایوانوں نے

مجھے ایک ڈور میں باندھ رکھا ہے۔ میں اس کے آخر میں جا کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ ڈور کون ہلا رہا ہے۔ استنبول کی نیلی مسجد میں مجھے مسجد قرطبہ کے ستون یاد آتے۔ سٹاک ہوم میں ماگریتا نے کہا تھا "وہ کونسا ایسا افسوں ہے جو تمہیں سب کچھ چھوڑ کر اُندلس جانے پر مجبور کر رہا ہے؟" لندن میں میری نظریں جنوب کی سمت ہی لگی رہیں۔ پیرس کی پاسکل کے اپاہج بندھن بھی میرا راستہ نہ روک سکے۔

"بیلت موسیو!"

میں نے مُڑ کر دیکھا تو فرانسیسی ٹکٹ چیکر مُنہ بناتے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں نیند سے بند ہو رہی تھیں۔ میں نے جیب سے ٹکٹ نکال کر اُس کے انگوٹھے اور اُنگلی کے درمیان اٹکا دیا۔

"اگلا سٹاپ کونسا ہے؟" میں نے یونہی پوچھ لیا۔

"توُرز" اُس نے جماہی لیتے ہوئے کہا اور ٹکٹ چھید کر مجھے واپس کر دیا۔

اُس کے جاتے پر میں نے اپنی کہنیاں کھڑکی کی خنک چوکھٹ پر ٹکا دیں اور باہر دیکھنے لگا۔ ہر شئے تاریکی میں ڈوبی ہوتی تھی.... خنک ہوا میں خوشبو تھی۔ خوشبو اپنے وطن کی.... توُرز قریب آ رہا تھا۔ توُرز جہاں جبل الطارق سے بپھرنے کے بعد مسلمانوں کی فتوحات کی طوفانی لہر مدھم ہوتی اور پھر ہموار ہو کر زمین پر بچھ گئی۔ مسلمان ہسپانیہ اور پرتگال فتح کرنے کے بعد فرانس کے ایک بڑے حصے پر بھی قابض ہو گئے۔ گبن لکھتا ہے "دمشق اور سمرقند کے سلطان کی افواج کا سکنی کے انگوروں کے باغات اور بوردے کے شہر سے بھی آگے نکل گئیں۔ یہاں تک کہ فرانس کے جنوبی حصے نے دریائے گیرون سے دریائے رہون تک مسلمانوں کے عادات و اطوار اپنا لیے۔"

اُندلس کے اُموی گورنر عبدالرحمٰن الغافقی نے ۷۳۲ء کے موسم بہار میں بلند کوہ پیرانیز عبور کئے اور دریائے گیرون کے کنارے ڈیوک آف ایوڈس کو شکست دینے کے بعد بوردے پر حملہ آور ہوا۔ بوردے کے بعد پاسٹرز سرنگوں ہوا اور مسلمان افواج توُرز کی جانب بڑھیں جہاں متحدہ یورپ کی نیم وحشی افواج چارلز مارٹل کی زیرِ قیادت صف آرا تھیں۔ مارٹل کے سپاہیوں نے اپنے بدن بھیڑیوں کی کھالوں سے ڈھانپ رکھے تھے اور ان کے بے تحاشہ بڑھے ہوتے بال کندھوں سے نیچے تک آتے ہوتے تھے۔ لڑائی شروع ہونے کے ساتویں روز الغافقی میدان جنگ میں کام آیا۔ عرب بقول

انتھونی نٹنگ ایک زیرک راہنما کی سرکردگی میں آسمان کی بلندیاں چھو لیتے ہیں مگر اُس کی غیر موجودگی انہیں ذلّت کی گہرائیوں میں دھکیل دیتی ہے۔ الغافقی کے مارے جانے پر عرب بددل ہو گئے۔ اُس شب ان کے خیموں میں زمانۂ جاہلیت کے قبائلی جھگڑوں نے پھر سر اٹھا لیا۔ یمنی۔ نجدی۔ حجازی اور شامی متفقہ طور پر کسی ایک شخص کو قائد تسلیم کرنے میں ناکام ہو گئے۔ انہوں نے اپنے خیمے سمیٹے اور رات کی تاریکی میں روپوش ہو گئے۔ گبن لکھتا ہے "اگر مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ یونہی جاری رہتا تو فرات اور نیل عبور کر لینے والی قوم کے لئے دریائے رائن پار کر لینا چنداں دشوار نہ تھا۔ ان کا بحری بیڑا بڑی آسانی سے دریائے ٹیمز میں داخل ہو جاتا۔ جنگِ تورز میں عیسائیوں کو شکست ہو جاتی تو آج آکسفورڈ میں بائبل کی بجائے قرآن پڑھایا جاتا اور کلیسا سینٹ پیٹرز پر صلیب کی بجائے ہلال نصب ہوتا۔" فلپ ہٹی اس جنگ کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ وہ لکھتا ہے "جنگ تورز کسی صورت میں بھی فیصلہ کُن نہ تھی کیونکہ صرف دو سال بعد مسلمانوں نے ایویان اور نو سال بعد لی آن جیسے مشہور فرانسیسی شہر روند ڈالے۔ پھر ناربون کی باری آئی جہاں سے گرفتار کئے گئے عیسائی مسجد قرطبہ کی تعمیر پر لگائے گئے۔"

رات کے پچھلے پہر تورز آیا..... میرے ڈبے کا دروازہ کھلا اور وہ جوان عورت آنکھیں ملتی ہوئی باہر نکل آئی۔

"تورز؟" اس نے جلدی سے پوچھا۔

میں نے سر ہلا دیا۔

"بون وایج" اس نے شرارت سے لب سکیڑے اور ٹرین سے اُتر کر پلیٹ فارم سے پرے تاریکی میں گم ہو گئی..... اُس کا سر میرے شانے کے ساتھ آ لگا تھا..... مسلمان تورز تک آ پہنچے تھے..... وہ مجھ سے علیحدہ ہو کر تاریکی میں گم ہو چکی تھی..... یورپ مسلمانوں کے قدموں میں تھا اور پھر ایک خواب تاریکی میں جذب ہو گیا..... انجن نے وہسل دی اور گاڑی رینگنے لگی۔ بالکل آہستہ آہستہ جیسے آج سے پورے ۱۲۳۷ برس پیشتر مسلمان ایک سیاہ رات میں تورز سے رُوپوش ہو گئے تھے.....

گاڑی سٹیشن سے باہر نکلی تو مجھے احساس ہوا کہ عربوں کے اندلس کی حدود یہاں سے شروع

ہوتی ہیں۔ ان کی آمد سے قبل ہسپانیہ کا ایک صوبہ وہاں بسنے والی قوم وندال (VANDAL) کی مناسبت سے واندلسیا یعنی وندالوں کا مسکن کہلاتا تھا جو بعد میں بگڑ کر اندلسیا ہوا اور پھر اندلس میں بدل گیا۔ عرب اُن تمام علاقوں کو اُندلس کہتے تھے جو آج کل ہسپانیہ۔ پرتگال اور جنوبی فرانس کے اس حصے میں جہاں میری گاڑی جا رہی تھی شامل ہیں۔

زرد رُو راہباؤں کی انگلیوں میں تسبیح کے دانے پھسل رہے تھے۔ فرانسیسی جوڑا اپنے شکن آلود لباس درست کر رہا تھا اور ہسپانوی مزدور اپنی بڑھی ہوئی ڈاڑھی کھجانے کے ساتھ ساتھ ایک پیاز کھانے میں مصروف تھا۔ صبح ہو چکی تھی اور ہم ہسپانیہ کے سرحدی قصبے ایرُن میں داخل ہو رہے تھے۔ کسٹم کی چیکنگ خاصا صبر آزما مرحلہ تھا۔ میں فرانس سے ہسپانیہ میں داخل ہونے والے سیاحوں کی ایک طویل قطار میں اپنے سامان کا تھیلا کندھے پر ڈالے پلیٹ فارم پر کھڑا جمائیاں لے رہا تھا۔ میری باری آئی تو کسٹم آفیسر نے سامان کھولنے کو کہا۔ میں نے اپنے تھیلے کی گرہ کھول کر اُسے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ کسٹم آفیسر نے تھیلے میں رکھی کتابوں پر ایک نظر ڈالی "مُورز ان سپین" ہوں! "مُورِش سپین" نو! "الحمرا کی کہانیاں" اُس نے باقاعدہ منہ بنالیا اور میرے پاسپورٹ پر مُہر لگا کر مجھے فارغ کر دیا۔ میرے پیچھے دو امریکی لڑکیاں کھڑی تھیں جنہیں کسٹم آفیسر نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سامان کی تلاشی تو درکنار اُس نے اُن کے پاسپورٹوں پر مُہر لگانے کے بعد ان کو سیلوٹ بھی کیا۔ لڑکیاں خوش شکل تھیں اور ہسپانوی چاہے زندگی کے کسی شعبے سے متعلق ہو قدرتی طور پر حُسن پرست ہوتا ہے۔ کسٹم سے فارغ ہو کر میں دوسرے مسافروں کے ساتھ ایک ہسپانوی گاڑی میں سوار ہو گیا جو سان سباستیان تک جا رہی تھی۔ ڈبے میں ایرن کے گرد و نواح میں رہنے والے مزدوروں کا بے پناہ ہجوم تھا جو صبح سویرے سان سباستیان کے کارخانوں میں کام کرنے جا رہے تھے۔ اُن کا لباس اور جسمانی صحت کا معیار اس بات کا پتہ دے رہے تھے کہ ہسپانیہ یورپ کا غریب ترین ملک ہے۔ گاڑی کی رفتار بے حد آہستہ تھی۔ ریلوے لائن کے پہلو میں واقع عمارتوں کی سفیدی اتری ہوئی تھی اور جابجا پلستر کے اُکھڑ جانے سے اینٹیں نظر آ رہی تھیں۔ گزشتہ شب سفر کا بیشتر وقت راہداری میں کھڑے ہو کر گزرا تھا' اس لئے اب نیند آ رہی تھی۔ میں کھڑکی کے ساتھ ٹیک لگا کر اونگھنے لگا۔

"دیکھیے اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ہم آپ کے ساتھ بیٹھ جائیں؟" میں نے بمشکل اپنی نیند سے بھاری آنکھیں کھولیں تو سامنے ہسپانوی کسٹم آفیسر کی پسندیدہ امریکی لڑکیوں کو کھڑے پایا۔ وہ گھبرائی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ میں کھسک کر کھڑکی کے ساتھ لگ گیا اور وہ فوراً میرے برابر والی نشست پر براجمان ہوگئیں۔

میرے ساتھ بیٹھی ہوئی پستہ قد اور قابلِ رشک صحت کی مالک لڑکی نیلے رنگ کی چُست پتلون اور کالے سویٹر میں ملبوس تھی۔ سویٹر لمبائی میں چھوٹا ہونے کی وجہ سے پتلون تک پہنچتے پہنچتے رہ گیا تھا۔ وہ بار بار سویٹر کو دونوں ہاتھوں سے کھینچ کر سویٹر اور پتلون کے درمیانی فاصلے کو پُر کرنے کی کوشش کرتی مگر ہاتھ ہٹاتے ہی جسم کے بالائی حصے کے کھچاؤ کی وجہ سے سویٹر سکڑ کر پھر اپنی پرانی حالت پر آجاتا اور پتلون کی بیلٹ کے عین اُوپر اس کا سفید پیٹ نظر آنے لگتا۔ دوسری لڑکی نے جس کا چہرہ قدرے ملوتر تھا اپنے کندھوں پر ایک کھیس نما شال اوڑھ رکھی تھی۔

"دراصل ہمیں ان ہسپانوی مزدوروں نے بے حد تنگ کر رکھا تھا" پستہ قد لڑکی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"بلکہ ....." دوسری نے اپنے جسم کا ایک حصہ سہلاتے ہوئے منہ بنا لیا "چٹکیاں بھی لیتے تھے۔"

ڈبے کے ایک کونے میں چند ہنس مکھ نوجوان ہسپانوی مزدور کھڑے دانت نکال رہے تھے۔ لڑکیوں کو میرے پاس بیٹھے دیکھ کر انہوں نے خوب ہاؤ ہو مچائی۔

"ویسے اِن کا قصور نہیں" پستہ قد لڑکی نے ہنس کر کہا "موسم گرما میں لاکھوں سویڈش لڑکیاں ہسپانیہ میں وارد ہوجاتی ہیں اور ان کے مقاصد اتنے نیک نہیں ہوتے۔"

انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ "یورپ ریل پاس" پر سفر کر رہی ہیں جو ایک ماہ کے لئے یورپ کے تمام ممالک میں غیر معینہ سفر کے لئے کارآمد ہوتا ہے۔ یہ پاس صرف امریکی، جاپانی اور کینیڈین باشندوں کو ہی مل سکتا ہے۔ میں یورپ میں ایسے بے شمار امریکیوں سے ملا تھا جو "یورپ ریل پاس" پر سفر کر رہے تھے۔ وہ اپنے سفر کے اوقات کار کچھ یوں ترتیب دیتے تھے کہ صبح سویرے کسی بڑے شہر میں وارد ہوتے پورا دن وہاں گزارا اور پھر کسی ایسی گاڑی میں سوار ہوگئے جو تمام رات چلنے

کے بعد صبح تک کسی اور خوبصورت شہر تک لے جاتے۔ یوں وہ ہوٹلوں میں رہائش کا خرچہ گاڑیوں میں سو کر بچا لیتے تھے۔ اگر ایک ہی شہر میں دو تین روز قیام کرنے کا ارادہ ہو تو پھر ہر شام سٹیشن پر جا کر کسی بھی سمت جاتی ہوتی گاڑی پر سوار ہو کر سو گئے۔ نصف شب کہیں اتر گئے اور مخالف سمت سے آتی ہوتی کسی اور گاڑی میں بیٹھ کر مزے سے سوتے ہوتے صبح سویرے واپس اُسی شہر میں پہنچ گئے۔

ایرن سے سان سباستیان تک کا سفر چالیس منٹ میں طے ہوا۔ دورانِ سفر ہسپانوی مزدور بڑی باقاعدگی سے لڑکیوں کو گھورتے رہے اور ان پر فقرے کستے رہے۔ گاڑی کھڑی ہوتی تو میں نے اپنا سامان کندھے پر رکھا اور پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ مجھے بے حد بھوک لگ رہی تھی اور میری جیب میں پھوٹا پیسہ بھی نہ تھا۔ میں نے ٹکٹ چیکر سے سفری چیک ہسپانوی کرنسی پیسیتہ میں تبدیل کروانے کے بارے میں دریافت کیا تو اُس نے بتایا کہ کامبیو یعنی کرنسی کا تبادلہ ریلوے سٹیشن میں واقع بانکو یعنی بینک سے ہو گا اور بینک نو بجے کھلے گا۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ ابھی صرف سات بجے تھے چنانچہ میں ریلوے سٹیشن کے ایک کونے میں سامان کا تھیلا سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ ابھی میں اونگھنے کی تیاری کر رہا تھا کہ وہ امریکی لڑکیاں پھر وارد ہو گئیں۔

"اب آپ کو کون تنگ کر رہا ہے؟" میں نے وہیں لیٹے لیٹے دریافت کیا۔

"کوئی بھی نہیں!" پستہ قد لڑکی نے اپنا کالا سویٹر کھینچتے ہوتے ہنس کر کہا "ہم صرف یہ پوچھنا چاہتی ہیں کہ ہسپانوی کرنسی کہاں سے مل سکتی ہے؟"

"تشریف رکھیے" میں نے چمکیلے فرش پر ہتھیلی رکھ کر کہا "ہسپانوی کرنسی سٹیشن کے بانکو سے ملے گی اور بانکو نو بجے کھلے گا۔" چنانچہ انہوں نے بھی میری تقلید کی اور سامان سر کے نیچے رکھ کر اونگھنے لگیں۔

نو بج گئے مگر بانکو نہ کھلا۔ سٹیشن اب بالکل خالی پڑا تھا سوائے ایک خاکروب کے جو پچھلے دو گھنٹوں سے فرش کا ایک کونہ چمکا رہا تھا۔ میں اٹھ کر اس کے پاس چلا گیا۔

"سینیور!" میں نے خالی کاؤنٹر کی جانب اشارہ کرتے ہوتے پوچھا "یہ بانکو کتنے بجے کھلتا ہے؟"

اس نے مُنہ پھلا کر فرش پر تھوکا اور پھر اس پر کپڑا جما کر کہنے لگا "کامبیو؟" میں نے سر

ہلا دیا" ہاں چینج"!

" نوکامبیو! نو بانکو! دومنگو!" اس نے گردان کی اور پھر سر جھکا کر فرش کو شیشہ پالش کرنے میں مصروف ہو گیا۔

پہلے دو لفظ تو میں ٹکٹ چیکر کی مہربانی سے سیکھ چکا تھا مگر اب یہ دومنگو جانے کس بلا کا نام تھا یوں لگتا تھا جیسے تمام ہسپانوی الفاظ کے آخر میں "و" ضرور آتا تھا۔ میں نے فوراً کوٹ کی اندرونی جیب سے لندن سے خریدی ہوئی ہسپانوی' انگریزی ڈکشنری نکالی۔ دومنگو۔ دومنگو۔ میں نے لفظ دہراتے ہوئے جلدی سے ورق الٹے۔ معلوم ہوا کہ دومنگو ہسپانوی میں اتوار کو کہتے ہیں۔

ہسپانیہ میں میری پہلی صبح کچھ اتنی دل آویز ثابت نہیں ہو رہی تھی۔ بھوک سٹیشن سے باہر چمکتی دھوپ سے بھی زیادہ چمک رہی تھی۔ جیب میں ایک پسیتہ نہ تھا اور نہ کہیں سے ملنے کا امکان تھا کیونکہ آج اتوار تھا اور ظاہر ہے اتوار کو تمام بینک بند ہوتے ہیں۔

میں نے واپس آکر امریکی خواتین کو جب یہ دومنگو والا مژدہ سنایا تو اُن کے چہرے بھی لٹک گئے۔ وہ بھی میری طرح "پھانک" تھیں۔

" میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد لمبوترے مُنہ والی نے شہادت کی انگلی کھڑی کر دی " اکثر بڑے ہوٹلوں میں گاہکوں کی سہولت کے لئے کرنسی تبدیل کرنے کا انتظام بھی ہوتا ہے۔"

"بڑے ہوٹلوں میں؟" میں نے اپنی ہیئت پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

" یہ بات بھی ہے۔" پستہ قد لڑکی نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ہم تینوں کے میلے کچیلے اور پُر شکن لباس دیکھ کر شاید کوئی نچلے درجے والا ہوٹل بھی ہمیں اندر گھسنے کی اجازت نہ دیتا۔ لمبوترے منہ والی کی آنکھوں میں "گِڈ" بھی لگی ہوئی تھی۔ مُنہ ہاتھ دھونے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

"بہرحال اب تو یہی ایک طریقہ ہے" میں نے اپنا تھیلا اٹھاتے ہوئے کہا۔ ان دونوں نے بھی اپنا سامان اُٹھا لیا اور ہم سٹیشن سے باہر آگئے۔

سان سباستیان کی سفید عمارتیں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ شاید رات کو بارش ہوتی تھی۔ سڑکوں پر کہیں کہیں پانی کھڑا تھا۔ شہر کے درمیان میں ایک نہر بہ رہی تھی جس کے دونوں کناروں

پر سرسبز درختوں کی قطاریں تھیں۔ ہم ایک خوبصورت پُل پار کر کے دوسرے کنارے پر چلے گئے۔ تھوڑی دُور چلنے کے بعد ہسپانوی طرز کی سفید آہنی بالکونیوں اور شیشے کی بڑی فرانسیسی کھڑکیوں والا ایک ہوٹل نظر آیا۔ ہم نے چپکے سے صدر دروازہ کھولا اور ہوٹل کے وسیع باغ میں سامان رکھ کر بڑے ٹھسّے سے اندر داخل ہو گئے۔ کاؤنٹر کے پیچھے کالے سُوٹ میں ملبوس ایک گنجا آدمی بڑے انہماک سے نوٹ گننے میں مصروف تھا۔ ہم نے بڑی عاجزی سے اپنا مدعا بیان کیا تو اُس نے فوراً نوٹ سمیٹ کر کاؤنٹر کے نیچے رکھ دیئے اور پھر کسی قدیم گھڑیال کے پنڈولم کی طرح سر ہلانے لگا۔ "کرنسی صرف ہوٹل میں قیام پذیر گاہکوں کے لئے تبدیل کی جا سکتی ہے۔"

کمبخت اصلی ہسپانوی نہیں لگتا تھا کیونکہ میری ساتھی امریکی لڑکیوں نے نہ صرف اپنی مسکراہٹوں کا آزادانہ استعمال کیا بلکہ پستہ قد لڑکی نے اپنے برہنہ پیٹ کو سویٹر کھینچ کر ڈھانپنے کی کوشش بھی نہ کی۔ ہم مایوس ہو کر باہر آنے کو تھے کہ میری نظر ڈائننگ روم میں بیٹھی دو انگریز بوڑھیوں پر پڑی جو چائے پینے میں مشغول تھیں۔ انگریز اس لئے کہ یورپ میں چائے پینے کا تردد صرف یہی قوم کرتی ہے۔ میں ڈائننگ روم کا دروازہ کھول کر ان کے پاس چلا گیا۔ نہایت رونی شکل بنا کر اپنی بپتا سنائی اور ان سے التجا کی کہ وہ ہوٹل میں مقیم گاہکوں کی حیثیت سے ہمیں کرنسی تبدیل کروانے میں مدد دیں۔

"درندے کہیں کے" ایک مائی نے چائے کی پیالی میز پر پٹخ دی۔

"ظالم ہسپانوی" دوسری مائی بسکٹ کھاتے ہوئے اپنا پوپلا منہ چلانا بھُول گئی اور وہ دونوں فوراً اٹھ کر میرے ساتھ کاؤنٹر پر چلی آئیں۔

"ان بے چارے بچوں کے پاس خوراک خریدنے کے لئے بھی پیسے نہیں ہیں اور تم اِن کے لئے کرنسی تبدیل نہیں کرتے پیڈرو کے بچے!"

"لیکن سوائے گاہکوں کے ..." پیڈرو کے بچے نے لرزتے ہوئے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"کیا ہم گاہک نہیں ہیں جو پچھلے بیس روز سے تمہارے اس اصطبل میں قیام پذیر ہیں؟ کیوں ایملی ڈیئر؟"

"ہاں باربرا ڈیئر۔ اور بیس روز میں سے سولہ دن بارش ہوتی رہی ہے۔" پوپلی مائی نے

ہاں میں ہاں ملاتی۔

"اور ہمیں اس پیڈرو کے بچے نے یہ لکھ کر بلوایا تھا کہ اگست کے ان دنوں میں یہاں موسم خوشگوار رہتا ہے اور سورج چمکتا رہتا ہے۔ کیوں ایملی ڈیئر!"

"ہاں باربرا ڈیئر۔ اس سے بہتر تھا کہ ہم اپنی چھٹیاں لندن میں ہی گزار دیتیں۔"

"اور آج صبح ناشتے میں دیئے گئے انڈے کم از کم دو منٹ تک اُبلتے رہے ہوں گے حالانکہ میں نے خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ میرا انڈا صرف پونے دو منٹ تک اُبالا جاتے۔ کیوں ایملی ڈیئر؟"

"جی وہ کرنسی۔۔۔" اس سے قبل کہ ایملی ڈیئر اپنے جلے ہوتے ٹوسٹ کا رونا روتی میں نے کرنسی کا رونا رو دیا۔

"اوہو ہم تو بھول ہی گئی تھیں" دونوں نے معذرت بھرے لہجے میں کہا اور پھر مینجر پر اپنی قہر آلود نظریں جما کر کہنے لگیں "پیڈرو۔"

پیڈرو وہیں منجمد ہو گیا "جی میڈم۔"

"ان بچوں سے سفری چیک لے کر انہیں ہسپانوی پیسے دے دو۔"

"جی میڈم" پیڈرو نے کھٹ سے کہا اور فوراً ہم تینوں سے سفری چیک وصول کر کے ہمیں ہسپانوی پیسوں سے لاد دیا۔ ہم مائیوں کا شکریہ ادا کر کے ہوٹل سے باہر جانے والے تھے کہ ایملی ڈیئر نے ہمیں چائے کے لئے مدعو کر لیا۔ اس سے قبل کہ میں کچھ کہتا مبوترے منہ والی نے "اوہ بہت بہت شکریہ" کہہ کر دعوت قبول کر لی۔

"باربرا ڈیئر" یوں ایک مائی کرسی پر بیٹھتے ہی اپنی سہیلی سے مخاطب ہوتی۔

"کیا ہے ایملی ڈیئر؟" دوسری مائی نے ہمارے لئے چائے بناتے ہوتے پوچھا۔

"تم نے آج ناشتے پر صرف ٹوسٹ اور مکھن کھایا تھا!"

"پھر؟" مائی نے بسکٹوں کی پلیٹ لڑکیوں کے آگے رکھتے ہوتے کہا۔

"پھر تمہارا انڈا پونے دو منٹ کی بجائے دو منٹ میں اُبلا ہوا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ہاں یہ تو ہے" مائی نے اپنا بگلا سر کھجلایا اور پھر کچھ سوچ کر کہنے لگی "مگر پچھلے بیس روز

میں سولہ دن بارش بھی تو نہیں ہوتی۔ ہم تو صرف دس روز سے یہاں مقیم ہیں۔"

"ہاں یہ بھی ہے"۔ پوپلی مائی ہنس دی اور پھر ہم سے مخاطب ہو کر کہنے لگی "میرا خیال ہے ہم بوڑھی ہو چلی ہیں۔"

جب ہم ہوٹل سے باہر نکلے تو ہماری جیبیں پیسٹوں کے بوجھ سے اور ہمارے پیٹ چلتے اور بسکٹوں سے بوجھل ہو رہے تھے۔ پستہ قد لڑکی کا سوئیٹر مزید سکڑ چکا تھا۔

"اب کیا ارادہ ہے؟" پستہ قد لڑکی نے اپنی ساتھی سے دریافت کیا۔

"مجھے تو سان سباستیان سے وحشت ہونے لگی ہے۔ سٹیشن پر آویزاں ٹائم ٹیبل کے مطابق بارہ بجے ایک گاڑی میڈرڈ کے لئے روانہ ہوتی ہے۔ اسی پر سوار ہو کر میڈرڈ چلے چلتے ہیں۔ راستے میں سو بھی لیں گے۔"

"ایک رات کے لئے سان سباستیان میں رُک جائیں تو کیا حرج ہے؟" سوئیٹر والی لڑکی نے میری جانب معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے مُسکرا کر کہا۔

"ہاں کوئی حرج نہیں مگر پھر میں اکیلی کیا کروں گی؟"

لمبوترے منہ والی نے ہنس کر کہا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو" دوسری لڑکی نے اپنا کالا سوئیٹر پتلون کے اوپر کھینچنے کی ایک اور ناکام کوشش کرتے ہوئے مایوسی سے سر ہلایا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔

"اگر یہاں تمہارا اور کوئی دوست ہو تو آج شب ہم چاروں . . . ."

"یہاں سان سباستیان ہیں؟" میں بے اختیار مسکرا دیا "بہر حال پیش کش کا شکریہ.... خُدا حافظ!" میں نے دونوں سے ہاتھ ملایا اور سامان اٹھا کر شہر کی جانب چل دیا۔

"میڈرڈ میں ملاقات ہو گی" کالے سوئیٹر والی کی آواز مجھ تک پہنچی۔ میں نے پیچھے دیکھے بغیر اپنا ہاتھ ہوا میں بلند کر دیا۔

دس بج چکے تھے مگر سان سباستیان کے خالی کوچہ و بازار دیکھ کر خیال آتا تھا کہ شاید یہاں کے باشندوں کو ابھی تک طلوع آفتاب کا علم نہیں ہوا۔ میں نے سامان کے تھیلے میں سے "یوتھ ہوسٹل بک" نکال کر سان سباستیان کے یوتھ ہوسٹل کا پتہ تلاش کیا اور پھر شہر کے مرکز کی جانب چلنا شروع کر دیا جہاں

سے مجھے ہوسٹل تک جانے والی بس ملنی چاہیئے تھی۔ پلازا میئر سے ساحل کی جانب جاتی ہوئی سڑک کے دورویہ درختوں کی قطاریں تھیں جن کے تلے چوڑے فٹ پاتھ پر قہوہ خانوں کے ملازم کرسیاں اور میزیں سجا رہے تھے۔ کارپوریشن کا ایک ٹرک سڑک پر چھڑکاؤ کر رہا تھا۔ کافی تلاش کے باوجود مجھے مطلوبہ بس سٹاپ نہ مل سکا۔ فٹ پاتھ پر کالے بالوں والی دو پستہ قد ہسپانوی لڑکیاں آپس میں باتیں کرتی ہوئی چلی آ رہی تھیں۔ میں نے انہیں روک کر یوتھ ہوسٹل جانے والی بس کے بارے میں دریافت کیا۔ وہ دونوں پہلے تو خاموش رہیں اور پھر منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگیں۔ میں نے دوبارہ اپنا مدعا بیان کیا۔

"نو انگلیس" اُن میں سے ایک نے انگلیاں نچا کر کہا اور پھر دونوں اُسی طرح ہنستی ہوئی آگے چل دیں۔ ایک خوش لباس راہگیر جس نے شاید مجھے لڑکیوں سے باتیں کرتے دیکھا تھا میرے پاس آکر نہایت شستہ انگریزی میں کہنے لگا "کیا میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟" میں نے بس سٹاپ کے بارے میں پوچھا تو وہ میرے ساتھ ہو لیا "میں بھی اُسی جانب جا رہا ہوں۔ میرے ساتھ ساتھ چلے آیئے" آپ شاید یورپ کی سیاحت کے بعد ہسپانیہ آ رہے ہیں" وہ کہہ رہا تھا" اسی لئے راہ چلتی لڑکیوں سے راستہ دریافت کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرتے۔ ہسپانیہ میں یہ بات انتہائی معیوب سمجھی جاتی ہے۔ ہم شمال میں رہنے والے اگرچہ جنوب کے نیم وحشی اندلسیوں وغیرہ سے زیادہ تہذیب یافتہ ہیں مگر پھر بھی ہم ان نازک معاملوں میں اپنے ہمسائے فرانس کی تقلید نہیں کرنا چاہتے۔ ویسے بھی۔۔۔۔۔

اس نے اپنے دونوں لب سختی سے بھینچ کر کہا" ہم باسک ہسپانوی نہیں ہوتے۔"

"باسک؟" میں نے اس کے چوڑے چکلے سینے اور سنہری بالوں کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے کہا" باسک کون ہوتے ہیں؟"

اُس کے قدم وہیں رُک گئے اور وہ میری طرف یوں دیکھنے لگا جیسے مجھ سے کوئی عظیم گناہ سرزد ہو گیا ہو۔

"آوے ماریا" اُس نے فوراً اپنا چھاتا بائیں ہاتھ میں منتقل کر کے پوتر مریم کا نام لے کر اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور پھر تیزی سے کہنے لگا "باسک ایک ایسی نسل کا نام ہے جس کے خون میں ذرہ بھر ملاوٹ نہیں ہے۔ یورپ کی اعلیٰ ترین نسل۔ ہسپانیہ میں رہنے والے تمام باشندوں کی رگوں میں تو کافر مُوروں کے خون کی آمیزش ہے۔ کوہ پیرانیز کے دامن میں بسنے والی ہماری قوم

ہزاروں سال سے اپنے پوتر خون کی حفاظت کر رہی ہے۔ باسک جتنا محنتی، صحت منداور مذہبی شخص آپ کو دنیا بھر میں نہ ملے گا۔ ہسپانیہ میں اگر کسی کو ایک ایماندار اور محنتی مزدور کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ کہتا ہے" ایک باسک لے آؤ" ہم اپنی تمام زمینیں اجتماعی طور پر کاشت کرتے ہیں۔ باپ کے مرنے کے بعد تمام جائداد بڑے بیٹے کے نام منتقل ہو جاتی ہے جو پورے خاندان کی ضروریات پوری کرتا ہے اسی لئے ہم ان ہسپانویوں سے زیادہ خوشحال ہیں۔ اگرچہ کچھ لوگ ہمارا تقابل سکاٹ لینڈ کے باشندوں کے ساتھ کرتے ہیں مگر یہ درست نہیں۔ ہم اُن کی طرح اچھے کاروباری تو ہیں مگر کنجوس بالکل نہیں ..... "

" وہ یوتھ ہوسٹل کو جانے والی بس کا سٹاپ ..... " میں نے ڈرتے ڈرتے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"بس سٹاپ ؟ ہاں بس سٹاپ" اُس نے چلنا شروع کر دیا مگر لیکچر پھر بھی جاری رہا۔ " ہسپانوی لوگ اور مرکزی حکومت ہمیشہ ہمیں شک کی نظروں سے دیکھتی ہے ..." وہ آنکھ میچ کر مسکرا دیا "اور ان کی تشویش بجا ہے۔ ہم ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ہماری زبان۔ ہمارے رسم و رواج اور عادات کا باقی ہسپانیہ سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔ آزادی کی تحریک شروع ہے۔ پیرانیز کے پار فرانس میں رہنے والے باسک بھی ہماری مدد کر رہے ہیں۔ اگرچہ مرکزی حکومت نے تحریکِ آزادی کے سرکردہ رہنماؤں کو گرفتار کر رکھا ہے مگر ہم ایک نہ ایک دن آزاد باسک ریاست بنانے میں ضرور کامیاب ہوں گے"۔ بس سٹاپ آنے تک اُس بھلے آدمی نے سوائے باسک نسل کی بڑائی اور عظمت کے کارنامے بیان کرنے کے اور کوئی بات نہ کی۔ بس آئی تو اس نے خاص طور پر کنڈکٹر کو ہدایت کی کہ وہ مجھے یوتھ ہوسٹل کے سٹاپ پر اتار دے"۔ اور ہاں" اس نے بس کی کھڑکی میں سے جھانکتے ہوئے کہا" تمہیں معلوم ہے کہ جب فرانس کا بادشاہ شارلیمان کوہ پیرانیز عبور کر کے ہسپانیہ پر حملہ آور ہوا تو یہ باسک ہی تھے جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر درہ رانسے وُو میں اس کا بھرکس نکال دیا" خوش قسمتی سے کنڈکٹر نے فوراً ہی وسل دے دی اور میں باسک نسل کی عظمت کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی سعادت سے محروم ہو گیا۔

سان سباستیان کا یوتھ ہوسٹل شہر سے باہر ایک ہرے بھرے پہاڑ کے دامن میں واقع تھا۔ میں نے وارڈن کے پاس اپنا کارڈ جمع کرایا اور کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں چھ بستر تھے جن میں سے ایک پر

تیکھی مونچھوں والا ایک نوجوان لڑکا سو رہا تھا۔ میں کپڑے بدلنے کی نیت سے سامان کا تھیلا کھولنے کو تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور ساتھ ہی ایک ہاتھ میں لمبا برش اور دوسرے میں پانی کی بالٹی تھامے ہوسٹل کے کمرے صاف کرنے والی ایک محترمہ کمرے کے اندر آگئی۔ اس نے بالٹی زمین پر پٹخی۔ میری طرف دیکھ کر ناک چڑھائی اور انگوٹھے کو خم دے کر دروازے کی طرف اشارہ کر دیا یعنی باہر دفع ہو جاؤ۔ میں کمرے سے باہر آیا تو وہ تیکھی مونچھوں والا نوجوان بھی آنکھیں ملتا میرے پیچھے پیچھے چلا آیا۔

"کیا آپ بھی ہسپانیہ کی سیاحت پر نکلے ہوتے ہیں؟" میں نے یونہی پوچھا۔

"نہیں نہیں" اس نے مونچھوں کو بل دیتے ہوئے سنجیدگی سے کہا" میں تو سان سباستیان میں ہی رہتا ہوں۔ اتوار کے روز میری بیوی میکے چلی جاتی ہے اور ہمارے آٹھ بچے گھر میں وہ اودھم مچاتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ چنانچہ میں ہوسٹل میں آکر سو جاتا ہوں۔ یہاں سوائے اس کمرے صاف کرنے والی کے اور کوئی میرے سکون میں مخل نہیں ہوتا۔ پوپ اگر خاندانی منصوبہ بندی کی اجازت دے دیتا تو میری زندگی یوں اجیرن نہ ہوتی۔ تمہارے کتنے بچے ہیں؟"

" میں غیر شادی شدہ ہوں!"

"کسی کیتھولک لڑکی سے شادی مت کر بیٹھنا۔ ہاں!" اس نے اونگھتے ہوئے مجھے خبردار کیا۔

اُدھر وہ ہسپانوی بُوڑھی کمرے کی صفائی پر دھیان دینے کی بجائے اپنے گلے کے کمال کا مظاہرہ کرنے میں مصروف تھی۔ بستر تو واجبی طور پر جھاڑتی مگر منہ کھول کر تانیں خوب لگاتی۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد جب اس کا گلا بیٹھنے لگا اور لا۔ لا کی بجائے لا ہا آ کی آوازیں برآمد ہونے لگیں تو اس نے کمرے کی صفائی مکمل ہونے کا اعلان کر کے ہمیں اندر آنے کی اجازت دے دی۔ میں اپنے بستر پر بیٹھ کر سامان کھولنے لگا تو وہ ایک سٹول کھینچ کر میرے پاس بیٹھ گئی۔ کہاں سے آتے ہو؟ کتنے روز ٹھہروگے؟ ایک سگرٹ تو پلاؤ۔ سگرٹ دیا تو اپنے بچوں اور خاوند کے بارے میں تفصیلات بتانے لگی۔ میں نے بڑی مشکل سے رخصت کیا اور کپڑے بدل کر بستر پر لیٹ گیا۔

میری آنکھ کھلی تو نو بج رہے تھے۔ شہر جانے کے لئے تیار ہوا تو تیکھی مونچھوں والے صاحب کی آنکھ بھی کھل گئی۔

"کہاں جا رہے ہو؟" اس نے جمائی لیتے ہوئے پوچھا۔

"شہر کی جانب"

"شہر؟" اس کی جماہی وہیں منجمد ہوگئی "اس وقت۔ دو بجے؟ یہ تو سستانے کا وقت ہے۔ سی استا!"

"سان سباستیان دیکھنے کے لئے میرے پاس صرف آج کا دن ہے" میں نے مووی کیمرہ گلے میں ڈالتے ہوئے کہا "میں شاید کل صبح پامپلونا چلا جاؤں"

"گرمی بہت ہے۔ بہرحال ساحل کی جانب چلے جاؤ وہاں خوب رونق ہوگی۔ سومنگ کاسٹیوم بھی ساتھ لیتے جانا۔"

میں نے اُس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اپنا سومنگ کاسٹیوم جو سویڈن کی ایک جھیل میں تر ہونے کے بعد اب تک پڑا سُوکھ رہا تھا ایک تولیے میں لپیٹ کر بغل میں دبا لیا اور ہوسٹل کے باہر کھڑی ہوئی بس پر سوار ہو کر سان سبنیان کے مشہور ساحل سمندر رکونچا کے قریب اُتر گیا۔

تیکھی مونچھوں والا دُرست کہتا تھا۔ یہاں خاصی رونق تھی۔ چند ایک ہسپانوی لڑکیاں ریت پر بیٹھی سویٹر وغیرہ بُن رہی تھیں اور وہ نہانے کے لباس کی بجائے اپنے روزمرّہ کے لباس میں ملبوس تھیں۔ البتہ خوش شکل ہسپانوی لڑکوں کی ٹولیاں "شکار" کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ اور شکار فرانسیسی لڑکیاں تھیں جو نہانے کا مختصر ترین لباس بکینی زیب تن کئے ریت پر لیٹی اپنے متناسب جسم سنولا رہی تھیں۔ بکینی چار گرہ کپڑے کے اُن دو ٹکڑوں کا نام ہے جو ستر پوشی کے اصول سے وہ الگ باندھے رکھا ہے جو حال اچھا ہے پر عمل پیرا ہوتے ہوئے جسم کے ایک حصے میں اور دُوسرے پر اٹکا لیئے جاتے ہیں۔ بکینی کے بالائی حصے کی پتلی ڈوری کی گرہ شاید صرف قوت ارادی کی بنا پر قائم تھی۔ ورنہ اس میں سوت کی مضبوطی کا چنداں دخل نہ تھا چند برس مذہبی وجوہات کی بنا پر ہسپانیہ کے ساحلوں پر اس قسم کا لباس پہننے پر کڑی پابندی عائد تھی۔ خلاف ورزی کرنے والے کو بلکہ کرنے والی کو ہسپانیہ کی پولیس "گارڈیا سول" دھر لیتی اور جرمانے کے ساتھ دیس نکالا بھی ملتا۔ اس پابندی کا اثر یہ ہوا کہ سکینڈے نیویا اور فرانس کی آزاد منش سیاح خواتین نے اپنے جسم کا زیادہ تر حصّہ سنولانے کی خاطر ہسپانیہ کی بجائے اطالیہ اور یونان کے ساحلی مقامات کی جانب کوُچ کرنا شروع کر دیا۔ ان ہر دو ممالک میں لباس پر ایسی کوئی پابندی عائد نہ تھی بلکہ وہاں کے نوجوان لباس اور زیب تن کے درمیانی زیب کی غیر موجودگی زیادہ پسند کرتے تھے۔ چنانچہ مالی مصلحتوں نے مذہبی جذبات

پر غلبہ پایا اور حکومتِ ہسپانیہ نے یہ پابندی اُٹھالی۔ اب غیر ملکی لڑکیاں صرف دو ڈوریاں نیچے اُوپر اٹکا کر کھلے بندوں ساحل پر دھوپ سینکتی ہیں اور اِن ڈھکی اَن ڈھکی لڑکیوں کو دیکھ کر ہسپانوی نوجوان اپنی آنکھیں گرماتے ہیں۔

میں سڑک کے ساتھ سیڑھیوں سے اُتر کر ساحل پر آیا اور پھر حفاظتی بند کے ساتھ ایک لکڑی کے کھوکھے میں لباس تبدیل کر کے سمندر کے قریب ریت پر لیٹ گیا۔ سمندر ایک آبنائے کی صورت میں شہر کے درمیان کونچا بیچ تک چلا آیا تھا۔ آبنائے کے دونوں سروں پر اِگلڈو اور اُرگل نامی دو سر سبز پہاڑیاں کھڑی تھیں۔ اِن پہاڑیوں کے درمیان سانتا کلارا کا خوبصورت جزیرہ دکھائی دے رہا تھا جس کی چھوٹی سی بندرگاہ میں مچھیروں کی چند کشتیاں جھول رہی تھیں۔ اِگلڈو پہاڑی پر واقع قلعہ کے حفاظتی بُرجوں کا رُخ سمندر کی جانب ہے۔ اور یہ اُن دنوں کی یاد دلاتا ہے جب بحری قزّاق سان سباتیان پر حملہ آور ہوا کرتے تھے۔

سان سباستیان ہسپانیہ کے صُوبے باسک کے علاوہ مُلک کا گرماتی صدر مقام بھی ہے۔ گرمیوں میں جب میڈرڈ تپنے لگتا ہے تو آبادی کی اکثریت سان سباستیان کا رُخ کر لیتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گرمیوں میں صرف وہی لوگ میڈرڈ میں رہتے ہیں جو سان سباستیان جانے کی توفیق نہیں رکھتے۔ شہر کی فرانسیسی طرز کی عمارتوں، گرد و نواح کے سر سبز پہاڑوں، کونچا بیچ کی گہما گہمی اور خوشگوار موسم نے قاضی ولی محمد جیسے سکّہ بند بزرگ کو بھی۔ بے حد متاثر کیا تھا۔ یہاں میں قاضی صاحب کا مختصر تعارف کروا دینا ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ کتاب کے آئندہ اوراق میں بھی ان کا ذکر آتے گا۔ عالی جناب میر دبیر قاضی ولی محمد صاحب سیکرٹری رو بکاری خاص اعلیٰ حضرت فرمانروائے بھوپال ذوالعزو الجلال و سیکرٹری محکمۂ محتشمہ عالیہ اسٹیٹ کونسل دار الاقبال بھوپال نے آج سے ۵۵ برس پیشتر ہسپانیہ میں قدم رنجہ فرمایا اور ہندوستان واپسی پر "سفر نامۂ اندلس" ترتیب دیا۔ قاضی صاحب وضع دار قسم کے بزرگ تھے۔ اوّل تو موٹر گاڑی میں سفر کرتے اور اگر کہیں نصیبِ دشمناں ٹرین میں سوار ہونا پڑتا تو درجہ اوّل میں بھی انہیں کوفت ہوتی۔ شہر کے بہترین ہوٹل میں قیام پذیر ہوتے اور اُٹھتے بیٹھتے سرکارِ برطانیہ کی نمک خواری پر نازاں "خُدا سر سبز رکھے گلزارِ انگلشیہ کو" کا ورد کرتے۔ قاضی صاحب نے آج سے نصف صدی قبل ضعیف العمری اور نازک مزاجی کے باوجود اسلامی تاریخی مقامات اور

عمارتوں کی تلاش میں ہسپانیہ کا کونہ کونہ چھان مارا۔ جہاں ان کا اندازِ بیاں بے حد شگفتہ ہے وہاں ان کی تاریخی بصیرت بھی حیران کن ہے۔ میں جب بھی اُن کے سفرنامہ اندلس کی ورق گردانی کرتا ہوں تو مجھے اپنی کم مائیگی کا شدت سے احساس ہونے لگتا ہے۔ جہاں "اندلس میں اجنبی" ایک کھلنڈرے۔ لاپرواہ اور کم علم سیاح کی آوارہ گردی کی داستان ہے۔ وہاں قاضی صاحب کا "سفرنامہ اندلس" ایک محقق اور صاحبِ علم ہستی کی سیاحت کا نچوڑ ہے جس میں ہسپانیہ کے شہروں، دریاؤں، جھیلوں، پھولوں، زراعت، موسم، ریل، گداگروں، خانقاہوں اور قمار خانوں سے لے کر چوپایوں اور موذی جانوروں تک کا ذکر ملتا ہے۔ وہ سفرنامے کے آغاز میں لکھتے ہیں" میں نے ۱۹۲۴ء کا سفرِ یورپ محض اندلس کی صحرانوردی کے لئے کیا تھا۔ یہ اوراقِ پریشاں سامانِ دلکشی سے مُعرّا ہیں۔ تجارت کی گرم بازاری، مجالس کی دلفریبی، رقص وسرود کی بزم آرائیاں دیکھنا مقصود ہوں تو فرانس ولندن کے سفرنامے کو دیکھو۔ اندلس میں راقم الحروف نے سب سے جُداگانہ راستہ اختیار کیا ہے۔ جو بجائے تھیٹر، باغات، محلات، بازارات، میلہ مناظر تفریح کے ہمیشہ پُرانے کھنڈروں کی طرف جانکلا ہے۔ ہر شہر کے شکستہ و ریختہ آثارِ اسلامی کا ہلکا سا نقشہ ناظرین کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ دلچسپ مقامات کی سیر کے لیئے کافی فرصت اور اطمینان کی ضرورت ہے۔ ایک ملازم پیشہ۔ غریب الدیار ناواقف سیاح چار ماہ کی قلیل مدت میں اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا تھا۔

ھ گلشن میں پھروں کہ سیرِ صحرا دیکھوں | یا معدن کوہ ودشت ودریا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے لاکھوں جلوے ہے | حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں!

آئندہ اوراق میں قاضی صاحب بھی میرے ہمراہ ہوں گے۔ اُمید ہے آپ ان کے طرزِ بیان اور وضع داری سے لُطف اندوز ہوں گے۔ سب سے پہلے تو سان سیاستیان کے بارے میں اُن کے تاثرات سنیئے۔ لکھتے ہیں۔

"سنت سیبیشین کا شہر ہلالی شکل میں آباد ہے۔ دونوں گوشوں پر ٹیکرے آگئے ہیں۔ وسط میں ایک ٹیکرہ سمندر میں مثلِ جزیرہ آگیا ہے۔ ساحلِ سمندر پر زن ومرد نیلگوں ریشمی جانگیہ پہنے دوڑتے بھاگتے۔ اُچھلتے کودتے چہلک بلیہ کھیلتے پھرتے ہیں۔ جب تھک جاتے ہیں تو دھوپ میں زمین پر لیٹ جاتے ہیں۔ سمندر میں تیرتے ہیں اور باہر نکل کر تازہ آبِ شیریں میں غوطہ لگا کر لباس بدلتے ہیں۔ صدہا زن ومرد

کا روزانہ صبح و شام یہی مشغلہ ہے۔ فرصت ہوتی تو ٹینس کے تپتے نکل گئے یا رقص خانہ میں جا کر محوِ کیک خرامی ہو گئے۔ غرضیکہ ہر شخص بے فکر و بدمست ہے۔"

آج پچیس برس بعد بھی سان سباستیان کے ساحل کا نقشہ انہی الفاظ میں کھینچا جا سکتا ہے۔ دونوں گوشوں پر ٹیکرے یعنی اگلڈو اور اُرگل کی پہاڑیاں۔ درمیان میں ایک ٹیکرہ سمندر میں مثل جزیرہ یعنی سانتا کلارا۔ اس وقت بھی میرے سامنے زن و مرد ریشمی جانگیئے پہنے دوڑ بھاگ رہے تھے۔ شاید یہ چہلک بلبہ بھی کھیل رہے ہوں۔ وثوق سے نہیں کہہ سکتا کیونکہ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ یہ چہلک بلبہ کیا بلا ہوتی ہے۔ پونے چار بجے کے قریب لوگوں نے ساحل سے اُٹھنا شروع کر دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے یا تو اُن سب کو یکدم کوئی ضروری کام یاد آ گیا ہے اور یا پھر سامنے والے سانتا کلارا جزیرے میں ایٹمی دھماکے کا تجربہ ہوا چاہتا ہے۔ چار بجے تک پوری کو بچا یچ پر صرف دو تنفس۔ ایک مستنصر اور ایک بوڑھا رہ گئے۔ میں نے بوڑھے سے جو میرے قریب ہی اوندھے منہ لیٹا اونگھ رہا تھا اس ہجرت کا سبب پوچھا۔ اس نے بمشکل آنکھیں کھول کر اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ کی اور پھر جیسے اسے بچھو نے کاٹ لیا ہو۔

"کوریدا۔ کوریدا" اس نے دونوں ہاتھ بے قراری سے ہوا میں لہراتے اور جلدی سے اپنا سامان سمیٹ کر وہاں سے چل دیا۔

مجھے یاد آیا کہ پیرس کے قہوہ خانہ "بنگال" میں ایک امریکی نے مجھے یہ بتا کر ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا کہ وہ ہر اتوار باقاعدگی سے سان سباستیان صرف اس لیے جاتا ہے کہ وہاں کے بُل رنگ میں ہسپانیہ کے بہترین بُل فائٹر اپنے جوہر دکھاتے ہیں۔ آج اتوار تھا اور چار بج رہے تھے۔ "کوریدا" یعنی بُل فائٹ شروع ہونے کو تھی۔ میں نے جلدی سے سمندر کے نمکین پانی میں ایک ڈبکی لگائی۔ پھر باہر نکل کر تازہ آبِ شیریں میں غوطہ لگا کر کپڑے بدلے اور ساحلی سڑک کو پار کر کے شہر کی جانب چل دیا۔ بُل رنگ کا راستہ دریافت کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ سان سباستیان کے باشندوں کی اکثریت ایک ہی جانب رواں تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کہیں شیرینی بٹ رہی ہے اور لوگ اپنا حصہ لینے جا رہے ہیں۔ اکثر لوگوں کے ہاتھوں میں آج کی بُل فائٹ کے بارے میں تفصیلی کتابچے تھے۔ آج کی فائٹ میں لڑنے والے تین بُل فائٹروں کے زندگی کے حالات۔ مقابلے میں آنے والے بُل کس کس فارم پر پلے ہیں؟ کونسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں؟ وغیرہ۔

سان سباستیان کا بُل رنگ شہر سے باہر سمندر کے کنارے ایک ٹیلے پر واقع ہے۔ بُل رنگ کے سامنے

اتنا زبردست ہجوم تھا کہ بُل رنگ کی پہلی منزل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ٹکٹ گھر کے بارے میں جس کسی ہسپانوی سے پوچھتا وہ اپنی زبان میں کوئی لچھے دار فقرہ کہہ کر غائب ہو جاتا۔ بُل فائٹ شروع ہونے میں صرف چند منٹ باقی تھے اور ہر ایک اسی کوشش میں تھا کہ جلد از جلد ٹکٹ خرید کر بُل رنگ کے اندر بہترین نشستوں پر قبضہ جمائے۔ خاصی دیر اِدھر اُدھر دھکے کھانے کے بعد ایک بڑی اماں کو میرے حال پر ترس آگیا اور اس نے مجھے ٹکٹ گھر تک پہنچا دیا۔ اسی پسیتے والے ٹکٹ کے حصول کے لئے باقاعدہ دھکم پیل جاری تھی۔ چونکہ میں لاہور کے سینماؤں میں ٹکٹ خریدتے وقت ایسے دشوار مراحل سے کئی مرتبہ سرخرو ہو کر نکلا تھا۔ اس لئے میں نے سو پسیتے کا ایک نوٹ مٹھی میں دبایا اور خالص لاہوری انداز میں "ایلی" کا نعرہ لگا کر صفیں چیرتا ہوا کھڑکی تک جا پہنچا۔ میری مٹھی جب ٹکٹ فروخت کرنے والے کی ناک کے عین سامنے کھلی تو اس ظالم نے انگلیاں نچا کر ٹکٹ ختم ہونے کا اعلان کر دیا۔ اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا کہ ایک سو بیس پسیتے والا نسخہ خریدا جاتے۔ بُل رنگ کے گرد بنی ہوئی راہداری سے بالائی منزل تک لکڑی کی سیڑھیاں جا رہی تھیں۔ پہلی منزل پر ٹکٹ دکھایا تو گیٹ کیپر نے منہ بنا لیا اور انگلی کھڑی کر کے اوپر کی طرف اشارہ کر دیا۔ دوسری منزل پر بھی یہی حشر ہوا۔ بالآخر تیسری منزل پر قسمت نے یاوری کی اور میں تماشائیوں کے ایک ریلے کے ساتھ بُل رنگ کے اندر پہنچ گیا۔

ہیے تورو

سان سباستیان کے یونانی تھیٹر نما بُل رنگ میں ہزاروں تماشائی دم سادھے بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔ ان سب کی نظریں ایک نقطے پر منجمد تھیں۔ ایک ایسا نقطہ جس کی زد میں ایک سُرخ پھاٹک اور اس کے کواڑ پر ہاتھ رکھے ایک بوڑھا آیا ہوا تھا۔ میری نظریں بھی اُسی ایک نقطے پہ لگی تھیں۔ ہر طرف مکمل خاموشی تھی۔ بُل رنگ کا نصف حصّہ سائے میں تھا اور بقیہ نصف حصّے پر تیز دُھوپ چمک رہی تھی۔ بُل رنگ کی بالائی منزل کو جہاں میں بیٹھا تھا اسلامی طرزِ تعمیر کی خوبصورت محرابیں گھیرے ہوئے تھیں۔ سُورج کی کرنوں سے منوّر نصف حصّے میں واقع محرابوں کا سُرخ رنگ نہایت شوخ لگ رہا تھا۔ سُرخ رنگ جو بُل فائٹ کا نمایاں رنگ ہے.... سُرخ محرابیں۔ سُرخ رومال۔ سُرخ وردیاں اور پھر سُرخ خون.... اکثر اوقات بُل کا اور کبھی کبھار انسان کا.... بُل فائٹر کا۔ بُل رنگ کے درمیانی میدان کی سطح پر بچھی ریت نہایت ہموار تھی۔ میدان بالکل خالی پڑا تھا .... چند لمحوں میں یہاں موت کے سائے روشنیوں کا پیچھا کرنے والے تھے۔ میں اپنے اردگرد بیٹھے ہزاروں لوگوں کی طرح ایک ایسے ڈرامے سے پردہ اُٹھنے کا منتظر تھا جس میں دوپہر کی دھوپ شام کے سائے۔ گرم ریت ایک حیوان اور ایک انسان مرکزی کردار ادا کرنے والے تھے۔ انسان یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اس میں موت کے سامنے سینہ سپر ہونے کی صلاحیت موجود ہے۔ وہ اب بھی لاکھوں برس قبل جنگلوں میں رہنے والے اپنے آباؤ اجداد کی مانند ایک جنگلی درندے کے سامنے اکیلا خم ٹھونک کر کھڑا ہو سکتا ہے اور اسے اپنی قوتِ بازو سے زیر کر سکتا ہے۔ اور حیوان.... یہ ثابت کرنے کے لیے کہ انسان یہ جنگ جیت بھی لے تو کیا۔ یقینی موت کا سامنا بے جگری سے کرنا ہی جرأت کی معراج ہے۔

ہر سُو مکمل سکوت تھا۔ میں لکڑی کی سخت نشست پر بیٹھا نیچے سُرخ دروازے پر نظریں جمائے ہوتے تھا۔ اچانک بگل کی تیز آواز بُل رنگ میں گُونج گئی۔ بوڑھے نے دائیں ہاتھ سے اپنا بوسیدہ ہیٹ اُتار کر ماتھے کا پسینہ پونچھا، پھر بائیں ہاتھ سے اصطبل کا سُرخ پھاٹک زور لگا کر دھکیلا اور بڑی پھُرتی سے پیچھے ہٹ گیا۔ چشم زدن میں ایک بھاری بھرکم سیاہ بُل بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اصطبل میں سے سرپٹ دوڑتا ہوا اکھاڑے میں داخل ہوگیا۔ اِس مکمل سکوت میں اس کے طاقتور سُموں کی دھمک تیسری منزل پر مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ اُس کے بوجھ تلے بُل رنگ کی زمین لرز رہی تھی۔ اُس نے میدان کا ایک چکّر لگایا۔ شکار کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ میدان خالی نظر آیا تو لکڑی کی اونچی گیلری پر حملہ آور ہوا۔ گیلری کے پیچھے بیٹھے ہوتے چند تماشائیوں کی چیخیں نکل گئیں۔ دو چار ٹکّروں کے بعد جب بُل کو احساس ہوا کہ وہ گیلری توڑ کر تماشائیوں تک نہیں پہنچ سکتا تو بھاگتا ہوا میدان کے درمیان میں آ کھڑا ہوا۔ طاقتور۔ مغرور اور ہسپانوی زبان میں "لیرا فاداد" یعنی ناقابلِ تسخیر۔ اُس کو اپنے آپ پر اعتماد ہے کہ وہ اپنے راستے میں حائل ہونے والی ہر شئے کو فنا کر دے گا۔ کیونکہ اُس میں ایک اچھے بُل کی تمام خاصیتیں موجود ہیں۔ مضبوط موٹی کھال۔ چمکتی آنکھیں۔ چوڑا ماتھا۔ سُم اور سر چھوٹے۔ موٹی گردن جس پر گوشت کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ چوڑے کاندھے، دُم لمبی اور پتلی۔ اور پھر اس کا خطرناک ترین ہتھیار سینگ جو آگے کی طرف مُڑے ہوتے تھے۔ ایک اعلیٰ نسل کا بُل جو بہترین بُل فائٹنگ کے لیئے موزوں ترین تھا۔

بُل کے میدان کے درمیان میں کھڑے ہوتے ہی یہ مکمل سکوت کچھ یوں ٹوٹا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ "ہے تورو۔ تورو" تماشائی اپنے رومال، ہیٹ اور پنکھے ہلا ہلا کر اُسے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میرے قریب بیٹھے ہوتے دو موٹے ہسپانوی میدان میں کھڑے بُل کے بارے میں بحث کرنے لگے۔

"بُل شکل سے تو "براریتو" یعنی بہادر لگتا ہے۔"

"نہیں مجھے تو "آران کادا" یعنی قدرے بزدل معلوم ہوتا ہے۔"

اگلی نشست پر بیٹھی ایک بڑھیا نے مُڑ کر دونوں کو ڈانٹ پلائی "براریتو یا آران کادا نہیں

ہے صرف مانسو یعنی غصیلا ہے۔"

"ہاں بڑی آماں تھیں تو معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ برار تو نہیں ہے کیونکہ بُل کی بہادری اس کی ماں پر منحصر ہوتی ہے" اُدھر سے جواب آیا۔ پاس بیٹھے ہوئے لوگ ہنسنے لگے۔ بڑھیا نے بھی بُل کی ماں کا خطاب ملنے پر بالکل بُرا نہ مانا۔

بُل جو پہلے سر اٹھاتے ہوئے بڑے اعتماد سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا پبلک کے شور مچانے پر قدرے گھبرا گیا۔ ہزاروں آوازوں کا شور "ہے نوردو۔ ہے نوردو"۔ اس نے بُل رنگ کے چاروں طرف دیکھا۔ اپنے پچھلے سُم ریت میں رگڑے اور تپتے ہوتے میدان کے درمیان سر اٹھا کر مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔ "پیرا فنادو" ناقابلِ تسخیر۔

بُل فائٹنگ ہسپانوی تہذیب و ثقافت کا ایک ایسا جزو ہے جس کے بغیر ہسپانیہ کا وسیع کینوس بے رنگ ہو کر رہ جاتا ہے۔ غیر ملکی اسے بربریت سے بھرپور وحشیانہ اور ظالمانہ قرار دیتے ہیں۔ بھلا جس کھیل میں ہر بار چھ بھینسے ہلاک ہوں، متعدد گھوڑے زخمی ہو جائیں اور کبھی کبھار انسان بھی مارا جاتے اُسے کھیل کیسے کہا جا سکتا ہے؟ اِدھر ہسپانوی بُل فائٹنگ کو موسیقی۔ رقص اور مصوری کی مانند فنونِ لطیفہ کی ایک شاخ قرار دیتے ہیں۔ بربریت کے الزام کے جواب میں وہ امریکی فٹ بال اور باکسنگ کی مثال پیش کرتے ہیں۔ ان ہر دو کھیلوں میں مرنے والوں کی تعداد بُل فائٹنگ میں ہلاک ہونے والوں سے کہیں زیادہ ہے۔ پھر بُل فائٹنگ ظالمانہ کھیل کیسے ہو گیا اور اگر ہو بھی تو ہسپانویوں کے نزدیک آسنی ڈھیر ساری خوبصورتی کے لئے تھوڑا سا ظلم بھی جائز ہے۔ اور جہاں تک ناقدین کا تعلق ہے وہ جائیں بھاڑ میں۔

ہر ہسپانوی بُل فائٹنگ کو اپنے مخصوص نکتہ نظر سے پرکھتا ہے۔ چند ایک کے لیے یہ جذباتی مسئلہ ہے۔ ان کی تمام ہمدردیاں بُل فائٹر کے ساتھ ہوتی ہیں اور داد و تحسین کے نعرے بُل کے لیے۔ کچھ لوگ اسے اپنے مذہبی جذبات کی تسکین کا ذریعہ بناتے ہیں۔ کیا بُل فائٹنگ کا انداز "ویرونیکا" سینٹ ویرونیکا کے نام پر نہیں جس نے رومال سے حضرت عیسےٰؑ کے چہرے سے پسینہ پونچھا تھا؟ چند ایک کے لیے یہ انا کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ میدان میں کھڑا بُل فائٹر ایک ہسپانوی ہے اور اُس کے سامنے سرنگوں بُل دنیا کی تمام دوسری قومیں۔ کچھ لوگ بہرصورت بُل فائٹر کو ہلاک ہوتا ہوا دیکھنے کی تمنا کر

اُٹھتے ہیں۔ بہر حال وجوہات کچھ بھی ہوں بُل فائٹنگ ایک ایسا کھیل یا فن ہے جس کے بغیر شاید ہسپانوی رُوح مُردہ ہو جاتی۔ جس طرح خوبصورت موسیقی سے لطف اندوز ہونے کے لیے ذوق کے ساتھ ساتھ موسیقی کی رمزیں جاننا از حد ضروری ہے اسی طرح بُل فائٹنگ کو سمجھنے اور پسند کرنے کے لیے اس فن کے بارے میں چند بنیادی باتیں جاننا بھی انتہائی اہم ہے ورنہ پہلی بار اس کھیل کو دیکھنے والے تماشائی کو شاید بُل فائٹر ایک ظالم قصاب کی صورت میں نظر آتے جو غریب بُل کو ہلاک کر کے عوام سے داد وصول کرتا ہے۔

بُل فائٹنگ کے پیشے کی دلکشی۔ شہرت۔ عزّت اور دولت ایسے عناصر ہیں جو ہزاروں ہسپانوی نوجوانوں کو ہر سال اپنی طرف کھینچ لاتے ہیں جیسے ہمارے ہاں اکھاڑوں میں استاد پہلوان نوجوان لڑکوں کو داؤ پیچ سکھاتے ہیں اور اُن میں سے معدودے چند ہی اس پیشے کی بلندیوں پر پہنچ پاتے ہیں۔ ایسے ہی ہسپانیہ کے اکثر شہروں میں بُل فائٹنگ کے باقاعدہ سکول ہیں جہاں سے کامیاب ہونے والے ایک ہزار نوجوانوں میں سے بمشکل ایک سو کسی چھوٹے موٹے بُل رنگ میں داخل ہوتے ہیں اور ان میں سے دو چار ہی پیشہ ور بُل فائٹر بننے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اور پھر ہزاروں پیشہ ور بُل فائٹروں میں سے ایک دو شہرت کی ان بلندیوں کو پہنچتے ہیں جن کی کشش انہیں اس پیشے میں کھینچ لاتی تھی۔ پیشہ ور بُل فائٹر کا خطاب ہمیشہ میڈرڈ کے بُل رنگ میں دیا جاتا ہے۔

بُل فائٹنگ میں دو طرزیں ہیں۔ ایک اندلس کی اور دوسری میڈرڈ سے متعلق ہے۔ میڈرڈ کی روایات کے پابند بُل فائٹر کا رجحان شوخی کی جانب ہوتا ہے اور وہ بُل کے گزرنے کے بعد ایک بُت کی مانند ساکت ہو جاتا ہے۔ بُل فائٹر اندلس کا ہو تو وہ صاحب طرز اور پھرتیلا ہوگا۔

ارنسٹ ہیمنگوے اپنی کتاب (DEATH IN THE AFTERNOON) میں لکھتا ہے:-

"اندلس کے صُوبے کو ہمیشہ سے یہ فخر حاصل ہے کہ عظیم بُل فائٹروں کی اکثریت اسی خطہ زمین سے تعلق رکھتی ہے۔ یہاں کے بُل بھی ہسپانیہ بھر میں بہترین مانے جاتے ہیں۔ یہ گرم آب و ہوا اور مسلمانوں کے خُون کی آمیزش کا اثر ہے کہ اندلسی بُل فائٹر پُر وقار اور پُر سکون ہوتے ہیں۔ بالخصوص ہسپانیہ کے دُوسرے صوبوں سے تعلق رکھنے والے بُل فائٹروں میں ناپید ہیں۔"

عام تخیّل کے برعکس ایک اچھے بُل فائٹر کے لیے طاقتور ہونا بالکل ضروری نہیں۔ اچھا بُل فائٹر تکنیک اور سائنس کی آمیزش کو بروئے کار لا کر بُل کو اپنے بس میں کر لیتا ہے۔ ایک دفعہ خانہ بدوشں

بُل فائٹر راغیل ال گالو سے کسی نے پوچھا کہ وہ اپنی طاقت بڑھانے کی خاطر کونسی ورزش کرتا ہے تو اُس نے جواب دیا "مجھے طاقت کی کیا ضرورت ہے"؟ عام بُل کا وزن تقریباً آدھ ٹن ہوتا ہے۔ کیا میں ورزش کے ذریعے اس کی طاقت کی ہمسری کر سکتا ہوں؟ بُل کو اپنی طاقت بڑھانے دو"۔

ایک بُل فائٹ میں چھ بُل ہلاک کئے جاتے ہیں اور ہر بُل فائٹر کے حصّے میں دو بُل آتے ہیں۔ اگرچہ آٹھ ماہ کے بُل فائٹنگ کے سیزن میں (سردیوں میں بُل فائٹنگ نہیں ہوتی) ایک بُل فائٹر سو سے زیادہ بُل ہلاک کرتا ہے مگر یہ کبھی نہیں ہوا کہ بُل فائٹر ہمیشہ ہی اس کھیل کے اختتام پر فاتح بن کر اُبھرے۔ کبھی کبھار کسی گرم دوپہر بُل کے نوکیلے سینگ چشم زدن میں سنہری ریشمی لباس پھاڑ کر سُرخ خون میں لتھڑ جاتے ہیں۔ سُرخ انسانی خون میں۔ ہسپانیہ کا عظیم بُل فائٹر مونالیتے ایک ایسی ہی دوپہر کو جب لنارس کے غیر معروف بُل رنگ میں ہلاک ہوا تو پورے ہسپانیہ میں سرکاری طور پر سوگ منایا گیا۔ اسی لئے تو بُل فائٹ کو پُر وقار ہونے کے ساتھ ساتھ خطرناک اور افسوس ناک بھی قرار دیا جاتا ہے۔

عظیم بُل فائٹروں کی اکثریت بُل کی بجائے ٹی بی اور سفلس جیسے امراض کا شکار ہوتی ہے۔ بُل فائٹر جب بُل رنگ میں قدم رکھتا ہے تو سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا ہوتا ہے وہ سنہری بروکیڈ کی چُست جیکٹ، چمڑے کے بوٹوں، سونے چاندی اور رنگین پتھروں سے مزین ریشمی پتلون میں ملبوس ہوتا ہے۔ بھاری اور زرنگار لباس کے اندر ہوا کا گزر تک نہیں ہوتا اور اس کے جسم سے پسینے کے فوارے چھوٹنے لگتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ سورج غروب ہونے لگتا ہے یہاں تک کہ بُل فائٹ کے اختتام پر خاصی خنکی ہو جاتی ہے۔ گرمی اور سردی کی شدت اس کے پھیپھڑوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ بُل رنگ کی دھول بھی مُہلک ثابت ہوتی ہے اور بل فائٹر ٹی بی کا شکار ہو جاتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ موسمی عناصر کے تغیّر پر تو اس کا اختیار نہیں مگر سفلس .... ؟ اس کا جواز کچھ یوں دیا جاتا ہے کہ بُل فائٹر بھی ایک فنکار کی مانند اگر شادی کرے تو اس کی صلاحیتیں مفلوج ہو کر رہ جاتی ہیں چونکہ اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ عورتوں سے میل جول بڑھانے سے قبل انہیں اچھی طرح پرکھ سکے۔ اس لیے کبھی نہ کبھی کوئی "چنچل لڑکی" اُسے یہ خوفناک تحفہ دے جاتی ہے۔ بُل فائٹر اپنی جان نہ صرف بُل رنگ میں بلکہ بستر میں بھی داؤ پر لگاتا ہے۔

چونکہ بُل فائٹ صرف اس وقت شروع ہوتی ہے جب بُل رنگ کا نصف حصّہ دھوپ میں اور بقیہ

نصف چھاؤں میں آجاتے اس لیے بل فائٹ کے اوقات بدلتے رہتے ہیں۔ اس عظیم تماشے کی تکنیک اور کامیابی کا راز سورج کے چمکنے میں پنہاں ہے۔ جب تک سورج بل رنگ کے نصف حصے پر نہ چمکے بل فائٹنگ کا لطف نہیں آتا۔ ایک ہسپانوی مقولے کے مطابق "سورج سب سے عظیم بل فائٹر ہے" دھوپ کے بغیر بل فائٹر اپنے آپ کو نامکمل سمجھتا ہے یوں جیسے وہ سانسوں کے بغیر پیدا ہوا ہو۔

بل فائٹر اور سورج کے بعد بل فائٹنگ کی سٹیج کا سب سے اہم کردار بل ہوتا ہے۔ ہسپانیہ کے طول و عرض میں متعدد ایسے فارم ہیں جہاں پر بل فائٹنگ میں حصہ لینے والے اعلیٰ نسل کے بل پالے جاتے ہیں۔ ہر فارم کا بل مخصوص عادات و اطوار کا مالک ہوتا ہے۔ تجربہ کار تماشائی بل کے بل رنگ میں داخل ہوتے ہی بتا دیتے ہیں کہ یہ فلاں فارم کا پروردہ بل ہے۔ پرورش کے دوران میں سوائے رکھوالے کے اور کوئی شخص بل کے پاس نہیں پھٹک سکتا تاکہ وہ انسانوں کے ساتھ میل جول سے اپنے خوفناک جنگلی اطوار نہ کھو دے۔ یہی وجہ ہے کہ بل رنگ میں داخل ہوتے ہی تماشائیوں کا شور و غوغا بل کو پریشان کر دیتا ہے۔ دریائے وادی الکبیر کی دلدلوں میں پرورش پانے والے بل بہترین جانے جاتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں کرنجا فارم کے پروردہ ایک بل نے اپنے سینگ سے ڈومنگو نامی بل فائٹر کی ایک آنکھ نکال دی۔ اس حادثے کے بعد ڈومنگو کو کانا بل فائٹر کہا جانے لگا اور اس نے قسم کھائی کہ اب وہ ساری زندگی صرف کرنجا فارم میں پلے ہوئے بل سے ہی لڑے گا۔

بہترین بل فائٹنگ کے لئے بل کا وحشی اور ناتجربہ کار ہونا از حد ضروری ہے۔ اسی لیے جو بل ایک مرتبہ بل رنگ میں داخل ہو جاتے اسے ہمیشہ ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے اُسے بل رنگ میں نہ مارا جا سکے تو پھر بل فائٹ ختم ہونے پر اُسے فارم میں لے جا کر ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ اگر بل کو نہ مارا جاتے اور ایک سے زائد مرتبہ اسے بل رنگ میں داخل ہونے کا موقعہ دیا جاتے تو وہ پچھلے تجربے کی بنا پر بل فائٹر کو یقیناً ہلاک کر دیتا ہے۔ شروع شروع میں جب یہ پابندی عائد نہ تھی تو ہر سال بل رنگ میں سینکڑوں بل فائٹر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے چنانچہ ۱۵۶۷ء میں پوپ نے اُن تمام عیسائی شہزادوں کو مذہب سے باہر نکال دینے کی دھمکی دے دی جن کی ریاستوں میں بل فائٹنگ رائج تھی۔ بالآخر سب نے متفقہ طور پر ایک ایسا قانون لاگو کرنے کا فیصلہ کیا جس کے تحت ایک بل صرف ایک مرتبہ ہی بل فائٹنگ میں حصہ لے سکتا تھا۔

اب بھی ہسپانیہ کے دور افتادہ قصبوں میں اس قانون کا احترام نہیں کیا جاتا۔ قصبے کے باشندے اتنے غریب ہوتے ہیں کہ وہ ہر بل فائٹ کے لیے نیا بل خریدنے کی سکت نہیں رکھتے۔ چنانچہ خرانٹ اور

تجربہ کار بُل ہمیشہ بُل فائٹر کو ہلاک کر دیتا ہے۔ ایک ایسے ہی بُل کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے ایک سیزن میں سولہ بُل فائٹروں کو ہلاک کر ڈالا۔ اس کا سولہواں شکار ایک چودہ سالہ خانہ بدوش لڑکا تھا جس کا ایک بھائی اور بہن اس حادثے کے وقت بُل رنگ میں موجود تھے۔ اُن دونوں نے اس قاتل بُل سے اپنے بھائی کا بدلہ لینے کا فیصلہ کیا اور اُس کے بعد بُل جہاں بھی جاتا وہ اس کا پیچھا کرتے تاکہ موقع پا کر اس کا کام تمام کر دیں۔ اُدھر بُل کا مالک اپنے قیمتی جانور کی بے حد حفاظت کرتا تھا اس لیے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یونہی کئی برس بیت گئے اور خانہ بدوش لڑکا اور لڑکی انتقام کی آگ سینے میں سلگائے بُل کا تعاقب کرتے رہے۔ بالآخر ایک وقت ایسا آیا کہ بُل بوڑھا ہو گیا اور اُس کے مالک نے اسے ناکارہ جان کر وُلنسیا کے بوچڑ خانے میں فروخت کر دیا۔ خانہ بدوش جوڑے نے بوچڑ خانے کے مالک کو اپنے پیارے بھائی کے ہلاک ہونے کی داستان سنائی اور اس سے درخواست کی کہ انہیں بُل کو مارنے کی اجازت دی جائے۔ مالک کو تو صرف بُل کے گوشت سے غرض تھی چنانچہ اُس نے اجازت دے دی۔ اور یوں لڑکے نے پہلے اپنی انگلیوں سے بُل کی دونوں آنکھیں نوچ ڈالیں اور پھر خون آلود گڑھوں میں تھوکا۔ اس کے بعد اُس نے ریڑھ کی ہڈی خنجر سے کاٹ دی۔ سب سے آخر میں دونوں بہن بھائیوں نے بُل کا کلیجہ نکالا اور بوچڑ خانے سے باہر گرد آلود گلی میں بیٹھ کر اُسے ایک سیخ پر بھون کر کھا گئے۔ اس انوکھے انتقام کے بعد وہ چُپ چاپ اپنے وطن کو لوٹ گئے۔

گیٹ کیپر کو جب میں اپنا ٹکٹ دکھا کر بُل رنگ کے اندر داخل ہوا تھا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے شوخ رنگوں کا ایک متحرک سیلاب ہے جو میری آنکھوں میں کھنچا چلا آتا ہے۔ پورا بُل رنگ ایک بڑے ملتانی پیالے کی مانند تھا جس کے اندرونی حصے میں ہر رنگ کے چھینٹے تھے۔ بُل رنگ کے آداب سے ناواقفیت کی بنا پر میں لکڑی کی سخت نشست پر رکھنے کے لیے گدّا لانا بھول گیا تھا۔ یہ گدّے کرائے پر مل جاتے ہیں۔ تماشائیوں کی اکثریت ہسپانوی تھی مگر مختلف گروہوں میں غیر ملکی سیّاح بھی تھے۔ کیمرے اور بُل فائٹ کے کتابچے ہاتھوں میں لیے وہ اپنے گائیڈ حضرات کا منہ تک رہے تھے جو انہیں ہونے والی بُل فائٹ کی تفصیلات بتا رہے تھے۔

بُل کے میدان کے اندر داخل ہونے پر بُل فائٹ شروع نہیں ہوتی بلکہ اس کا آغاز اس سے بہت پہلے ایک رسمی کارروائی کے ذریعے ہوتا ہے جس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

بُل فائٹ شاید ہسپانیہ کی وہ واحد تقریب ہے جس کا آغاز وقتِ مقررہ پر ہوتا ہے۔ عین وقت پر پُورا ہجوم بالکل خاموش ہو گیا اور سب کی نگاہیں سایہ دار حصّے میں واقع صدر کی کیبن پر لگ گئیں۔ صدرؔ نے جو اِس تقریب کا مختارِ کُل ہوتا ہے اپنا معطر رومال فضا میں لہرا کر بُل فائٹ کے شروع ہونے کا اعلان کیا اور اس کے ساتھ ہی بُل رنگ میں بگل کی آواز گونجی اور شاہانہ لباس میں ملبوس دو گھڑ سوار اپنے گھوڑے سرپٹ دوڑاتے صدر کی کیبن کے عین نیچے آن رُکے۔ یہ گھڑ سوار "ال گوسلز" کہلاتے ہیں۔ صدر کے تمام احکامات بُل فائٹر تک پہنچانا ان کے ذمّے ہوتا ہے۔ گھڑ سوار جھک کر صدر سے پریڈ کے آغاز کی اجازت چاہتے ہیں اور اجازت ملنے پر اپنے گھوڑے سرپٹ دوڑاتے بُل رنگ سے باہر نکل جاتے ہیں۔ صدر کی کیبن سے ملحقہ کیبن میں موسیقاروں کا ایک طائفہ بُل فائٹ کی روایتی دُھنیں بجانے لگا ان میں بگل کی آواز نمایاں ہے۔ موسیقی شروع ہوتے ہی لوگوں کی نگاہیں صدر کی کیبن سے ہٹ کر مخالف سمت میں واقع دروازے پر لگ گئیں۔ اب "پاسیو" یا پریڈ شروع ہونے کو تھی۔ اس پریڈ میں بُل فائٹ میں شامل تمام افراد اور جانور حصہ لیتے ہیں۔ پاسیو کی قیادت گھڑ سوار "ال گوسلز" کرتے ہیں۔ اُن کے پیچھے تینوں بُل فائٹر شانہ بشانہ ٹھوڑیاں اوپر کیے۔ آنکھیں صدر کی کیبن پر جماتے ہجوم کی تالیوں کے جواب میں ہاتھ ہلاتے ہوتے چلتے آ رہے ہیں۔ ان کے سنہری ہیٹ بروکیڈ کی سنہری وردیوں اور ریشمی پتلونوں پر جڑے ہوتے رنگ برنگے شیشوں پر نظر نہیں ٹکتی۔ بُل فائٹروں کے ہمراہ مددگار بُل فائٹر بھی چلے آ رہے ہیں جو اڑے وقت میں بُل کو اپنی طرف متوجہ کر کے بُل فائٹر کی جان بچا لیتے ہیں۔ ان کے عقب میں چپڑاسی ہوتے ہیں۔ چپڑاسیوں کے پیچھے "باندریلو" آ رہے ہیں اور پھر گھڑ سوار "پکاڈور" یا برچھی بردار۔ سب سے آخر میں بُل رنگ میں کام کرنے والے ملازم اُن خچروں کو لیے آتے ہیں جو مُردہ بُل کو گھسیٹ کر اصطبل میں لے جانے کے کام آتے ہیں۔ قافلوں، ہتھیاروں اور میت اٹھانے والوں کا جلوس۔ صدر کی کیبن کے نیچے پہنچ کر بُل فائٹر اپنے ہیٹ اتار صدر کو کورنش بجا لاتے ہیں اور پھر جلوس منتشر ہو جاتا ہے۔ بُل فائٹر بُل رنگ کی گیلری کے پیچھے چلے جاتے ہیں۔ باقی عملہ بُل رنگ سے باہر چلا جاتا ہے۔ "پاسیو" کا اختتام۔ لکڑی کی گیلری کے پیچھے کھڑے ہو کر بُل فائٹر اپنے نمائشی لبادے اتار کر کسی دوست یا اکثر اوقات اپنی محبوبہ کے حوالے کر دیتے ہیں۔ بُل فائٹ کے دوران میں یہ لبادہ اس شخص کی گود میں یا اس کے سامنے گیلری پر رکھا رہتا ہے۔ جہاں بُل رنگ میں بیٹھے ہوتے تمام تماشائی اُسے آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔

بُل فائٹر اگر خوبصورتی سے لڑے تو داد و تحسین کے ڈونگرے دوست یا محبوبہ پر بھی برستے ہیں اور اگر خدانخواستہ بُل فائٹر پھسڈی ثابت ہو تو سیٹیاں بجتی ہیں اور اوتے اوتے کے نعروں سے نوازا جاتا ہے۔

اس اثنا میں بُل رنگ کے ملازم میدان میں بچھی اُس ریت کو ہموار کرتے ہیں جو پاسیو کے گزرنے سے بکھر جاتی ہے۔ کس بُل فائٹر کو کون سے بُل سے مقابلہ کرنا ہے اس کا فیصلہ بُل فائٹ شروع ہونے سے قبل لاٹری کے ذریعے کیا جاتا ہے ہاں اگر بُل فائٹر بہت بلند پائے کا ہو تو مقابلے کے بُل کا انتخاب اس کی ذاتی پسند پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اب بُل رنگ میں داخل ہونے والے پہلے بُل کے ساتھ لڑنے والا بُل فائٹر اس کپڑے کا انتخاب کرتا ہے جسے لہرا کر بُل سے کھیلا جاتا ہے۔ یہ کپڑا "کیپ" کہلاتا ہے۔ کیپ باہر سے گلابی اور اندر سے پیلے رنگ کی ہوتی ہے۔ بُل فائٹر اپنی کیپ جسم کے ساتھ لپیٹ لیتا ہے اور گیلری کے ساتھ لگ کر بیتابی اور بے چینی کی حالت میں بُل کا انتظار کرنے لگتا ہے۔ یہ وقت ایسا ہوتا ہے جب ہر بُل فائٹر بے حد مذہبی ہو جاتا ہے۔ وہ فرفر دعائیں مانگتا ہے اور بار بار اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتا ہے "کنواری مریم آج لاج رکھ لیجو... کنواری مریم بُل شریف قسم کا ہو۔ سینگ زیادہ نکیلے نہ ہوں بلکہ کیلے کی مانند ہوں۔ کنواری مریم آج اگر مجھے بُل کی دُم عطا ہو جائے تو گرجے میں جا کر پوری سو موم بتیاں جلاؤں گا۔"

اُدھر گھڑ سوار "ال گوسلز" دوبارہ صدر کی کیبن کے نیچے جاتے ہیں اور اصطبل کی چابی طلب کرتے ہیں۔ صدر اُوپر سے چابی پھینکتا ہے جو وہ اپنے پروں والے ہیٹ میں دبوچ لیتے ہیں (اگر چابی کو ہیٹ میں نہ اُچکا جا سکے تو ہجوم سیٹیاں بجا کر اوتے اوتے کرتا ہے) گھڑ سوار واپس آتے ہیں اور چابی سرخ دروازے کے پاس کھڑے بوڑھے کی طرف پھینک کر میدان سے باہر نکل جاتے ہیں۔

تپتی دوپہر میں موت

اچانک بگل کی تیز آواز بُل رِنگ میں گونج گئی ۔ بوڑھے نے دائیں ہاتھ سے اپنا بوسیدہ ہیٹ اُتار کر ماتھے کا پسینہ پونچھا اور پھر بائیں ہاتھ سے اصطبل کا سُرخ دروازہ زور لگا کر دھکیلا اور بڑی پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا ۔ چشم زدن میں ایک بھاری بھرکم سیاہ بُل ۔ ۔ ۔ بُل رِنگ میں کان پڑی آواز سُنائی نہ دے رہی تھی "ہے تورو ہے تورو" تماشائی اپنے رومال، ہیٹ اور پنکھے ہلا ہلا کر اُسے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ بُل فائٹ کے ڈرامے کا پہلا کردار خم ٹھونکے میدان میں کھڑا تھا اور بُل فائٹ شروع ہو چکی تھی ۔

میرے قریب بیٹھے ہوئے موٹے ہسپانوی میدان میں کھڑے بُل کے بارے میں بحث کر رہے تھے ۔ اگلی نشستوں میں براجمان سیاح لڑکیوں کا ایک گروہ زور زور سے تالیاں پیٹ رہا تھا ۔

باقاعدہ بُل فائٹ کا آغاز بُل فائٹر کی بجائے اُس کے معاونین نے کیا ۔ انہوں نے بُل کے آگے کیپ لہرا کر اُسے چھیڑا اور پھر بُل کے مشتعل ہونے پر اُس کے آگے پیچھے بھاگنے لگے ۔ اُن کا مقصد بُل کو اِدھر اُدھر بھگا کر اُس کی تیزی ختم کرنا تھا ۔ اس دوران میں بُل فائٹر لکڑی کی گیلری کی آڑ لئے بُل کی عادات و اطوار کو جانچ رہا تھا ۔ کونسا سینگ زیادہ استعمال کرتا ہے ؟ کونسی آنکھ تیز ہے ؟ کس جانب سے حملہ آور ہوتا ہے ؟ گردن کس زاویے پر جھکاتا ہے ؟ تھوڑی سی چھیڑ چھاڑ کے بعد معاونین واپس چلے گئے ۔ اب بُل فائٹر گیلری سے نکل کر میدان میں داخل ہوا اور پورا بُل رِنگ تماشائیوں کی تالیوں سے گونج اُٹھا ۔ بُل فائٹر نے اپنی کیپ دونوں ہاتھوں

ہیں کچھ یوں تھام رکھی تھی جیسے اُسے دُھوپ میں سُکھا رہا ہو۔ وُہ بُل سے تقریباً پانچ گز کے فاصلے پر جا کھڑا ہوا اور کیپ جھٹک کر اُسے حملہ آور ہونے کی ترغیب دی۔ بُل اپنی تھوتھنی اُٹھائے خاموش کھڑا رہا۔ بُل فائٹر نے قدرے قریب ہو کر پھر کیپ جھٹکی مگر بُل ٹس سے مَس نہ ہوا۔

"میں نہ کہتا تھا کہ یہ بُل بُزدل ہے۔" میرے قریب بیٹھے موٹے ہسپانوی نے اپنے ساتھی کو چھیڑا۔

"بس دیکھتے جاؤ۔ ابھی تو ابتدا ہے۔ بُل یقیناً بہادر ہے اور ابھی حالات کا جائزہ لے رہا ہے۔" اُس کے ساتھی نے سنجیدگی سے کہا۔

بُل فائٹر اب کیپ جھٹکنے کے ساتھ ساتھ بُل سے باتیں بھی کرنے لگا۔۔۔ ہوہو۔۔۔۔ یویو ہے۔۔۔۔ ہے تورو! بُل نے بالآخر سر اُٹھا کر بُل فائٹر کو بڑی ناراضگی سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ یہ کیا ہے تورو اور ہے ہے کی لایعنی گردان کر رہے ہو؟ جاؤ اپنا راستہ ناپو کیوں ہم فقیروں کو تنگ کرتے ہو؟ اُدھر بُل فائٹر نے اس فقیر کو تنگ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی اور اِدھر تماشائیوں نے تحریکِ عدمِ تعاون کا بے حد بُرا منایا اور تورو! تورو! کا شور مچانے لگے۔ موٹے ہسپانوی نے جو بُل کو بُزدل قرار دے چکا تھا مُنہ میں انگلیاں گھسیڑ کر اس زور سے سیٹی بجائی کہ میرے کانوں کے پردے لرز اُٹھے۔ بُل پر بھی اس شور و غوغا کا خاصا اثر ہوا۔ اُس نے اپنے سامنے کھڑے دُشمن کو غور سے دیکھا۔ پچھلے سُموں سے ریت اُڑائی اور تھوتھنی نیچے کر کے بُل فائٹر پر حملہ آور ہو گیا۔ بُل کی تھوتھنی اور سینگ کیپ کو چھُونے ہی بُل فائٹر نے پنجوں پر گھوم کر کیپ ہوا میں لہرا دی اور بُل سر نیچا کئے اپنے زور میں بھاگتا ہوا آگے نکل گیا۔

بُل فائٹنگ کا یہ انداز ویرونیکا کہلاتا ہے۔ بُل کا پہلا وار خالی گیا تو وُہ مُڑ کر پھر حملہ آور ہوا۔ اب بھی اُس کے تیز سینگ بُل فائٹر کے جسم کی بجائے صرف کیپ کو چھوئے اور وُہ ناکام ہو گیا۔

"کیوں بھئی" موٹے ہسپانوی نے اپنے ساتھی کو ٹھوکا دیا "بُل بہادر ہے کہ نہیں؟"

اب بُل بار بار بُل فائٹر کی طرف لپکتا مگر وُہ ویرونیکا انداز سے اپنے آپ کو صاف بچا جاتا۔ جب بُل سر نیچا کر کے بُل فائٹر کی جانب دوڑنا شروع کرتا تو تماشائی ایک ساتھ او۔۔۔ او۔۔۔ اوہ کا نعرہ لگاتے اور جونہی بُل کے سینگ کیپ کو چھُوتے اور بُل فائٹر پنجوں پر گھوم کر اپنے آپ کو

بجاجاتا' اس نعرے کا اختتام "لے" پر ہوتا۔ "اولے" ہسپانویوں کا مرحبا کہنے کا خاص انداز ہے جس کے بارے میں شفیق الرحمٰن کو شبہ ہے کہ یہ واللہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ تماشائیوں سے بے پناہ داد ملنے پر بُل فائٹر قدرے نڈر ہو گیا اور آگے بڑھ بڑھ کر بُل کو "ہو ہو" کرنے لگا۔ بُل فائٹر بُل کے جتنے قریب ہو کر لڑے گا اتنا ہی یہ اس کے حق میں خطرناک ثابت ہو گا۔ سینگوں سے زخمی ہونے کا خطرہ بھی آدمی خود تخلیق کرتا ہے۔ اگر وہ بُل فائٹنگ کے قاعدوں کی خلاف ورزی کرے تو سینگ اُس کے جسم سے ایک دو انچ کے فاصلے سے گذر جائیں گے اور وُہ محفوظ رہے گا۔ کوئی بھی بُل فائٹر تبھی زخمی ہوتا ہے جب وُہ رفتار کا تعین نہ کر سکے اور گھومنے میں دیر کر دے اور یا پھر انتہائی ناتجربہ کار ہو۔

بُل فائٹر کو اپنے قریب دیکھ کر بُل کی ہمت بندھی اور اُس نے پھر دھاوا بول دیا۔ لیکن اس مرتبہ بھی بُل فائٹر نے کیپ اس انداز سے گھمائی کہ بُل کپڑے سے چھُو کر اپنے زور میں میدان کے درمیان تک بھاگتا چلا گیا۔ پورا بُل رنگ تالیوں سے گونج اُٹھا۔

ایکدم میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ بُل رنگ کی ہر شے سفید ہو گئی۔ بُل فائٹر سفیدی میں ڈوبا ہوا۔ بُل سفید۔ جیسے ایک اوور ایکسپوزڈ تصویر کا نیگیٹو ہو۔ اور پھر آہستہ آہستہ تمام چیزیں اپنی اصلی رنگت پر لوٹنے لگیں۔ ۔ ۔ ۔ کچھ بھی نہ تھا۔ ۔ ۔ ۔ میں نے آنکھیں ملیں تو ایک اور تلبیس ہوا۔ ۔ یا وحشت یہ کیا ہو رہا ہے۔ اُدھر بُل فائٹر اپنے کمال دکھا رہا تھا اور اِدھر میری آنکھیں اس تیز روشنی سے چندھیا رہی تھیں۔ میں نے جھنجھلا کر ایک مرتبہ پھر آنکھیں ملیں اور اپنے عین سامنے دیکھا اگلی نشستوں پر بیٹھے ہوئے تمام تماشائی بُل فائٹ دیکھنے میں محو تھے۔

اب کی بار بُل فائٹر نے بُل کو اپنی جانب متوجہ کیا اور جونہی بُل حملہ آور ہوا، اُس نے کیپ فضا میں لہرانے کی بجائے ایک دم سمیٹ لی۔ بُل جو کپڑے کے پیچھے پیچھے بھاگا چلا آ رہا تھا کیپ کے سمٹ جانے سے یکدم رُکا۔ اُس کی اگلی دو ٹانگیں لڑکھڑائیں اور وہ گرتے گرتے بچا۔ یہ ویرونیکا انداز کی قسم "ری بولیرا" تھی جس میں ایک خاص طریقے سے کپڑا سمیٹنے کی وجہ سے بُل اگلی ٹانگوں پر گر جاتا ہے۔ تماشائیوں نے پھر دل کھول کر داد دی۔ بُل فائٹر ایک مرتبہ پھر بُل کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا اور ۔ ۔ ۔ اُسی لمحے مجھ سے تین چار قطاریں آگے بیٹھی ہوئی ایک سُنہری بالوں والی

لڑکی نے بُل رِنگ سے منہ موڑا اور یکدم نشست سے اُٹھ کر اپنے کیمرے کا رُخ میری جانب کر کے بٹن دبا دیا.... ایک فلیش ہوا.... اور میری آنکھوں کے سامنے ہر شے سفید ہو گئی۔ میں نے سر جھٹک کر فلیش کے خیرہ کن اثرات کو زائل کیا۔ وہ لڑکی اپنی نشست پر بیٹھی بڑے اطمینان سے بُل فائٹ دیکھ رہی تھی.... میں تلملا کر رہ گیا۔ آخر کر بھی کیا سکتا تھا!

بُل فائٹ کے ڈرامے کا پہلا ایکٹ ختم ہو چکا تھا۔ بُل فائٹر تماشائیوں کے نعرہ ہائے تحسین کے جواب میں کمر تک جھکا کر ان کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ اُس سے چند قدم کے فاصلے پر بُل بڑی شانِ بے نیازی سے کھڑا پبلک کو گھور رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بُل رِنگ کی بجائے اپنی چراگاہ میں کھڑا ہو جہاں یہ ڈھیر سارے لوگ اُسے خوامخواہ ستانے آ گئے ہیں۔

ایک مرتبہ پھر صدر کی کیبن سے گھنٹی بجی اور بُل فائٹ کا دوسرا حصہ شروع ہوا۔ بُل فائٹر لکڑی کی گیلری کے پیچھے جا چکا تھا اور میدان میں سوائے بُل کے اور کوئی نہ تھا۔ اب میدان میں ایک "پکا دور" گھڑسوار داخل ہوا۔ آنکھوں، کانوں اور ٹانگوں کے سوا گھوڑے کا تمام جسم روئی کے گدیلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ گھڑسوار کے ہاتھ میں ایک "پک" یعنی نیزہ تھا جس کی انی دھوپ میں چمک رہی تھی۔ "پک آدور" یعنی نیزہ بردار۔ بُل فائٹ کے اس حصے پر سب سے زیادہ نکتہ چینی ہوتی ہے کیونکہ اس کے دوران میں بے چارے گھوڑوں کی بے پناہ شامت آتی ہے۔ پکا دور کا سست رو گھوڑا جسے شاید اپنے انجام کا علم تھا بے حد آہستہ چل رہا تھا اور بُل کے قریب جانے سے کترا رہا تھا۔ چوتھی قطار میں بیٹھی محترمہ نے بُل رِنگ سے منہ موڑا اور کیمرہ لے کر کھڑی ہو گئیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ بٹن دباتیں میں نے شور مچا دیا "یہ کیا ہو رہا ہے؟ میری تصاویر کس خوشی میں بنائی جا رہی ہیں؟ وہ کمبخت بھینسا تو دوسری جانب اپنے جوہر دکھا رہا ہے!"

سنہری بالوں والی محترمہ نے کیمرہ آنکھ سے ہٹایا اور نہایت بدتمیزی سے بولیں۔

"میں اس لئے تمہاری تصاویر کھینچ رہی ہوں کہ میرے خیال میں تم بھینسے سے زیادہ خوش شکل ہو۔"

میرے گرد بیٹھی ہوئی پبلک اس جواب پر بے حد محظوظ ہوئی اور "اولے، اولے" کے نعرے بلند ہونے لگے، بلکہ ایک دو نے مجھے "پیپے تورو" کہہ کر بھی بلایا۔ میں کھسیانا ہو کر اپنی نشست میں دبک گیا.... اُدھر فلیش ہوا اُدھر ہماری تصویر پھر اُتر گئی۔ میں دل ہی دل میں پیچ و تاب

کھا رہا تھا۔ میرا خیال ہے ایسے حالات میں ہر اس شریف آدمی کو پیچ و تاب کھانے کا حق ہے جس کی خوبصورتی کا پیمانہ ایک عدد کالے کلوٹے آدھ ٹن وزنی بھینسے کو ٹھہرایا جائے۔

پکادور کا گھوڑا شاید اناڑی قسم کا تھا۔ اس نے بل کے پاس جانے سے بالکل انکار کر دیا۔ اس پر پکادور نے پھر وہی "ہے تورو۔ ہے تورو" کی گردان کی۔ بل گردن اٹھا کر گھوڑے کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے سامنے ایک ایسا عجیب الخلقت جانور کھڑا تھا جو اتنی گرمی کے باوجود کمبل رنگ میں رضائی اوڑھ کر آ گیا تھا۔ بل نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سرپٹ دوڑتا ہوا آیا اور گھوڑے کے پیٹ میں ایک زوردار ٹکر رسید کی۔ اس کے نوکیلے سینگ شاید گدیلے کی روئی میں سے گزر کر گھوڑے کی پسلیوں میں داخل ہو چکے تھے۔ ٹکر سے گھوڑا لڑکھڑایا مگر اسی لمحے پکادور نے اپنے نیزے کی انی بل کی گردن میں بھونک دی۔ بل گھوڑے کی پسلیوں میں سینگ گھسیڑے جتنا زور لگاتا نیزے کی انی اس کی گردن میں اتنی ہی زیادہ کھبتی جاتی۔ یہاں تک کہ اس کی گردن سے خون بہنے لگا اور وہ تکلیف کی شدت سے بے بس ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ بل کی گردن میں زخم کرنے کا مقصد اس کی طاقت کو زائل کرنا ہوتا ہے تاکہ اس کی تیزی سست روی میں بدل جائے اور بعد میں بل فائٹر اس کے ساتھ اچھی طرح کھیل سکے۔ اس ایکٹ میں بل کی بہادری کا امتحان ہوتا ہے۔ اگر وہ ایک مرتبہ زخم کھا کر دوبارہ حملہ آور نہ ہو تو اسے بزدل سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ بل اپنے گہرے زخم سے رستے ہوئے خون کی پروا کئے بغیر تلملا تاک کر پھر گھوڑے پر حملہ آور ہو گیا۔ ادھر بل کے سینگ گھوڑے کے پیٹ میں گھسے ادھر پکاڈور نے اپنا خون آلود نیزہ اس کے زخم میں گھونپ دیا۔ بل جتنا آگے بڑھ کر گھوڑے کے پیٹ میں ٹکریں مارتا نیزے کی انی اتنی ہی گہرائی میں چبھتی چلی جا رہی تھی۔ میرے قریب بیٹھا موٹا ہسپانوی بل کی اس بہادری پر نہال ہو رہا تھا اور بار بار اپنے ساتھی کو لعن طعن کر رہا تھا جس نے بل فائٹ کے آغاز میں اس بل کو بزدل کہنے کی جسارت کی تھی۔ یہ بہادر بل اپنی گردن میں دھنسی ہوئی نیزے کی انی کی پروا کئے بغیر برابر گھوڑے کے پیٹ میں سینگ گھسیڑے اسے گرانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ گھوڑا یوں کھڑا تھا جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ اس وقت وہ سفید گدیوں میں لپٹا گھوڑے سے زیادہ ایک بے ہنگم

قسم کا پرندہ لگ رہا تھا۔ بل کی قوی گردن، نوکیلے سینگ اور چوڑے کاندھے اس کے پیٹ میں گھستے گئے یہاں تک کہ اس کی دو ٹانگیں ہوا میں لٹک گئیں یعنی معلق ہو گئے۔ گردن جھک گئی اور بالآخر وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔ گھوڑے کے زمین پر گرتے ہی پکا دور بھاگ کھڑا ہوا۔ گھوڑا مر چکا تھا۔ زخمی بل کی گردن سے خون رس رس کر اکھاڑے کی ریت پر گر رہا تھا۔ وہ سر بلند کئے اکھاڑے کے گرد بھاگنے لگا جیسے اپنی بہادری کی داد طلب کر رہا ہو۔ تمام لوگ اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور تالیاں بجا کر بل کی بہادری کا اعتراف کیا۔ اس دوران میں ایک اور پکا دور گھوڑے پر سوار میدان میں داخل ہوا۔ نووارد نے جب اپنے بھائی کی خون آلود لاش میدان میں پڑی دیکھی تو ہنہنایا اور واپس جانے کے لئے مڑا۔ لوگوں نے شور مچا دیا۔ شور سے بل گھوڑے کی جانب متوجہ ہو گیا.... ایک اور شکار... وہ اپنی پوری قوت سے حملہ آور ہوا اور پہلی ہی ٹکر سے گھوڑے کو گرا دیا۔ تماشائیوں نے آسمان سر پہ اٹھا لیا۔

"سان سباستیان کے بل رنگ میں اس سے بہادر بل کبھی نہیں دیکھا گیا" موئے سپانوی کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور وہ بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔

اب میدان میں تیسرا پکا دور داخل ہوا۔ بل حسب معمول نشانہ تاک کر پھر حملہ آور ہوا مگر اس مرتبہ قسمت نے یاوری نہ کی اور اس کے سینگ گھوڑے کے پیٹ میں داخل ہونے سے پہلے ہی پکا دور کا نیزہ اس کے کوہان میں اتر گیا۔ اس نے زور لگا کر آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر تازہ زخم میں اٹھنے کی تکلیف وہ موجودگی نے اسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ کثیر مقدار میں خون بہنے کی وجہ سے بل کی طاقت میں کمی ہو رہی تھی اور اب وہ خاصا سست رو ہو چکا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بل فائٹ میں گھوڑے کا مرنا قدرتی بات ہے، بل فائٹر کبھی کبھار مرتا ہے اور بل ہمیشہ مر جاتا ہے۔ گھوڑے کی موت کا سب سے زیادہ افسوس غیر ملکی تماشائیوں کو ہوتا ہے جن کی اکثریت اس "بے رحمی" کی تاب نہ لاتے ہوئے بل رنگ سے واک آؤٹ کر جاتی ہے۔ تجربہ کار سپانوی ایسے موقعوں کی تاک میں رہتے ہیں اور فوراً ان کی مہنگی نشستوں پر قبضہ جما لیتے ہیں۔ چوتھی قطار میں بیٹھی غیر ملکی لڑکیاں بھی پکا دور کے عمل کے دوران آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کر نا درنظارہ روتی رہیں۔

صدر کے اشارے پہ ایک مرتبہ پھر بل رنگ میں بگل کی آواز گونج گئی۔ بل فائٹ کا

تیسرا ایکٹ شروع ہونے کو تھا۔ موسیقاروں کے طائفے نے بُل فائٹ کی مخصوص موسیقی کی دُھن چھیڑ دی۔ بُل فائٹر دوبارہ میدان میں داخل ہوا مگر اس مرتبہ اُس کے ہاتھوں میں کیپ کی بجائے دو "باندریلو" تھیں۔ باندریلو رنگین کاغذ میں لپٹی گز بھر لمبی اُس چھڑی کو کہتے ہیں جس کے سرے پر چھ انچ لمبی ایک برچھی لگی ہوتی ہے۔

بُل فائٹر بُل سے چند گز کے فاصلے پر بازو لٹکا کر کھڑا ہو گیا اور اسے شُشکارا۔ بُل نے گردن اُٹھا کر دیکھا۔ اُس کے سامنے بظاہر ایک نہتا آدمی کھڑا تھا اور تیزی سے اس کی جانب لپکا۔ بُل فائٹر کے قریب آ کر اُس نے سر جُھکا لیا تاکہ اُسے سینگوں پر اچھال دے۔ عین اُسی وقت بُل فائٹر نے ہاتھ فضا میں بلند کئے اور دونوں باندریلو بیک وقت گردن کے زخم کے قریب گاڑ دیں۔ تماشائیوں نے ایک مرتبہ پھر تالیاں بجائیں کیونکہ باندریلو مناسب فاصلے پر لگائی گئی تھیں اور گردن پر سیدھی کھڑی ہونے کی بجائے جیسا کہ ہونا چاہیے تھا، گردن سے نیچے لٹک رہی تھیں۔ یہ عمل تین مرتبہ دہرایا گیا اور کُل چھ باندریلو بُل کے جسم میں پیوست ہوئیں۔ اس حرکت کی خصوصیت یہ ہے کہ باندریلو ہاتھ اُٹھا کر اس طرح لگائی جائیں کہ بُل کے سینگ بُل فائٹر کے جسم سے چھو کر نکل جائیں باندریلو کو بُل کی گردن کے زخم میں گاڑنا بے حد معیوب گردانا جاتا ہے۔

اکھاڑے میں داخل ہوتے وقت بُل کو اعتماد تھا کہ وہ ہر شے کو فنا کر کے رکھ دے گا۔ وہ بُل فائٹر کے معاونین، لکڑی کی گیلری اور گھوڑوں پر وحشیانہ انداز میں حملے کر رہا تھا۔ مگر اب نیزے کے ایک گہرے زخم کے علاوہ اُس کے جسم میں پیوست چھ برچھیوں نے اُسے ایک تکلیف دہ احساس سے روشناس کروا دیا تھا۔ وہ ناقابلِ تسخیر نہیں ہے۔ اُس کا گھمنڈ خاک میں مل چکا تھا۔ اب وہ قدرے خوفزدہ تھا۔ انسان سے ہراساں .... انسان جس نے کھیل ہی کھیل میں اُسے بُری طرح گھائل کر دیا تھا۔ اب وہ اپنا بچاؤ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس فضول کھیل سے تنگ آ چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کھیلنے کی بجائے کسی نہ کسی طرح اپنے دشمن کو ہلاک کر ڈالے۔

بُل فائٹنگ کا نکتہ عروج بُل کی موت ہے۔ شروع سے لے کر اب تک تمام داؤ پیچ اسی ڈرامائی انجام کی خوبصورتی کو مدنظر رکھتے ہوئے کھیلے گئے تھے۔ اس اختتامیے کو "ترسیو" یعنی موت کا کھیل کہا جاتا ہے۔ ہمیشہ کی طرح بُل اکھاڑے میں اکیلا کھڑا ہے۔ بگل بجتا ہے۔

بُل فائیٹر میدان میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں اب "مولیتا" ہے۔ مولیتا سُرخ سُرج کے اس کپڑے کو کہتے ہیں جو ایک چھڑی کے گرد لپٹا ہوتا ہے۔ یہ مولیتا بُل کی بقیہ طاقت کو ختم کرنے اور اسے قتل کرتے وقت اُس کا سر نیچا رکھنے کے کام آتا ہے۔ بُل فائیٹر اکھاڑے کے درمیان چلتا ہوا صدر کی کیبن کے نیچے پہنچا اور صدر سے بُل کو قتل کرنے کی اجازت چاہی۔ صدر نے رومال ہلا کر اجازت دے دی۔

بُل فائیٹر پیچھے مُڑا اور اپنا خالی ہاتھ فضا میں بُلند کرکے اعلان کیا کہ وُہ اس بُل کو اپنی محبوبہ یا کسی عزیز دوست کی بجائے بُل رِنگ میں موجود ہزاروں تماشائیوں کے نام کرتا ہے۔ بُل فائیٹر کی اِس جمہوریت پسندی کو سیٹیوں کی بوچھاڑ اور "براوو" کے نعروں سے نوازا گیا۔ دھوپ کی شدت میں اب کمی واقع ہو چکی تھی اور بُل رِنگ کا نصف سے زیادہ حصّہ چھاؤں میں جا چکا تھا۔ موت کے سائے روشنی کے تعاقب میں تھے۔ بُل فائیٹر نے جُھک کر تماشائیوں کا شکریہ ادا کیا اور پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اپنی سنہری ٹوپی اُتار کر زمین پر دے ماری اور دائیں ہاتھ میں مولیتا اور تلوار پکڑے بُل کی جانب بڑھا۔ "ہوہو" اُس نے پکارا۔ بُل نے بمشکل سر اُٹھایا اور پھر تھکاوٹ اور زخموں سے چُور ہونے کے باوجود حملہ کرنے کی غرض سے آگے بڑھا۔ بُل فائیٹر نہایت نفاست سے پنجوں پر گھوما اور بُل مولیتا سے چھُوتا ہوا آگے نکل گیا۔

"استائے تورو سابے لاطین"۔ ایک نوجوان نے بُل کی فراست اور بہادری کا اعتراف کرتے ہوئے نعرہ لگایا۔ یعنی "بُل لاطینی زبان خوب سمجھتا ہے"۔

بُل فائیٹر نے متعدد بار بُل کو حملہ آور ہونے کی دعوت دی اور پھر بڑی خوبصورتی سے اپنا بچاؤ کیا۔ اِن حرکات کا مقصد بُل پر اِس حد تک غلبہ پا لینا ہے کہ وُہ تھک کر ایک ایسی جگہ کھڑا ہو جائے جہاں اُسے آسانی سے قتل کیا جا سکے۔ پوری بُل فائٹ میں یہ حرکات سب سے زیادہ خطرناک اور خوبصورت ہوتی ہیں اور یُوں تیزی سے گذر جاتی ہیں جیسے حسن کا ایک خیرہ کُن ستارہ چمک کر پل بھر میں آنکھوں سے اوجھل ہو جائے۔

تھوڑی دیر کے بعد بُل ہانپنے لگا۔ اِس وقت وُہ بے حد بھاری بھرکم محسوس کر رہا تھا۔ س کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اُس کا سر جُھک رہا تھا۔ زخموں کی شدت سے اس کا گردبراد رہتا

خارج ہو کر اکھاڑے کی ریت پر پھیل رہا تھا۔ یہاں یہ فرض کر لینا کہ بُل اب ختم ہو چکا ہے انتہائی بیوقوفی ہوگی۔ وُہ اب بے حد خطرناک ہے۔ وُہ صرف اُسی صورت میں حملہ آور ہوگا جب اُسے اپنی کامیابی کا سو فیصد یقین ہو جائے گا۔ بُل فائٹر مولیٹا اپنے دائیں ہاتھ میں تھامے بُل کے بالکل قریب آگیا۔ بُل پیچھے ہٹنے لگا یہاں تک کہ اس سُرخ دروازے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا، جس میں سے وُہ صرف پندرہ منٹ قبل اپنے غرور سے پھنکارتا ہُوا نکلا تھا۔ ایسی حالت میں اکثر بُل اکھاڑے کے کسی ایسے کونے میں جا کھڑے ہوتے ہیں جو اُن کے نزدیک محفوظ ترین ہوتا ہے اسے "بُل کا گھر" کہتے ہیں۔ اگر بُل کو اس محفوظ جگہ کے اندر جا کر چھیڑا جائے تو بُل فائٹر کی ہلاکت یقینی ہوتی ہے۔ چنانچہ بُل فائٹر نے مولیٹا بُل کے آگے ریت پر بچھا دیا اور اُسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔ بُل نے مولیٹا سونگھا اور آہستہ آہستہ اس کے پیچھے چلتا اپنے "گھر" سے باہر نکل آیا۔

دُھوپ ماند پڑ رہی تھی اور سان سباستیان کے سمندر سے آنے والی نم آلود ہوا میں خنکی نمایاں تھی۔ تھوڑی دیر پہلے جو خواتین گرمی کی وجہ سے پنکھے جھل رہی تھیں۔ اب انہوں نے گرم چادریں اوڑھ لیں۔ سارا ہجوم اس حیرت ناک ڈرامے کا ممکنہ عروج دیکھنے کے لئے دَم سادھے بیٹھا تھا۔

بُل اب بے حد تھک چکا تھا۔ اُس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں مگر اُس کی نم آلود کالی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی وحشت تھی۔ اُس نے اپنی رہی سہی طاقت مجتمع کر کے اپنی آنکھوں کی ڈ میں بھر دی تھی۔ ایک ایسی وحشت جو بڑے بڑے بہادر بُل فائٹروں کا پتہ پانی کر دیتی ہے۔ بدقسمت بُل فائٹر گالو جس کا ذکر میں نے پہلے بھی کیا ہے اس معاملے میں بے حد ڈرپوک تھا۔ ا کے بُل رِنگ میں جب وُہ ریٹائر ہونے سے قبل اپنی زندگی کا آخری بُل قتل کرنے والا تھا تو ا نے وُہ بُل اپنے بچپن کے دوست کے نام کرنے کا اعلان کیا "اے میرے عزیز دوست بُل تمہارے نام پر قتل ہوگا۔ تم جو میرے دل میں رہتے ہو" اُس نے جُھک کر اپنے دو سے کہا اور پھر اُس کی نگاہ وہاں بیٹھے ہوئے ایک عظیم موسیقار پر پڑی۔ گالو نے فی الفو ارادہ بدل دیا "اے آسمانِ موسیقی پر چمکنے والے تابناک ستارے یہ بُل میں تمہارے نام کر اور ... ابھی وُہ فقرہ پُورا نہ کر پایا تھا کہ اُس نے اپنے اُستاد بُل فائٹر کو ہجوم میں بیٹھے

"بھلا میں اپنے اُستاد الفا بینو کی موجودگی میں یہ بُل کسی اور کے نام کرنے کی جسارت کیونکر کر سکتا ہوں ۔ بُل تمہارے نام پر قتل ہو گا میرے اُستاد !" اُس نے اپنا ہاتھ شاہانہ طریقے سے فضا میں لہرا کر اعلان کیا اور بُل کو قتل کرنے کی نیت سے پیچھے مڑا ۔ بُل سر جھکائے عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا ۔ گالو نے اپنا گنجا سر کھجایا اور اکھاڑے میں اپنے چھوٹے بھائی ہوسے کو کہنے لگا "یار ہوسے تمہاری بڑی مہربانی ہو گی اگر تم اِس بُل کو میری طرف سے مار دو ۔ مجھے اس کا دیکھنا پسند نہیں " یہ کہہ کر اُس نے اپنی تلوار اور مولیتا زمین پر پھینکا اور لکڑی کی گیلری پھلانگ کر بُل رِنگ سے بھاگ گیا ۔

مگر آج سان سباستیان کے اکھاڑے میں جو بُل فائٹر (بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا نام ہوسے فوئنتس ہے اور ہسپانیہ کے بہترین بُل فائٹروں میں شمار ہوتا ہے) سینہ تانے کھڑا تھا ، وُہ بُل کی آنکھوں میں بھری وحشت سے ذرہ برابر بھی خوفزدہ نہ ہوا ۔ مولیتا اور ننگی تلوار بائیں ہاتھ میں تھامے وُہ بُل سے تقریباً پانچ گز کے فاصلے پر کھڑا ہو گیا ۔ بُل کی نظریں مولیتے پر جمی تھیں اور وُہ بُت بنا کھڑا تھا ۔ جب بُل فائٹر کو یقین ہو گیا کہ بُل اتنا تھک چکا ہے کہ اب اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا تو اُس نے بُل کی طرف سے منہ موڑا ۔ ایک جھٹکے سے مولیتا میں سے تلوار کھینچی اور پھر دوبارہ مڑ کر بُل کی جانب بڑھا . . . بے حد نپے تُلے قدموں سے ۔ آہستہ آہستہ ۔ اُس کے سر تلوار کی نوک اور بائیں کاندھے کا رُخ بُل کی طرف تھا ۔ بُل ایک خوفزدہ بچے کی طرح سہما کھڑا تھا ۔ بُل فائٹر نے اب اُس چھوٹی سی جگہ کا تعین کیا جو بُل کے کندھوں کے درمیان اور سینگوں کے اُوپر ہوتی ہے ۔ عین اِس مقام پر اگر تلوار گھونپی جائے تو وُہ ریڑھ کی ہڈی میں سے گزر کر بُل کا کام تمام کر دیتی ہے ۔ گردن کا یہ حصہ بُل فائٹر کو صرف اُس وقت نظر آتا ہے جب بُل حملہ آور ہو رہا ہو ۔ گردن کے کسی اور حصے میں تلوار بھونکنا بزدلی اور ناتجربہ کاری پہ محمول کیا جاتا ہے ۔ اچھا بُل فائٹر مولیتا کے درست استعمال سے بُل کو مجبور کر دیتا ہے کہ وُہ گردن نیچی رکھے اور پھر خطرہ مول لے کر سینگوں کے اُوپر جھک کر وار کرتا ہے ۔

آخری وار کرنے سے پہلے بُل فائٹر نے اپنی تلوار کو بوسہ دیا اور اُس کا دستہ آنکھوں کے پاس لا کر نوک بُل کی جانب کر دی . . . . "ہے تورو" اُس نے بُل کو پکارا ۔ بُل نے بمشکل

اپنا سر اٹھایا۔ دھوپ میں چمکتی ہوئی تلوار کا رُخ اس کی جانب تھا۔ انصاف کی گھڑی آن پہنچی تھی۔ انصاف جو ہمیشہ اصولوں کی بجائے طاقت کا ساتھ دیتا ہے۔۔۔۔ اِس وقت بُل فائٹر کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی۔ بُل کا سر جُھکا ہوا تھا۔ لیکن کبھی کبھار مظلوم اپنے گہرے زخموں کے باوجود ظالم سے ٹکرے لیتے ہیں۔ بُل نے بھی اپنا جُھکا ہوا سر اُٹھایا اور بچی کھچی طاقت سے کام لے کر بُل فائٹر پر حملہ آور ہو گیا۔ اور پھر کچھ یُوں ہوا کہ انسان اور حیوان ہم آغوش ہو گئے۔ حیوان کا سر نیچا۔ انسان اُس کے سینگوں سے بچاؤ کرتے ہوئے اُس کے اوپر جُھکا۔ تلوار گردن میں اُترتا ہوا بُل کی گردن، تلوار کا دستہ اور انسان کا ہاتھ ایک نقطے میں بدل گئے۔ قتل کی خوبصورتی کا وہ لمحہ جسے بُل فائٹ کا فنی اور جذباتی نقطۂ عروج کہا جاتا ہے۔ بُل فائٹر نے تلوار کے خون آلود دستے سے انگلیاں علیحدہ کیں اور پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ بُل لڑکھڑا رہا تھا۔ اس کے مُنہ سے خون کا ایک فوارہ چھوٹا۔ اُس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ کون جانے اُس آخری لمحے میں بُل نے نیم مردہ آنکھوں سے کتنی نفرت سے ان ہزاروں تماشائیوں کو دیکھا ہو گا جو اُس کی موت کا تماشہ دیکھنے آئے تھے۔ بُل فائٹر کولہوں پہ ہاتھ رکھے نہایت سنجیدگی سے اختتام کا منتظر تھا۔ پورے بُل رِنگ پہ خاموشی طاری تھی۔ بُل کا سر نیچا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اُس کی گردن اور منہ سے بہتا ہوا خون گرم ریت میں جذب ہو رہا تھا اور پھر اُس کی ٹانگیں بُری طرح لرزنے لگیں اور وہ لڑکھڑا کر ریت پہ گر پڑا۔ موت کے سائے روشنیوں پر غالب آ گئے۔

بُل کے گرتے ہی پُورے بُل رنگ میں شور بپا ہو گیا۔ تلوار کے پہلے وار میں بُل کو ہلاک کر ڈالنا ایک عظیم کارنامہ تھا ورنہ اکثر تلوار کسی ہڈی سے چیخ کر باہر نکل آتی ہے اور بُل فائٹر کو دوبارہ وار کرنا پڑتا ہے۔ کئی مرتبہ بُل فائٹر اگر اناڑی ہونے کی وجہ سے متعدد بار کوشش کے باوجود بھی بُل کو ہلاک نہ کر سکے تو پھر اُس کی شاہ رگ خنجر سے کاٹ دی جاتی ہے۔ لوگ اپنی نشستوں سے اُٹھ کر تالیاں بجا رہے تھے اور پھر یکدم بُل رِنگ میں ہزاروں سُرخ رنگ کے ریشمی رومال لہرانے لگے۔ عوام نے فیصلہ دے دیا تھا کہ بُل فائٹر کو اس کی بہادری کے صلے میں بُل کے کان اور دُم کاٹ کر دے دیئے جائیں۔ صدر کی منظوری پہ بُل رِنگ کے ملازمین نے ایک خنجر سے بُل کے کان اور دُم کاٹے اور دونوں "تحفے" بُل فائٹر کے حوالے کر دیئے۔ یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ اس

کے فوراً بعد بے شمار لوگ اکھاڑے میں کود پڑے اور بُل فائٹر کو کندھوں پر اٹھا کر ایک جلوس کی صورت میں بُل رِنگ کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ تماشائی ابھی تک کھڑے ہو کر تالیاں بجا رہے تھے۔ جونہی بُل فائٹر اُن کے قریب سے گذرتا وہ جو بھی چیز ہاتھ میں آتا اٹھا کر اُس کی جانب اچھال دیتے۔ رومال، ہیٹ، پنکھے، کوٹ، ٹائیاں اور لاتعداد دوسری اشیا اکھاڑے میں بکھری پڑی تھیں۔

بُل فائٹر کے معاونین ان چیزوں کو اٹھا کر بُل فائٹر کو دیتے اور وہ انہیں چُوم کر واپس اچھال دیتا۔ میرے قریب بیٹھے دو ہسپانویوں میں سے ایک نے شراب کا مشکیزہ بُل رِنگ میں پھینک دیا۔ بُل فائٹر نے مشکیزہ فضا میں ہی دبوچ لیا اور اُس میں سے چند گھونٹ بھر کر واپس پھینک دیا۔ مشکیزہ سب سے اگلی صف میں گرا۔ ایک تماشائی نے اٹھا کر چند گھونٹ لیئے اور پچھلی صف میں کسی کو تھما دیا۔ اُن صاحب نے بھی "ٹِیک" لگا کر شراب پی اور اُس سے پچھلی صف میں بیٹھے ایک لڑکے کو دے دیا۔ لڑکے نے بھی . . . . مشکیزہ موٹے ہسپانوی تک پہنچا تو تقریباً خالی ہو چکا تھا مگر پھر بھی وہ اپنی خوش قسمتی پر پھولا نہ سما رہا تھا۔

"میں اس مشکیزے اور بقیہ شراب کو یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھوں گا تاکہ میرے بیٹے اور ہونے والے پوتے اس پر فخر کر سکیں کہ یہی ہے وہ مشکیزہ جس میں سے عظیم بُل فائٹر میرسے نوئنتس نے شراب پی تھی۔"

"اور اُس کے بعد دو درجن تماشائیوں نے بھی . . ." میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں کیوں نہیں، میرا بس چلے تو میں بُل رِنگ میں بیٹھے تمام تماشائیوں کو شراب پلاؤں . . . لو تم بھی پیو!" اس نے مشکیزہ میری گود میں رکھ دیا۔

"اگر بقیہ شراب میں پی گیا تو تمہارے پاس اپنے بیٹوں اور ہونے والے پوتوں کو دکھانے کے لئے کچھ نہ بچے گا" میں نے چھلکتا ہوا مشکیزہ اُسے واپس کر دیا۔

جلوس کے خاتمے پر میدان میں فربہ خچروں کی ایک جوڑی داخل ہوئی جسے بُل رِنگ کے ازمین ہانک رہے تھے۔ انہوں نے خچروں کے گرد بندھی رسیوں سے بُل کی ٹانگیں مضبوطی سے جکڑ دیں۔ اس کے بعد انہوں نے خچروں کو چابک کے ساتھ اتنی تیزی سے پیٹا کہ وہ ذبح شدہ بُل کو گھسیٹتے ہوئے میدان سے باہر نکل گئے۔ ریت پر مرے ہوئے بُل کے گھسٹنے سے ایک راستہ

سابن گیا تھا۔ بُل فائٹ کے ڈرامے کے مرکزی کردار کی آخری رہگذر۔

ہر بُل فائٹ میں چھ بُل اور تین بُل فائٹر حصہ لیتے ہیں۔ ایک بُل کو مارنے کے لئے صرف بیس منٹ دیئے جاتے ہیں۔ سان سباستیان کے اکھاڑے میں پہلا بُل ہلاک ہو چکا تھا۔ اب دوسرے بُل کی باری تھی۔ بگل کی آواز آئی۔ بوڑھے نے دائیں ہاتھ سے اپنا بوسیدہ ہیٹ اُتار کر ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ پھر بائیں ہاتھ سے اصطبل کا سرخ دروازہ زور لگا کر دھکیلا اور بڑی پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا۔ چشم زدن میں ایک بھاری بھرکم سیاہ بُل بجلی کی تیزی کے ساتھ.... اس کے بوجھ تلے زمین لرز رہی تھی۔ طاقتور، مغرور اور ناقابلِ تسخیر.... "ہے تورو، ہے تورو" تماشائی اپنے رومال، ہیٹ اور پنکھے ہلا ہلا کر اُسے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

خچروں کی جوڑی جب چھٹے اور آخری بُل کی لاش اکھاڑے میں سے اصطبل کی جانب گھسیٹ رہی تھی تو بُل رنگ پر سورج غروب ہو چکا تھا۔ کل صبح ان کا گوشت سان سباستیان کے قصابوں کی دکانوں پر مہنگے داموں فروخت ہوگا۔ میڈرڈ کے بُل رنگ میں مرنے والے بُل کا گوشت تو جنرل فرانکو بھی بے حد رغبت سے کھاتا ہے۔

آخری بُل کی لاش میدان سے باہر جاتے ہی تماشائی تالیاں پیٹتے اور سیٹیاں بجاتے اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بُل رنگ خالی ہونے لگا۔ میں جانے کے لئے اُٹھا تو ایک مرتبہ پھر میری آنکھوں میں فلیش کی روشنی چُبھ گئی۔ سنہری بالوں والی لڑکی نے کیمرہ اپنی آنکھ سے ہٹایا اور مُسکرا دی۔ وہ بے حد خوبصورت تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس طرح تصویریں اُتارنے سے اُس کا کیا مقصد ہے! وہ بھی ایک ایسے کھیل کا آغاز کرنا چاہتی تھی جس میں وہ بُل فائٹر ہو اور میں بُل.... بُل فائٹر جو اکثر بچ جاتا ہے اور بُل.... جو ہمیشہ ہلاک ہو جاتا ہے۔

گرم خوشبو کی شام

گرما کی اُس سُہانی شام کو جب سان سباسنتیان کے حسین سمندر پر شفق سُرخ ہو رہی تھی۔ بُل رِنگ میں سے ایک جلوس نکلا۔ خون، ریت اور پسینے میں نہائے ہوئے بُل فائٹروں کو تماشائیوں نے اپنے کندھوں پر اُٹھا رکھا تھا۔ شفق کی سرخی میں ان کے چہرے ان بہادروں کی مانند دکھائی دے رہے تھے جنہوں نے کسی قدیم رُومی اکھاڑے میں جنگلی شیروں کو پچھاڑا ہو۔ موسیقاروں کا ایک گروہ اُن کے گرد گھیرا ڈالے ہسپانوی موسیقی "فلیمنکو" کی تانیں اُڑا رہا تھا۔ سفید بالکونیوں پر جُھکی بڑی بڑی آنکھوں والی ہسپانوی دوشیزائیں اُن پر پھول نچھاور کر رہی تھیں۔ میں بھی اس جلوس کے ساتھ ہو لیا۔ اکثر لوگوں کے کندھوں پر شراب کے مشکیزے تھے جنہیں وہ منہ کے پاس لا کر پچکاتے تو سُرخ شراب کی ایک پتلی سی دھار ان کے حلق میں اُتر جاتی.... وہ اس معاملے میں بے حد فراخ دل واقع ہوئے تھے اور ہر ایک کو اپنا مشکیزہ پیش کر رہے تھے... شمالی یورپ میں جہاں کہیں لوگوں کا جمگھٹا ہوتا میں ان سب میں اپنے گندمی رنگ اور سیاہ بالوں کی وجہ سے علیحدہ نظر آتا مگر یہاں اس ہسپانوی ہجوم میں شامل اکثر افراد پاکستانی لگ رہے تھے۔ کبھی کبھار کوئی ہسپانوی اپنی زبان میں مجھ سے بل فائٹ کے بارے میں کچھ کہتا تو میں صرف مُسکرا دینے پر ہی اکتفا کرتا۔ جلوس شہر کے درمیان پلازا میئر میں پہنچا۔ چوک کا ایک چکر لگایا اور پھر منتشر ہو کر آس پاس کے قہوہ خانوں اور شراب خانوں میں سما گیا۔

میں تھکے ہوئے قدموں سے سان سباسنتیان کے ساحل کی جانب چل دیا۔ بُل فائٹ نے میرے اندر ایک عجیب سی اداسی بھر دی تھی۔ میں فیصلہ نہ کر پایا کہ اس بارے میں ہسپانوی نکتۂ نظر

درست ہے جو کہتے ہیں کہ اتنی ڈھیر ساری خوبصورتی کے لئے بُل کا قتل جائز ہے یا اُن غیر ملکیوں کا اعتراض بجا ہے جن کے نزدیک یہ کھیل وحشیانہ ہے۔ ساحلی سڑک پر خوب رونق تھی۔ بُل فائٹ دیکھنے کے بعد اکثر لوگ سمندر کی تازہ ہوا اور خوشگوار شام کی خنکی کا لطف اٹھانے اِدھر آنکلے تھے۔ ساحلی سڑک بُل رِنگ سے شروع ہو کر پہاڑی پر واقع قلعے کے گرد چکّر کاٹ کر شہر کے دوسرے سرے پر جا کر ختم ہو جاتی تھی۔ پہاڑی کی اوٹ میں لکڑی کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے کیبن تھے جن کو رنگ برنگے نقشوں سے سجایا گیا تھا۔ ان کیبنوں کے آگے سے ساحلی سڑک گذرتی تھی۔ سڑک کے پہلو میں خاموش سمندر لیٹا ہوا تھا۔ یہ مچھیروں کی بستی تھی۔ سارا دن ان کیبنوں میں سمندر سے پکڑی ہوئی مچھلی فروخت ہوتی تھی اور رات کو ان میں ٹوٹی پھوٹی کرسیاں رکھ کر انہیں ہوٹلوں میں بدل دیا جاتا تھا۔ یہاں بھی بے شمار لوگ بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ میں پاس سے گذرا تو لوگوں کی میزوں پر رکھی ہوئی خوراک میں سے اٹھتی ہوئی اشتہا انگیز خوشبو نے میرے نتھنوں میں گھس کر اعلان کر دیا کہ میاں صاحب زادے اُن انگریز مائیوں کی پلائی ہوئی چائے اور بسکٹ تو کب کے ہضم ہو چکے۔ صرف سمندر کے کنارے چہلک بلیہ کھیلنے اور بُل فائٹ دیکھنے سے کام نہیں چلے گا، کچھ پیٹ پوجا بھی ہو جائے۔ میں اندر چلا گیا اور بیٹھنے کے لئے کوئی کرسی تلاش کرنے لگا۔ پوری کیبن کھچا کھچ بھری تھی۔ ایک لمبی میز پر کھانے اور خاص طور پر پینے کی چیزوں کے انبار لگے تھے۔ تمام کرسیاں پُر تھیں۔ چند حضرات میز پر دھرنا مارے شکنجوں میں سے شراب پی رہے تھے۔ ہسپانوی موسیقاروں کا جو طائفہ جلوس کے ہمراہ تھا اب یہاں گھوم پھر کر موسیقی بجا رہا تھا اور پیسے اکٹھے کر رہا تھا۔ ایک خوش باش موٹی تازی ویٹرس میز کے گرد یوں پھرتی سے گھوم رہی تھی جیسے چابی کی گڑیا۔ مجھے وہاں کھڑا دیکھ کر وہ میرے پاس چلی آئی۔

"کومیدا ؟" اس نے کولھوں پر ہاتھ رکھ کر ہسپانوی میں پوچھا۔

"ہاں ہاں کومیدا۔" میں نے جواب دیا۔

اس نے جھٹ سے میرا ہاتھ تھام لیا اور مجھے کھینچتی ہوئی میز کے سرے پر ایک بوڑھے کے پاس لے گئی جو سر جھکائے اُونگھ رہا تھا۔

"ہے آنتونیو۔" اس نے بوڑھے کا کندھا پکڑ کر زور سے جھنجھوڑا۔

"کمے استنا سینیور نیا" حضرت انتونیو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

"سالیدا" ویٹرس نے انگوٹھے سے باہر کی طرف اشارہ کر دیا۔

بوڑھے نے میز پر رکھی سُرخ شراب کی بوتل بغل میں دابی اور آنکھیں ملتا ہوا کیبن سے باہر چلا گیا۔ یہ بوڑھا آج دوپہر ہزاروں نگاہوں کا مرکز تھا۔ اصطبل کا دروازہ کھول کر بُل کو میدان میں چھوڑنے والا بوڑھا۔

"کے بابن؟" کرسی پر بیٹھتے ہی ویٹرس نے جلدی سے پُوچھا۔

میں نے ساتھ والے صاحب کی پلیٹ کن انکھیوں سے دیکھی۔ تلی ہوئی ننھی مُنی مچھلیاں۔

"مچھی" میں نے مزا لیتے ہوئے کہا۔

"ماچی؟" ویٹرس نے ٹھوڑی پر انگلی جما کر حیرت سے پوچھا اور پھر فوراً ہی کھلکھلا کر ہنس دی "آ... پسکادو!"

تھوڑی دیر میں وہ پسکادو یعنی مچھلی کی ایک پلیٹ لے آئی۔ ایک پیاز، ڈبل روٹی اور کسی مشروب کا ایک مگ بھی ساتھ تھا۔ درجن بھر سارڈین مچھلیاں اپنی اصلی ہیئت میں تھیں یعنی اگر وہ تلی ہوئی نہ ہوتیں اور انہیں پانی میں ڈال دیا جاتا تو فوراً تیرنے لگتیں۔ میں نے ایک کو انگلی سے چھوا۔ بے حد گرم تھی۔ سر اور دُم کو علیحدہ کر کے میں نے اسے ڈبل روٹی کے بیچ میں رکھا اور پیاز کے ساتھ کھانے لگا۔ بے حد خستہ اور مزیدار تھی۔ استنبول میں بکنے والی مچھلی کی طرح ..... میز کے گرد بیٹھے ہوئے لوگ مچھلی کھانے کے ساتھ ہاتھ ہلا ہلا کر آج کی بُل فائٹ کے بارے میں گرما گرم بحث کر رہے تھے۔

"چوتھے بُل کی دائیں آنکھ کمزور تھی۔ بُزدل بھی تھا" میں نے پیاز چباتے ہوئے یُونہی ہانک دی تمام لوگ یکدم خاموش ہو گئے۔

شاید میں نے غلط کہہ دیا تھا۔ میں نے بمشکل پیاز نگلا اور شرمندہ ہو کر کہا۔

"میں نے غور نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے بائیں آنکھ ہو۔ بُل شاید بہادر...."

"نہیں نہیں" ایک تنومند ہسپانوی نے مُنہ کھول کر ایک سالم مچھلی اس میں گرائی اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "تم ٹھیک کہتے ہو، دائیں آنکھ کمزور تھی اور بُزدل تھا۔ ہم بھی تو اسی بات پر بحث کر رہے تھے۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"آہا" میز کے آخری سرے پر بیٹھے ایک صاحب نے میری جانب اشارہ کر کے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کر دیئے "انگلسی نادو"۔

انگلسی نادو اس شخص کو کہا جاتا ہے جو بُل فائٹ کا شوقین ہو اور اسے خوب سمجھتا ہو۔ میں نے انگلسی نادو کا خطاب ملنے پر ایک سالم مچھلی نگل لی۔ دُم، آنکھوں اور سر سمیت۔ ذائقہ قدرے مختلف تھا۔

جب کبھی ویٹرس آتی ایک دل پھینک بوڑھا سینے پر ہاتھ رکھ کر کوئی رومانوی مکالمے ادا کرنے لگتا۔ تمام لوگ بے حد محظوظ ہوتے اور ویٹرس بھی آنکھیں مٹکا کر ہنستی ہوئی چلی جاتی۔ ہمارے سامنے ساحلی سڑک پر بے شمار لوگ بے مقصد گھوم رہے تھے۔ چند ایک میری طرح تلی ہوئی مچھلی کی خوشبو کے آگے ہتھیار ڈال دیتے اور جیب میں سکّے ٹٹولتے کیبن کے اندر آ جاتے۔ سڑک کے ساتھ ہی نیلا سمندر شروع ہو جاتا تھا۔ سمندر کے درمیان سانتا کلارا کا خوبصورت جزیرہ کھڑا تھا جس کی مدھم روشنیاں گھُپ اندھیرے میں جگنوؤں کی مانند ٹمٹما رہی تھیں۔ بائیں ہاتھ پر سان سباستیان کی کونچا بیچ کے کنارے مہنگے ہوٹلوں کی عمارتیں بجلی کے بڑے قمقموں سے روشن تھیں۔ ساحل کے ساتھ مچھیروں کی بے شمار کشتیاں پانی میں جھول رہی تھیں۔ انہی کشتیوں میں پکڑی جانے والی مچھلی اس وقت تلی ہوئی حالت میں میری پلیٹ میں موجود تھی۔ لہروں کی نرم چھپاک چھپاک کیبن میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے شور کے باوجود مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ یکدم میرے حلق میں کانٹا چبھ گیا۔ میں نے بے دھیانی میں شاید مچھلی کو اچھی طرح ٹٹولا نہ تھا۔ مگ اٹھا کر میں نے جلدی سے ایک دو گھونٹ نگل لئے۔ عجیب قسم کا مشروب تھا۔ میں نے مگ اٹھا کر سونگھا۔ سفید رنگ کا شربت تھا شاید۔ "شراب نہیں ہو سکتی" میں نے سوچا "شراب تو کڑوی ہوتی ہے"۔

موسیقار اب عین میرے سر پر کھڑے کوئی لوک گیت الاپ رہے تھے۔ گیت میں اُداسی اور محرومیت کی پرچھائیاں تھیں۔ میں نے جیب سے پانچ پسینے کا ایک سکّہ نکال کر گٹار بجانے والے کو تھما دیا۔

"دوگراسیا سینور!" اس نے جھک کر کہا اور وہ آگے بڑھ گئے۔

سمندر سے آتی ہوئی نم اور خوشگوار ہوا۔ کیبن میں بیٹھے خوش باش لوگوں کی ہنسی اور گفتگو کا ملا جلا شور، ہسپانوی موسیقی اور گرم مچھلی۔ بات ہوئی نا۔ میں نے سوچا۔ اور پھر مجھے لاہور کی کڑکتی گرمیوں کی وہ دوپہریں یاد آگئیں جب میں سارا سارا دن اپنی دکان پر بے کار بیٹھا سامنے سے گذرنے والی گرد آلود سڑک کو بے دھیانی میں تکتا رہتا۔ بس یونہی باہر دیکھتا رہتا۔ بے کاری اور بوریت۔ کبھی کبھار کوئی ریڑھا یا تانگہ گذر جاتا اور چمکتی دھوپ میں گھوڑے کی گردن میں بندھی گھنٹیوں کی آواز دیر تک معلق رہتی۔ سڑک کے پار پان سگریٹ کی دکان کا گنجا مالک پکی پان کی گلوری منہ میں ٹھونسے اونگھ رہا ہوتا۔ ساتھ والا سبزی فروش تاج ایک گندے ٹین میں گدلا پانی بھر کر اپنی باسی سبزیوں پر چھڑکتا اور پھر ٹاٹ بچھا کر وہیں سو جاتا۔ مریل اور خارش زدہ آوارہ کتے میری دکان کے آگے فٹ پاتھ پر پھینکے دوپہر کے کھانے کی ہڈیاں سونگھتے اور پھر منہ میں دبا کر دُم ہلاتے شربت والے حکیم صاحب کی دکان کے تھڑے کے نیچے جا بیٹھتے۔ "سلام باؤ جی!" سڑک کا خاکروب مجھے ہمیشہ سلام کر کے گذرتا۔ اسے ہر جمعرات کو ایک اٹھنی ملتی تھی۔ اور پھر ریڑھیوں پر پھل لگا کر بیچنے والوں کی مسلسل آوازیں "آنے پا۔ آنے پا۔ کھٹا نئیں کھانا میٹھے بڑے جے۔ چار آنے سیر" جانے وہ کیا بیچتے تھے۔ میں اپنے ذہن کا دریچہ آہستہ سے کھول دیتا اور پھر اس سے پرے بہ دریچے خود بخود کھل جاتے۔ ہر ایک میں سے یادوں کے حسین لمحے انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتے اور باہر جھانکنے لگتے۔ سری نگر کی جھیل ڈل میں کنول کے چوڑے پتے، وادئ نیلم کی نیلی جھیلیں، روم کے فواروں کی پھوار، دریائے سین کے کنارے ایک حسین شام، سوئٹزرلینڈ کی جھیل... آنے پا۔ آنے پا۔ کھٹا نئیں کھانا، میٹھے بڑے جے... ذہن پر یکدم ہتھوڑے چلتے اور تمام دریچے کھٹا کھٹ بند ہونے لگتے۔ پچھلے پہر سامنے والا پنساری دکان سے باہر آکر اوپر مکان میں سوئے ہوئے اپنے کاہل بیٹے کو لگاتار آوازیں دینے لگتا۔ "یوسف اوئے، اوئے یوسف"۔ میرے ذہن کے دریچوں کے کواڑ اب زور لگانے سے بھی نہ کھلتے... پیرس کا پھولوں کا بازار آنے پا... وینس کے گنڈولے چار آنے سیر۔ سوئٹزرلینڈ یوسف اوئے، اوئے یوسف۔ سب کچھ گڈمڈ ہو جاتا۔ اور اب اس وقت ہسپانوی بستیوں کے سمندر سے آتی ہوئی نم اور خوشگوار ہوا۔ سانتا کلارا کے جزیرے میں چمکتے ہوئے جگنو، ہسپانوی موسیقی اور گرم مچھلی لیکن کب تک! یہ سب کچھ بھی تو عارضی ہے۔ پھر وہی کڑکتی گرمیوں کی دوپہریں

ہوں گی۔گرد آلود سڑک، ریڑھے اور تانگے، پچی پان فروش، اناج سبزی والا، مریل آوارہ کُتے، لاوارث گائیں، شربت والے حکیم صاحب، خاکروب "سلام باؤجی"، سان سباستیان کی ایک شام آنے پاؤ۔ بل فائٹ چار آنے سیر، ہسپانیہ یوسف اوئے، او یوسف۔

یکدم روشنی ہوئی..... فلیش..... میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں لاہور کی گوالمنڈی سے پلک جھپکتے ہی سان سباستیان کے حسین ساحل پر تھا۔ میز کے سرے پر وہی بل فائٹ والی لڑکی کیمرہ آنکھوں سے لگائے بیٹھی تھی۔ دو خوش شکل ہسپانوی لڑکے اس کے ساتھ کھڑے تھے۔ لڑکی نے کیمرہ آنکھوں سے ہٹایا اور ہاتھ ہلا کر زور سے کہنے لگی "ہیلو بُل"۔ تمام لوگ ہنسنے لگے۔ میں نے نظریں نیچی کر لیں۔ سُنہری بالوں والی لڑکی آنے پاؤ۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں نے سگریٹ سلگا لیا اور ساحل سمندر پر بے مقصد گھومنے والوں کو بغیر کسی مقصد کے دیکھنے لگا۔

" آہم، دیکھئے"۔ میں نے فوراً مڑ کر پیچھے دیکھا۔ کالے سوٹ اور باؤلر ہیٹ میں ملبوس ایک نوجوان انگریز اکڑا کھڑا تھا۔ " اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں آپ سے کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں"۔

" فرمایئے!"

" کیا یہ..... " اس نے پلیٹ میں پڑے مچھلیوں کے سروں کی طرف اشارہ کیا " مچھلی کھائی جا سکتی ہے؟"

" مچھلی کھائی جا چکی ہے، یہ صرف اس کے سر اور دُمیں ہیں"۔ میں نے مُسکرا کر جواب دیا۔

" شاید آپ بُرا مان گئے" اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا " میں لندن سے بذریعہ ہوائی جہاز آج ہی سان سباستیان پہنچا ہوں۔ مجھے چونکہ ہسپانوی خوراک کے بارے میں کچھ زیادہ علم نہیں، اس لئے کھانے سے قبل تحقیق کر لینا مناسب جانا"۔

بنیانوں اور کھلے گلے کی قمیضوں میں ملبوس اس ہسپانوی ہجوم میں کسی کاک ٹیل پارٹی کے لئے موزوں لباس پہنے یہ صاحب بالکل چُغد لگ رہے تھے۔

" میں بھی آج ہی پیرس سے یہاں آیا ہوں"۔ میں نے ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا چباتے ہوئے کہا " تلی ہوئی سارڈین مچھلی بے حد مزیدار ہے اور صرف بیس پسیٹے میں"۔

"لیکن سارڈین تو کبھی تل کر نہیں کھائی جاتی ۔ اس قسم کی مچھلی تو سرف سرکے میں بھگو کر ٹین میں بند کرنے کے لئے موزوں ہے"۔ اس نے بالائی ہونٹ دانتوں میں دبا کر لاپرواہی سے کہا۔

"آپ اپنی شکایت اس کیبن کے مالک مچھیرے سے کیجئے، اس میں میرا کوئی قصور نہیں"۔ میں تدرے جھنجھلا گیا۔

"شاید یہ کرسی خالی ہے" اس نے میرے ساتھ والی کرسی کی طرف اشارہ کیا اور پھر جیب سے سفید رومال نکال کر کرسی کی سطح پونچھی۔ ہیٹ اتار کر میز پر دھرا، بالوں پہ ہاتھ پھیرا اور اکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"بور کریں گے یہ حضرت" میں نے دل میں سوچا اور پھر سمندر میں جھولتی ہوئی کشتیوں کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ ویٹرس کمبخت کہاں چلی گئی ہے ۔ اس ریستوران کی سروس اتنی بری ہے کہ اگر لنڈن میں ہو تو ایک دن نہ چلے"۔ وہ اپنی ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے ناک چڑھا کر بولا۔

اکثر انگریز سیاح جب یورپ کی سیر کو نکلتے ہیں تو ان کے دماغ میں برطانیہ کی گھٹائی ہوئی عظمت کا کرہ دفر عود کر آتا ہے ۔ وہ یورپ میں بسنے والی ہر قوم میں کیڑے نکالتے ہیں۔ جرمنوں کو آداب کا علم نہیں۔ فرانسیسی کیکڑے کھاتے ہیں، اطالوی گرہ کٹ ہوتے ہیں، ہسپانیوں کے جسم سے بو آتی ہے ۔ وہ اپنی پوری چھٹیاں گردن اکڑائے، ہر شے پر ناک بھوں چڑھاتے، لنڈن کے بوسیدہ شراب خانوں کی یاد میں آہیں بھرتے گذار دیتے ہیں بلکہ ایک انگریز بڈھا تو ہر اتوار کو پیرس صرف اس لئے جایا کرتا تھا کہ وہاں کی "انگلش پب" میں بہترین انگریزی شراب ملتی ہے ۔ یہ صاحب بھی شاید اسی قبیل کے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ویٹرس کا ادھر سے گذر ہوا تو اس نے آرڈر پوچھنے کا تردد کئے بغیر ٹرے میں رکھی درجن بھر پلیٹوں میں سے ایک ان اینٹھے ہوئے صاحب کے آگے دے ماری۔

"لیکن دیکھیئے..... میں نے ..." انہوں نے گھبراہٹ میں ویٹرس کو پکارا مگر وہ واپس جا چکی تھی چنانچہ مجھ سے مخاطب ہوئے "مگر میں نے تو یہ ڈش نہیں منگائی ۔ ویٹرس کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ کھانا لگانے سے قبل مجھے مینو دکھاتی"۔

ہوراں میں مینو وغیرہ نہیں ہوتا۔ صرف ایک ہی ڈش ملتی ہے گرم سارڈین مچھلی" میں نے اس طرف متوجہ ہوتے بغیر اکتا کر کہا۔ یہ صاحب سان سباستیان کی اس خوبصورت شام کا ستیاناس کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

"یم یم یم" صاحب نے مچھلی منہ میں ڈالتے ہی چٹخارے لینے شروع کر دیے اور پھر یکدم سینے پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو گئے "آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔ میں نے بلاوجہ آپ پر شک کیا ایسی مزیدار مچھلی تو ہاؤس آف لارڈز میں بھی نہیں ملتی"۔

"ہاؤس آف لارڈز ؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ مجھے پہلے ہی شک تھا کہ یہ صاحب کوئی بگڑے ہوئے لارڈ قسم کی چیز ہیں۔

"ہاں! ہاؤس آف لارڈز" انہوں نے ڈبل روٹی کے ٹکڑے سے مچھلی کا مصالحہ پونچھتے ہوئے کہا "میں وہاں پچھلے دس برس سے ویٹر کی حیثیت میں ملازم ہوں"۔

تو وہ لارڈ کی بجائے لارڈز کے ویٹر تھے۔ تبھی کھانے اور سروس کے بارے میں اتنی چھان پھٹک ہو رہی تھی۔

مچھلی ختم کرنے کے بعد صاحب نے ایک بوتل سرخ شراب چڑھائی اور باقاعدہ بہک گئے۔ "میں نے تو ہاؤس آف لارڈز کے خشک کمروں میں اونگھتے ہوئے کھوسٹ بڈھوں کو چار بجے کی چائے پلاتے پلاتے زندگی برباد کی ہے۔ . . . زندگی تو اسے کہتے ہیں" انہوں نے میز پر بیٹھے بے فکرے ہسپانویوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "گرم سارڈین مچھلی، سرخ شراب، سمندر کی خوشگوار ہوا اور . . . میرا تو جی چاہ رہا ہے کہ ہاؤس آف لارڈز کی بیرا گیری چھوڑ کر یہاں ایک کشتی خرید لوں اور سارڈین مچھلیاں پکڑا کروں"۔

"نیک خیال ہے" میں نے اکتا کر کہا۔ میں اب سوچ رہا تھا کہ ان صاحب سے کسی طرح پیچھا چھڑا کر ہوسٹل کی راہ لوں۔

"معاف کیجیے گا!" وہ لڑکھڑا کر اٹھا۔ اپنی ٹائی اتار کر کوٹ کی جیب میں رکھی اور کوٹ اتار کر میز پر رکھ دیا۔ میز پر پڑے ہوئے ہیٹ کو اٹھا کر انہوں نے قریب سے گذرتی ہوئی ویٹرس کے سر پر جما دیا۔ ویٹرس نے آنکھیں مٹکائیں اور ہیٹ اتار کر ان کی خالی بوتل پر لٹکا دیا۔

ایک اور فلیش ہوا۔ بل فائٹ والی محترمہ۔ وہ میز سے اُٹھ کر اپنے ہسپانوی دوستوں کے ساتھ باہر جا رہی تھی "خدا حافظ بل!" اس نے جاتے جاتے کہا۔

"شاید ان محترمہ سے آپ کی دعا سلام ہے" صاحب نے مجھے ٹھوکا دیا۔

"ہاں! بل فائٹ میں ملاقات ہوئی تھی"

"بل فائٹ نہایت ظالمانہ کھیل ہے"، انھوں نے منہ بنایا "میں بھی آج دوپہر دیکھنے کی نیت سے گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ صرف تین سو پسیتے والا ٹکٹ مل سکتا ہے۔۔۔۔ ایک بل فائٹ میں چھ بل، یعنی پورے پچاس پسیتے کا بل پڑا۔ مہنگا سودا تھا۔ کیوں جناب پچاس پسیتے میں ایک شریف بل کو قتل ہوتے دیکھنا کہاں کی عقلمندی ہے؟ اس رقم سے سارڈین مچھلی کی دو پلیٹیں آسکتی ہیں۔ سارڈین مچھلی؟ ہاں سارڈین۔۔۔۔ ویٹرس جانے کہاں مر گئی ہے میں ایک پلیٹ مچھلی اور کھاؤں گا بلکہ سرخ شراب۔۔۔۔"

وہ باتیں کئے جا رہا تھا "ہاں سرخ شراب۔۔۔ ہسپانیہ کی سرخ شراب۔ ویٹرس! میں خود اسے ڈھونڈ کر لاتا ہوں"

صاحب نے خالی بوتل جس پر بیٹ اٹکا ہوا تھا، اٹھائی اور ویٹرس کی تلاش میں باورچی خانے کی جانب چل دیئے۔ میں نے یہ موقع غنیمت جانا اور وہاں سے اٹھ کر ساحلی سڑک پر آگیا۔ چند ایک غیر ملکی جوڑوں کے علاوہ سڑک پر اب بے حد کم لوگ رہ گئے تھے۔ میں پیدل ہی ہوسٹل کی جانب روانہ ہو گیا۔ اگر یہ سب عارضی ہے تو بھی کیا! سانتا کلارا کے جزیرے میں ٹمٹمانے والے جگنو زندگی کے تاریک لمحوں میں چمک اٹھیں گے۔ اس خوبصورت شام کی ٹھنڈی ہوا لاہور کی تپتی دوپہروں میں بھی میرے رخساروں سے چھو کر مجھے ٹھنڈک اور سکون کا احساس دلائے گی۔ میں نے اپنے اندر خوبصورتی کا ذخیرہ کر لیا ہے اور یہ خوبصورتی مجھے آنے والی کل کی دشواریوں کا سامنا کرنے کے قابل بنا دے گی۔

ہوسٹل کے قریب پہنچ کر میں نے مڑ کر ساحل کی جانب نگاہ کی۔ سان سباستیان کے آسمان پر چمکنے والے تارے اور سانتا کلارا کے جگنو آپس میں گلے مل رہے تھے۔

بدبخت قشتالیہ

سانتا کلارا کے جزیرے اور اس کے گرد و نواح میں پھیلے ہوئے وسیع سمندر پہ گہری دھند چھائی ہوئی تھی۔ اگلڈو اور اُرگل پہاڑیوں کی چوٹیوں پر گھنے اور سیاہ بادل اُترے ہوئے تھے۔ ساحلی سڑک کے فٹ پاتھ پر لگے ہوئے درختوں کے پتوں میں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ کرنجا بیچ بالکل ویران پڑی تھی۔ سمندر کا پانی اُتر جانے سے دُور دُور تک ایک دلدل سی بن گئی تھی۔ مچھیروں کی بستی بھی دُھند کی لپیٹ میں آئی ہوئی تھی۔ سانتا کلارا کے ساحل پر لنگر انداز کشتیاں سمندر میں تلاطم کے باعث بُری طرح ڈول رہی تھیں۔

آج صبح جب میں پامپلونا جانے کی غرض سے یوتھ ہوسٹل سے باہر نکلا تو پچھلی شب کا نیلا آسمان گھنے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ ساحلی سڑک تک پہنچتے ہی تیز بارش شروع ہو گئی اور مجھے ایک ہوٹل کے برآمدے میں پناہ لینی پڑی۔ مجھے اُن انگریز بوڑھیوں کا خیال آ گیا جن کی مدد سے ہم نے کل صبح کرنسی تبدیل کروائی تھی۔ وہ ضرور اس وقت ہوٹل کے منیجر پہ برس رہی ہوں گی "پیڈرو کے بچے تم نے ہماری چھٹیوں کا ستیاناس کر دیا ہے۔ سان سباستیان میں تو پچھلے بیس روز سے لگاتار بارش ہو رہی ہے۔" میں نے سامان کے تھیلے میں سے ہسپانیہ کا نقشہ نکالا اور اپنے سفر کے راستے کا تعین کرنے لگا۔ آج شب پامپلونا میں بسر ہو گی۔ کل شام تک ہسپانیہ کے صدر مقام میڈرڈ پہنچ جاؤں گا۔ وہاں سے میرا رُخ دریائے وادی الکبیر کے آہستہ رو پانیوں کے کنارے آباد بزرگ شہروں قرطبہ اور اشبیلیہ کی جانب ہو گا۔ اور پھر غرناطہ ... جہاں الحمرا کے پُر فسوں ایوان، اعلام گردشیں اور

سرخ بُرج میری راہ تک رہے تھے . . . . مجھے تسخیر کرنے کے لئے ! پہلے تو میرا ارادہ تھا کہ میں بذریعہ بس پامپلونا تک سفر کروں مگر یوتھ ہوسٹل میں مقیم ایک فرانسیسی سیاح نے مجھے رِچ ہائکنگ کے ذریعے سفر کرنے کا مشورہ دیا۔ بقول اس کے ہسپانیہ میں لفٹ حاصل کرنا چنداں دشوار نہ تھا چنانچہ اب میں پامپلونا جانے والی شاہراہ کی تلاش میں ادھر آنکلا تھا۔ بارش قدرے دھیمی ہوئی تو میں نے نقشہ لپیٹ کر تھیلے میں رکھا اور باہر سڑک پر آگیا۔ تھوڑی دُور چلنے کے بعد ایک سُرنگ آئی۔ یہ سان سباستیان کی حدِ آخر تھی۔ سُرنگ کے دوسری جانب میں نے سڑک کے کنارے نم آلود گھاس پر رکھا اور کھڑے ہو کر لفٹ کا انتظار شروع کر دیا۔ بارش کی وجہ سے سڑک پر ٹریفک بہت کم تھی۔ ایک دو کاریں رکیں مگر ان کی منزل ہسپانیہ کی بندرگاہ بلباؤ تھی جو پامپلونا سے بالکل مخالف سمت میں واقع ہے۔

مجھے وہاں کھڑے تقریباً دو گھنٹے گذر گئے مگر کوئی لفٹ نہ ملی۔ بارش کا پانی درختوں کے پتوں میں سے رِس رِس کر میری برساتی کے کالر کے اندر تک جا رہا تھا۔ میں دِل ہی دِل میں اُس فرانسیسی سیاح کو کوس رہا تھا۔ اگر میں اس کے مشورے پر عمل نہ کرتا تو اس وقت یہاں بھیگنے کی بجائے پامپلونا کے کسی آرام دہ قہوہ خانے میں بیٹھا گرم گرم کافی پی رہا ہوتا۔ خاصی دیر بعد سُرنگ میں سے ایک جیپ نکلی۔ میں نے انگوٹھے کو خم دے کر ہاتھ آگے کر دیا۔ جیپ پہلے تو تیزی سے میرے پاس سے گذر گئی مگر جانے ڈرائیور کو کیا خیال آیا اس نے ایک دم بریک لگائی اور جیپ مجھ سے کافی فاصلے پر جا کر رُک گئی۔ میں نے جلدی سے سامان کا تھیلا کاندھے پر ڈالا اور بھاگتا ہوا جیپ کے پاس پہنچ گیا۔ مڈگارڈ پر برطانوی یونین جیک لہرا رہا تھا اور ڈرائیور کی نشست پر ایک عجیب الخلقت قسم کی شے براجمان تھی۔ اُس کے بھورے بال کندھوں تک آئے ہوئے تھے اور گھنی داڑھی چھاتی پر اُگے ہوئے بالوں سے اُلجھ رہی تھی۔ گھٹنوں تک آئی ہوئی ایک براؤن نیکر کے علاوہ ان صاحب کے جسم پر اور کوئی لباس نہ تھا۔ اس نے وہاں بیٹھے بیٹھے سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیا اور پھر انگلیوں سے داڑھی میں کنگھی کرتے ہوئے کہنے لگا۔ کہاں جاؤ گے؟

"پامپلونا" میں نے بارش سے بچاؤ کی خاطر شتر مرغ کی مانند اپنا سر جیپ کی چھت کے

بیچھے کر لیا۔

"پام پام لونا ؟" اس نے اپنی گھنی بھنویں چڑھاتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

میں نے پامپلونا کے ہجے کرکے سمجھانے کی کوشش کی۔

"ایک منٹ۔ میں نقشہ دیکھ کر تمہیں بتاتا ہوں کہ یہ پام پام ...." اس نے جیپ کے پچھلے حصے میں سے ہسپانیہ کا ایک بوسیدہ نقشہ نکالا اور اپنے گھٹنوں پر پھیلا کر اس پر آنکھیں گھمانے لگا۔

"یہ سڑک پتہ نہیں کہاں جاتی ہے ؟" خاصی دیر بعد اس نے نقشے پر پڑی ایک بھوری لکیر پر انگلی جماتے ہوئے حیرت سے کہا اور پھر اسی لحظہ مُنہ کھول کر ہنسنے لگا " ہاہا۔ سڑک نہیں یہ تو میری ڈاڑھی کا ایک بال ہے .... ہوہو چھوٹا سا لطیفہ ہو گیا"

" اور یہ جو بڑا سا لطیفہ باہر کھڑا بارش میں بھیگ رہا ہے اس کے بارے میں کیا خیال ہے" میں نے تنک کر کہا۔

" اوہ سوری .... باہر تو بارش ہو رہی ہے۔ بھئی جیپ میں بیٹھ جاؤ باہر کیوں کھڑے ہو۔ میں تمہیں پام پام لونا میں اُتار دوں گا۔"

" بہت خوب" میں نے خوش ہو کر کہا اور جیپ کے اندر گھسنے لگا۔

" ایک منٹ" اس نے ہاتھ آگے کر دیا " چرس تو نہیں پیتے ؟"

" نہیں" میں نے سر جھٹک کر بے صبری سے کہا۔ میری کمر پر چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔

" پھر ٹھیک ہے" اس نے ہاتھ پیچھے کر لیا " اپنا سامان پچھلے حصے میں رکھ دو اور میرے برابر میں بیٹھ جاؤ"

جیپ کے پچھلے حصے پر لنڈے بازار کی کسی دکان کا گمان ہوتا تھا۔ لکڑی کے شہتیر، کھیتی باڑی کے اوزار، پٹرول کے جیری کین، فالتو ٹائر، کلہاڑے اور مختلف سائزوں کی لمبی لمبی چھریاں بے ترتیبی سے بکھری پڑی تھیں۔ میں نے اپنا سامان کا تھیلا درمیان میں رکھ کر اسے ایک پرانے کوٹ سے ڈھانپ دیا اور پھر اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے جیپ سٹارٹ کر دی۔

چند فرلانگ چلنے کے بعد اس نے بریک پر پاؤں رکھ دیا " میں تمہیں ایک بات تو بتانا ہی بھول گیا تھا" اس نے اپنی جھاڑی نما مونچھوں کو مُنہ کے آگے سے سمیٹتے ہوئے کہا " تمہیں

پٹرول کی قیمت بانٹنا ہوگی۔"

"میرے پاس اتنی رقم ہوتی تو میں بس پر سفر کیوں نہ کرتا؟" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

"پھر مجبوری ہے۔" اُس نے سٹیئرنگ پر ہاتھ مار کر فیصلہ سُنا دیا۔

پہلے تو جی میں آئی کہ ان مولانا کو بے نقط سنا کر فوراً جیپ سے اُتر جاؤں۔ بھلا بیچ ہائکنگ میں بھی "مُفتا" نہ لگے تو اتنی خواری سے فائدہ؟ مگر پھر خیال آیا کہ بارش ابھی تک جاری ہے اگر شام تک اور کوئی لفٹ نہ حاصل کر سکا تو بے نیل و مرام واپس ہوسٹل تک پیدل ہی جانا پڑے گا۔

"مجھے منظور ہے۔"

میں جو پہلے دُبکا بیٹھا تھا اب ٹانگیں پھیلا کر نشست پر نیم دراز ہو گیا اور سگرٹ سلگا کر مزے سے کش لگانے لگا۔ اگر کوئی شخص از راہِ نوازش لفٹ کی پیشکش کرے تو دورانِ سفر آپ کا رویہ اس بھلے آدمی کے ساتھ نہایت ہی عاجزانہ قسم کا ہوتا ہے۔ اُس کی ہر بات پر ہاں میں ہاں ملانا اور تمام سوالوں کا جواب انکساری سے دینا آپ پر فرض ٹھہرتا ہے مگر یہاں تو معاملہ ہی اُلٹا تھا۔ اگر مجھ پر پٹرول کی قیمت ادا کرنا واجب قرار دیا گیا تھا تو پھر دھڑلے سے سفر کرنا بھی میرا حق بنتا تھا۔

"جالی گڈ۔" باریش صاحب بے حد خوش ہوئے "میرا نام ٹونی ہے ویسے ایک سگرٹ تو پلاؤ۔ سگرٹوں کی قیمت بھی بانٹنا ہوگی، مجھے کنسنعر کہتے ہیں۔" میں بھی کمینگی پر اُتر آیا۔

"رائٹ یو آر اولڈ بوائے۔" اس نے ایک زوردار قہقہہ بلند کیا اور جیپ سٹارٹ کر دی۔

"آج سے صرف دس روز پہلے تک میں لنڈن میں ایک قصائی کی دکان پر ملازم تھا" اُس نے میری ڈبیا سے سگرٹ نکال کر سلگا لیا اور اپنے بارے میں بتانے لگا "سارا دن ارجنٹائن کی گائیوں اور بارک شائر کے سؤروں کی بوٹیاں کاٹنا اور شام کو کسی شراب خانے میں جی بھر کی شراب چڑھانے کے بعد جھومتا ہُوا اپنے کمرے میں جا کر سو رہتا۔ البتہ ہفتے کی شب کو میں رقص کرنے کے لئے چلا جایا کرتا۔ جس لڑکی کو بھی رقص کی دعوت دیتا وہ ناک چڑھا لیتی۔ دراصل لیوڑی کولون کا پوری شیشی اُنڈیل لینے پر بھی میرے جسم میں سے گوشت کی بُو آتی رہتی تھی۔ پھر پچھلے ہفتے اخبار میں ایک اشتہار نظر آیا۔ رہوڈیشیا کی سفید فام حکومت کو مقامی آبادی کے مقابلے میں اپنا تناسب

بڑھانے کی غرض سے سفید فام کاشتکاروں کی ضرورت تھی ۔ مالی اعانت کے علاوہ دو سو ایکڑ زمین بلا معاوضہ دینے کا اعلان بھی تھا۔ میں نے سوچا افریقہ کی کھلی فضاؤں میں رہنے سے کم از کم میرے جسم میں رچی گوشت کی بُو تو زائل ہو سکے گی چنانچہ جمع شدہ پونجی سے یہ پُرانی جیپ خریدی اور کمرے کا سامان بیچ کر کھیتی باڑی کے اوزار حاصل کر لیئے ۔ میڈرڈ سے جبل الطارق جاؤں گا اور وہاں سے سمندر پار افریقہ"۔

"یہ درجن بھر لمبی چھُریاں کیا آدم خور وحشیوں میں تقسیم کرنے کا ارادہ ہے ؟" میں نے لنڈے بازار کی دکان کی جانب اشارہ کرکے پُوچھا۔ اُن تیز چھُریوں کی موجودگی مجھے خاصی دیر سے پریشان کیئے ہوئے تھی۔

"آدم خور وحشی ؟ واٹ نان سینس ! مَیں خود آدم خور ہوں بشرطیکہ آدم . . . . صنفِ نازک کی صورت میں کھانے کو ملے ۔ ہاہا!" اس نے پھر مُنہ کھولا اور قہقہہ داغ دیا "کیوں ہو گیا نا چھوٹا سا لطیفہ ؟"

میں نے سوچا بیٹے چھوٹا سا لطیفہ تو تب ہو گا جب تمہارے جھاڑ پھونس سے ڈھکے چہرے کو دیکھ کر افریقی حبشی بھی بگٹٹ بھاگ کھڑے ہوں گے کہ ایسا جانور نہ دیکھا نہ سنا !

"ہاں ہو گیا" میں نے اس کا دل رکھنے کے لئے کہہ دیا "مگر وہ چھُریاں !"

"ہاں وہ چھُریاں ! میں لندن بھر میں بہترین گوشت کاٹنے والا ہوں ۔ ان چھُریوں کے ساتھ میری رفاقت دس سالہ پُرانی ہے ۔ مجھے ان کے ساتھ کچھ جذباتی وابستگی سی ہے چنانچہ بقیہ سامان کے ساتھ انہیں بھی فروخت کر دینے کا حوصلہ نہ ہوا ۔ ہسپانوی کسٹم والے ان چھُریوں کو دیکھ کر بے حد جز بز ہوئے بہرحال جب میں نے انہیں بیف سٹیک کا ایک ٹکڑا اس صفائی سے کاٹ کر دکھایا کہ اُس کے آر پار دیکھا جا سکتا تھا تو وہ قائل ہو گئے"۔

"اگر مقصد صرف گوشت کاٹنا ہے تو کیا ایک چھُری سے کام نہیں چل سکتا ؟" مجھے چھُریوں کی تعداد کے بارے میں بھی تشویش تھی۔

"تم شاید گوشت کاٹنے کی شاندار تکنیک سے بالکل ناواقف ہو۔ جانور کی عُمر، جسمانی ساخت، کاٹے جانے والے گوشت کا مصرف اور موٹائی ایسے عوامل ہیں جنہیں مدنظر رکھ کر

ہی درجنوں چھریوں میں سے ایک چھری کا چناؤ کیا جاتا ہے "مثلاً اگر ہم سور کی ران ..."
اس نے گوشت کاٹنے کے جدید طریقے کچھ ایسی فصاحت و بلاغت سے بیان کئے کہ میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ وطن واپسی سے قبل یورپ سے چھریوں کا ایک نفیس سیٹ خریدوں گا اور اگلی بکرعید پر اپنے "چھیڑؤ" کے علاوہ یار دوستوں کے ذہنوں پر بھی طبع آزمائی کروں گا۔
چند میل طے کرنے کے بعد ٹونی نے جیپ سڑک کے کنارے ایک پٹرول پمپ میں موڑ دی۔
" سو پیسیٹے" اس نے اپنی چوڑی ہتھیلی پھیلا دی "پٹرول ختم ہو گیا ہے۔"
"بچا لو یہ پیسیٹے" میں نے رقم اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا "پانچ پیسیٹے سگریٹ کے۔"
یہاں سے روانہ ہوئے تو بلند و بالا پہاڑوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ سرسبز اور دھند میں لپٹے ہوئے۔ باسک صوبے کا یہ حصہ کوہ پیرانیز کے دامن میں واقع ہونے کی وجہ سے اکثر بارش میں بھیگا رہتا ہے۔ زمین انتہائی زرخیز ہے۔ سڑک کے دونوں کناروں پر سیب کے درختوں کی قطاریں دور تک چلی گئی تھیں۔ یکدم تیز اور خشک ہوا چلنے لگی اور آسمان پر چھائے ہوئے بادل اس تیزی سے بکھرے جیسے انہیں بل فائٹ دیکھنے جانا ہو۔ تھوڑی دیر بعد مطلع مکمل طور پر صاف ہو چکا تھا۔ وادی میں ترسن اور مکئی کے ہرے بھرے کھیت دھوپ میں چمکنے لگے۔ ہم بلند پہاڑوں میں سے گذر کر دوسری جانب نکل آئے۔ بائیں ہاتھ پر کارک کے درختوں کے ایک گھنے جنگل میں سفید رنگ کے مویشی چر رہے تھے۔ ان سے پرے ایک وسیع اور سرسبز چراگاہ تھی جس کے پہلو میں ایک سفید شیشہ ندی لیٹی ہوئی تھی۔
طلوسا کا قصبہ آیا تو ٹونی نے ایک دکان سے باسک کسانوں کی روائتی ٹوپی خرید کر پہن لی۔ وہ اس ٹوپی میں کسی یہودی راہب کی مانند لگ رہا تھا۔
طلوسا سے نکلے تو پیرانیز کا پورا سلسلۂ کوہ کچھ یوں نظر کے سامنے آیا جیسے ہم سینما ل کے فسٹ پائڈر پر بیٹھے کسی فوٹوگرافر کا منقش پردہ ... بلند پہاڑ چمکتی ندیاں اور سرسبز درخت ہمالیہ اور الپس کے بعد دنیا کا سب سے مشہور پہاڑی سلسلہ۔ انہی پیرانیز کو جنہیں عربی زبان میں برت کہتے ہیں عبدالرحمٰن الغافقی نے عبور کیا اور فرانس پر حملہ آور ہوا۔ ہینی بال اپنی فوج اور سینکڑوں ہاتھیوں سمیت ان پہاڑوں میں سے گذر کر روم کی جانب بڑھا۔ فرانس کے بادشاہ شارلیمان

نے اندلس کے مسلمان سرداروں ابوالاسود، ابن حبیب اور عامل العربی کی شہ پر پیرانیز پار کیے اور سرقسطہ کا محاصرہ کرلیا۔ یہ سردار عبدالرحمٰن الداخل کے مخالفوں میں سے تھے۔ اس دوران میں جرمنوں نے فرانس پر حملہ کردیا اور شارلیمان کو سرقسطہ کا محاصرہ اٹھانا پڑا۔ فرانس واپس جاتے ہوئے جب وہ پیرانیز کے بلند درہ رانسے وُو میں سے گذر رہا تھا تو شام کے دُھندلکے میں ہزاروں باسک کسان اور مسلمان سپاہی گردونواح کی چٹانوں سے تھرتھر کر ٹوٹ پڑے اور پوری فرانسیسی فوج کو تہ تیغ کردیا۔ درہ رانسے وُو کی اس خونیں آشام شب نے رولینڈ کی کہاوت کو جنم دیا۔ کہا جاتا ہے کہ شارلیمان درہ رانسے وُو سے گذرتے وقت اپنی فوج کی قیادت کررہا تھا۔ فوج کے عقب میں رولینڈ اور دوسرے فرانسیسی سردار چلے آرہے تھے۔ مسلمان حملہ آور ہوئے تو رولینڈ نے اپنا بگل اتنی قوت سے بجایا کہ اس کے پھیپھڑے پھٹ گئے۔ بگل کی آواز پورے کوہ پیرانیز میں گونج گئی۔ بیلوں دُور شارلیمان کو خطرے کا علم ہوگیا اور وہ جان بچاکر فرانس پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ ان دنوں شاید فرانسیسیوں کے پھیپھڑے قدرے کمزور تھے کہ ایک مرتبہ بگل پھونکنے سے پھٹ جاتے تھے ورنہ اس زمانے میں تو مشہور حبشی بگل نواز لوئی امسٹرانگ نصف صدی سے زائد بگل بجانے کے بعد جب مرا تو دل کے عارضے سے نہ کہ پھیپھڑے پھٹنے سے۔ بہرحال درہ رانسے وُو میں فرانسیسیوں کو مکمل شکست ہوئی اور بجز چند افراد کے کسی نے فرانس کا منہ نہ دیکھا۔ شارلیمان اس شکست سے اتنا بددل ہوا کہ پھر کبھی اندلس کا رُخ نہ کیا بلکہ امیر اندلس کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر اپنی بیٹی اس کے حرم میں دینے کی پیشکش بھی کی۔

اب پھر بارش شروع ہوگئی۔ ہمارے بائیں ہاتھ پر درختوں کے ایک جھنڈ میں ایک چمکتا ہوا دریا نظر آیا اور غائب ہوگیا۔ جیپ کی رفتار تیز ہوگئی۔ ہم نشیب کی جانب جارہے تھے۔ تھوڑی دُور چلنے کے بعد یکلخت سڑک ہموار ہوگئی۔ ہم ایک وسیع میدان میں داخل ہورہے تھے۔ سڑک کے دائیں ہاتھ پر ایک بلند چٹان آئی۔ چٹان کی چوٹی پر ایک بیل کا مجسمہ نصب تھا جس پر پامپلونا کے الفاظ تحریر تھے۔ کچھ اور آگے گئے تو اس عظیم میدان کے بیچ پامپلونا کا شہر نظر آنے لگا۔ کلیساؤں کے مینار اور گنبد بارش میں بھیگ رہے تھے۔ ایکدم چاروں طرف کھڑے پہاڑوں کی چوٹیوں پر اٹکی ہوئی گہری دُھند میدان میں اترنے لگی اور ہم اس کے نرغے میں آگئے۔ ٹونی نے جیپ

کی بتیاں جلائیں۔

پامپلونا نوارا صوبے کا صدر مقام ہے۔ کوہ پیرانیز کے دامن میں دریائے آرگا کے کنارے آباد اس شہر کو روم کے سپہ سالار پومپی نے از سرِ نو تعمیر کیا اور اسے پومپیلو کا نام دیا۔ عرب اسے بنبلونا کہتے تھے۔ امیر عبدالرحمٰن جب پورا ہسپانیہ زیر کرنے کے بعد اس شہر میں داخل ہوا تو ہر سو سناٹا چھایا ہوا تھا۔ عیسائی امیر عبدالرحمٰن کی بے پناہ شجاعت سے خوفزدہ ہو کر شہر خالی کر چکے تھے۔ مسلمانوں کے عہد میں یہاں کے حبشی گورنر عثمان ابن ابی نسع نے اپنی بیوی جو کہ ڈیوک آف یوڈس کی لڑکی تھی، کے اکسانے پر علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ امیر اندلس عبدالرحمٰن الغافقی نے شندی ابن زیان کو یہ بغاوت فرو کرنے پر مامور کیا۔ نسع نے شکست کھائی اور ایک چٹان سے کود کر خودکشی کر لی۔

ہم پامپلونا کے مرکزی چوک میں ایک قہوہ خانے کے برآمدے میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ ٹونی ایک ننھے منے ہسپانوی لڑکے سے "لیمپیابوتاس" یعنی بوٹ پالش کروا رہا تھا اور میرے ذہن میں ارنسٹ ہیمنگوے کے ناول "فی اَیستا" کے لازوال کردار انگڑائیاں لے رہے تھے۔ شراب کی رسیا لیڈی بریٹ، اخبار نویس جیک، یہودی کوہن اور لیڈی بریٹ کا دلدادہ مینگیلز مائک۔ وہ سب پامپلونا کے جشنِ سان فرمین میں شرکت کے لیے پیرس سے آئے تو اسی چوک میں واقع ہوٹل، مونتانا" میں ٹھہرے۔ جشن شروع ہونے سے ایک روز قبل نواحی علاقوں کے کسان فروخت شدہ فصل کی رقم سے مالا مال بسوں میں بیٹھ کر شہر میں آتے اور پھر اس کی تنگ گلیوں میں واقع شراب خانوں میں سما جاتے اور پھر جولائی کے پہلے ہفتے میں جشنِ سان فرمین پامپلونا کے غیر مؤثر شہر پر ایک دھماکے کی صورت میں وارد ہو جاتا۔ سات روز کے لئے دن اور رات کا تصور ختم ہو جاتا شہر کے کوچہ و بازار میں رقص و موسیقی کی محفلیں برپا ہوتیں۔ شراب نوشی حد سے زیادہ تجاوز کر جاتی لوگوں کے شور و غوغا سے کان پھٹنے کو آتے۔ اسی جشن کے دوران میں لیڈی بریٹ ایک نوخیز بُل فائٹر کے دامِ الفت میں گرفتار ہوئی۔ یہیں کہیں . . . شاید اسی قہوہ خانے میں ان دونوں کی پہلی ملاقات ہوئی۔

جشن کی سب سے بڑی خصوصیت "بھینسوں کی دوڑ" ہوتی ہے۔ پو پھٹنے کے ساتھ ہی شہر کے ٹاؤن ہال سے ایک راکٹ چھوٹتا ہے اور اس کے پھٹتے ہی شہر سے باہر واقع اصطبل

کے دروازے کھل جاتے ہیں ۔ چھ خونخوار بھینسے ڈکراتے ہوئے باہر نکلتے ہیں اور پاپیلونا کی ایک مخصوص گلی میں دوڑنے لگتے ہیں ۔ متعینہ راستے کے دونوں طرف لکڑی کی ایک باڑھ کھڑی کر دی جاتی ہے تاکہ بھینسے ادھر ادھر نہ نکل جائیں ۔ یہ راستہ سیدھا بل رنگ کو جاتا ہے ۔ اسی دوپہر کو یہی چھ بھینسے بل فائٹ میں حصہ لیتے ہیں ۔ راستے کے دونوں طرف لکڑی کی باڑھ کی آڑ میں اور مکانوں کی بالکونیوں میں کھڑے ہزاروں لوگ شور مچا مچا کر بھینسوں کو تیز بھاگنے پر اکساتے ہیں ۔ بھینسوں کے اصطبل سے باہر آتے ہی بے شمار ہسپانوی اور غیر ملکی ان کے آگے آگے دوڑنا شروع کر دیتے ہیں ۔ جونہی کسی بھینسے کا نوکیلا سینگ خطرناک حد تک جسم کے قریب پہنچتا ہے دوڑنے والا لکڑی کی باڑھ پھلانگ کر اپنے آپ کو محفوظ کر لیتا ہے ۔ بھینسوں کے آگے دوڑنے کے لئے صحت مند جسم کے علاوہ مضبوط اعصاب کی بھی ضرورت ہوتی ہے ۔ اگر آدمی عین وقت پر حواس کھو بیٹھے اور بھینسے کے نزدیک آتے ہی پھرتی سے لکڑی کی باڑھ نہ پھلانگ سکے تو اکثر اوقات جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے ۔

اس دیوانگی کا جواز بھی ہیں بل فائٹنگ کی طرح ہسپانوی مزاج میں ملتا ہے ۔ ہر آدمی تو بل فائٹر نہیں بن سکتا چنانچہ وہ اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر بھینسوں کے آگے "دڑکی" لگاتا ہے اور اپنا شوق پورا کرتا ہے ۔ اور تو اور کئی غیر ملکی بھی مردانگی کے اس مظاہرے میں حصہ لینے کے لئے سارا سال اس لمحے کے انتظار میں رہتے ہیں جب وہ بھینسوں کے آگے سرپٹ بھاگ رہے ہوں گے ۔ دراں کے کانوں سنکے پردے پچھا کرتے ہوئے خونخوار جانوروں کے سموں کی دھمک سے لرز رہے ہوں گے ۔ بھینسوں کے آگے دوڑنے کے لئے سفید قمیض ٹینس شوز اور سرخ رومال روائتی لباس ہے ۔ ٹینس شوز تیز دوڑنے کے لئے اور سرخ رومال بھینسے کو اشتعال دلانے کے لئے ۔ سیاحت پر نکلنے سے پہلے پاپیلونا کے جشن سان فرمین میں شرکت کرنا اور ہر روز ان بھینسوں کے آگے دوڑنا میرے پروگرام میں شامل تھا مگر بدقسمتی سے چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر میں وقت پر نہ پہنچ سکا ۔

یہ ہنگامہ خیز جشن جس مقدس ہستی سینٹ سان فرمین کے نام پر رچایا جاتا ہے اس بھلے آدمی کا صرف اتنا قصور تھا کہ اس نے پاپیلونا کے باشندوں کو عیسائی بنانے کی غلطی کی تھی ۔

پاپیلونا کا مرکزی چوک جہاں جشن کے دوران میں کھوے سے کھوا چھلتا ہے اب تقریباً خالی

پڑا تھا۔ قہوہ خانوں کے برآمدوں میں بچھی کرسیوں پر ویٹر گاہکوں کے انتظار میں بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ میں نے قہوہ خانے کے مالک سے اس بے رونقی کا سبب پوچھا تو وہ اُداس ہو کر کہنے لگا "پامپلونا پورے سال میں جشن سان فرمین کے دوران میں صرف سات روز کے لئے آباد ہوتا ہے اور پھر ایسا اجڑتا ہے کہ پورے ہسپانیہ میں اس سے ویران شہر نہیں ملتا۔ ویسے اس مرتبہ تو کمال ہی ہو گیا۔ پورے چھ آدمی بھینسوں کی دوڑ میں ہلاک ہوئے اور سب کے سب غیر ملکی"۔

وہ ناگزیر وجوہات جن کی بنا پر میں جشن سان فرمین میں شرکت نہ کر سکا تھا مجھے یکدم بے حد عزیز ہو گئیں۔

"پام پام لونا میں رہ کر کیا کرو گے؟" ٹونی نے جواب تک "لیبیا پڑتاس" کر دار رہا تھا، سر اٹھا کر کہا "میرے ساتھ میڈرڈ کیوں نہیں چلتے؟"

میں خود اس اُجڑے دیار میں شب بسر کرنے کے بارے میں کچھ زیادہ سنجیدہ نہ تھا مگر میڈرڈ تک پہنچتے پہنچتے یہ کمبخت جیپ تو ہزاروں پیسٹوں کا پٹرول ہضم کر جائے گی میں نے سوچا۔

"ذاتی طور پر تو مجھے یہ شہر پسند ہے" میں نے دھڑکتے دل سے اپنا کیس مضبوط کرنے کی خاطر لاپروائی سے کہا "لیکن اگر تم اصرار کرتے ہو تو پھر ٹھیک ہے"۔

"یو آر اے سپورٹ!" اس نے اپنی ڈھلکی ہوئی نیکر انگلیوں میں اڑس کر اوپر چڑھائی اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"لیکن ایک شرط ہے" میں نے ہنس کر کہا "میں پٹرول کی نصف قیمت کی بجائے صرف تیسرا حصہ ادا کروں گا"

"منظور ہے" اس نے داڑھی کھجا کر کہا "اب پلاؤ ایک سگرٹ ۔ ۔ ۔ اور تم بھی سگرٹ کے پیسے پٹرول کی قیمت میں سے وضع نہیں کرو گے، ہو گیا نا ایک چھوٹا سا لطیفہ"

ہم شہر سے باہر نکلنے لگے تو ٹونی نے ایک چمڑے کی دکان کے سامنے جیپ روک لی اور دندناتا ہوا اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بغل میں ایک پچکا ہوا چمڑے کا مشکیزہ دبائے برآمد ہوا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا اور پھر سڑک پار کر کے ایک غلیظ سے قہوہ خانے میں گھس گیا۔ وہاں سے باہر نکلا تو اس کے کاندھے پر دھرا مشکیزہ ایک جونک کی مانند پھول کر کپا ہو رہا تھا اور اس پر سرخ شراب،

کے قطرے تھے۔

"اس کی پیٹی میں یہ مشکیزہ اور اس میں بھری ہوئی سرخ شراب" اس نے بڑے پیار سے مشکیزے کی نم آلود سطح پر ہاتھ پھیرا اور اسے جیپ کے پچھلے حصے میں رکھ دیا "ہسپانیہ میں شراب کی ارزانی دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ رہوڈیشیا جانے کی بجائے یہیں رہ جاؤں"۔ وہ بے حد مسرور نظر آ رہا تھا۔

پامپلونا سے نکلنے کے بعد کچھ دور تک تو ہم اس ہیالانما وسیع اور سرسبز میدان میں سفر کرتے رہے مگر پھر آہستہ آہستہ ہرے بھرے کھیت چٹیل میدانوں میں بدلنے لگے اور چھوٹی پہاڑیاں خشک اور بلند پہاڑوں کی صورت اختیار کرتی گئیں۔ کہیں کہیں پائن اور کارک کے درخت بھی نظر آتے۔ کوہ پیرانیز میں سرایت کردہ خنکی دھیرے دھیرے ہمارے جسموں میں سے زائل ہو رہی تھی اور اب قدرے گرمی کا احساس ہو رہا تھا۔ ادھر ٹونی کی جیپ بھی ہر تیس چالیس میل کے بعد پیاس سے نڈھال ہو کر کھڑی ہو جاتی اور اس میں گیلنوں پیٹرول ڈلوانا پڑتا۔

دوپہر کے وقت ہم نے ایک چھوٹی سی ندی عبور کی۔ میں نے نقشے میں دیکھا یہ دریائے ایبرو تھا۔ رومیوں سے قبل اس دریا کا نام آئبیرس تھا اور اس کے کنارے بسنے والے لوگ آئبیرین کہلاتے تھے۔ ہسپانیہ کا قدیمی نام آئبیریا اسی دریا سے اخذ ہوا۔ اس کے بعد قلعہ ہورا کے قصبے سے گذر ہوا جہاں ہشام کے عہد میں بغاوت ہوئی۔ اس بغاوت کو ابن غالب نے فرو کیا۔

قلعہ ہورا سے نکلتے ہی خشک اور بلند پہاڑوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ وحشت ناک اور بے آب و گیاہ۔ دور دور تک آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ یہ قشتالیہ تھا۔

قشتالیہ کا مطلب ہے قلعہ۔ اس صوبے کو قلعہ اس لئے کہا گیا کہ ہسپانویوں کے بقول یہ سرزمین ایک حصار کی صورت میں مسلمانوں کی یلغار کو روکے رہی۔ فرڈیننڈ اور ازابیلا جنہوں نے ہسپانیہ میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کو سرنگوں کیا قشتالیہ ہی کے فرماں روا تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ہسپانیہ کی عظمت قشتالیہ کے باشندوں اور ذرائع کی مرہون منت تھی۔ قشتالیہ رو بہ زوال ہوا تو ہسپانیہ کی عظمت بھی گہنا گئی۔ قشتالیہ کی موجودہ پسماندگی اور زبوں حالی کے بارے میں ہسپانوی شاعر انتونیو مچادو لکھتا ہے۔

بدبخت قشتالیہ
بیتے دنوں میں تو کتنا عظیم تھا
مگر اب
تو جھینجھڑوں میں لپٹا ہوا ہے۔

بنجر پہاڑوں اور چٹیل میدانوں میں بگولے اٹھ رہے تھے اور پاکستان کی چلچلاتی گرمیوں ایسی لو سے ہمارے چہرے جھلسے جا رہے تھے۔ میں نے اپنی سفید برساتی تو پامپلونا سے چلتے وقت ہی اتار دی تھی مگر اب گرمی کی شدت سے قمیض کے اندر میرے جسم پر پسینے کے قطرے رینگ رہے تھے۔ ٹونی کی تقلید کرتے ہوئے میں نے بھی تمام کپڑے اتار کر ایک نیکر پہن لی۔

جس سڑک پر ہم سفر کر رہے تھے وہ بے حد ناہموار تھی۔ چھوٹے چھوٹے کنکر اور پتھر ٹائروں کی زد میں آ کر گولی کی مانند نکلتے اور جیپ کے نچلے حصے پر تڑاخ تڑاخ برسنے لگتے۔ شاید یہ سڑک بھی ان دنوں کی یادگار تھی جب قاضی ولی محمد کا اِدھر سے گذر ہو رہا تھا۔ وہ اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں "ہسپانیہ کی بعض سڑکیں تو اس قدر خراب ہیں کہ لکھنؤ کی سڑکوں کو مات کرتی ہیں" جیپ کی ونڈسکرین ہر چند منٹ بعد گرد سے اٹ جاتی اور ٹونی کو اسے اپنی ایک پرانی قمیض سے پونچھ کر صاف کرنا پڑتا۔ قلعہ ہورا سے ہم تقریباً چالیس میل دور آ چکے تھے مگر اس دوران کسی آبادی یا پٹرول پمپ وغیرہ کا نام و نشان تک نہ ملا اور نہ ہی اس سڑک پر کوئی اور کار یا ٹرک دیکھنے میں آیا۔ کبھی کبھار گرد و نواح کے خشک پہاڑوں میں کہیں کہیں دھول اٹھتی نظر آتی۔ یہ دھول ہماری نظروں سے اوجھل کسی گھاٹی میں بھیڑوں کے ریوڑ کے چلنے سے اٹھ رہی تھی۔ "ڈان کے ہوتے" نے جب لامانچا کے میدانوں میں اسی قسم کی دھول اٹھتی دیکھی تو اس نے یہ تصور کر لیا کہ دشمن کی لاتعداد فوج اس کی جانب بڑھ رہی ہے۔ چنانچہ اس عمر رسیدہ خدائی فوجدار نے اپنے گھوڑے روزی نانتے کو تھپکا اور نیزہ تان کر اس خیالی دشمن پر حملہ آور ہو گیا۔ ویسے ڈان کے ہوتے تو کیا کوئی بھی شخص اگر اس بے آب و گیاہ ویرانے کی تپتی ہوئی دوپہروں میں ہوش و حواس کھو بیٹھے تو بعید نہیں۔ ٹونی بار بار جیپ روک کر مشکیزے میں سے سرخ شراب کے چند گھونٹ نگلتا اور پھر اپنی ڈاڑھی میں سے پسینہ نچوڑ کر جیپ چلانے لگتا۔ اس کی آنکھیں گرمی سے سرخ ہو رہی تھیں۔

چاند کی سطح جیسی اس وحشت ناک اور ویران سرزمین پر ہر طرف ہُو کا عالم طاری تھا۔ حرنت

جیپ کے انجن کی آواز اس ویرانے کے خوابیدہ سکوت کو باقاعدگی سے جھنجھوڑ رہی تھی۔ ہسپانیہ کا نصف سے زائد رقبہ اسی قسم کے خشک پہاڑوں اور دھول سے اٹے ہوئے ٹیلوں پر مشتمل ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے بعد ہسپانیہ یورپ کا بلند ترین ملک ہے۔ یونانی جغرافیہ دان سٹرابو نے ہسپانیہ کے جغرافیائی خدوخال اور زمین کی رنگت کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے دیوار پہ پھینچی ایک بھینسے کی کھال سے تشبیہہ دی تھی۔ کہیں کہیں زیتون کے گردآلود باغ بھی نظر آجاتے۔ پژمردہ اور اداس۔ زیتون اور باغ ایسے خوشگوار الفاظ ذہن میں اترتے ہی جو دلکش سماں بندھتا ہے وہ انتہائی گمراہ کن ثابت ہوا۔ اس بدصورت جھاڑی نما پودے کو تو درخت کہنا ہی زیادتی ہے۔ ہمارا کیکر اس آسیب زدہ درخت سے کہیں خوشنما ہے۔ کیکر کو زرد پھول بھی تو لگتے ہیں۔

مخالف سمت سے ایک ٹرک نمودار ہوا اور دھول اڑاتا ہوا ہمارے پاس سے گذر گیا۔ یورپ کے کسی ملک میں پہلی مرتبہ ایسی بے کراں وسعتوں کا احساس ہوا جو صرف ایشیائی ملکوں کا خاصہ ہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم قندھار سے ہرات جا رہے ہوں۔ ویران خلائی وسعتیں، دھول، بگولے.... صرف کوچی خانہ بدوشوں کے سیاہ خیموں کی کمی تھی۔ آخر کار ایک قصبے سے گذر ہوا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہاں طاعون کی وبا پھیل چکی ہے اور یہاں کے باشندے گھر بار چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے ہیں۔ ہر سو ویرانی برس رہی تھی۔ وحشت ناک اور ڈراؤنا جیسے انگمار برگمین کی کسی آسیب زدہ فلم کا اجڑا ہوا گاؤں۔ رکنے کو جی نہ چاہا۔ میں پسینے میں شرابور اونگھتا رہا اور یونانی مشکیزے میں سے شراب کے گھونٹ بھرتا۔ اپنی داڑھی کھجاتا جیپ چلاتا رہا۔ ہم دونوں سر سے پاؤں تک دھول میں اٹے ہوئے تھے۔ ایکدم جیپ رک گئی۔

"کیا ہوا؟" میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"پٹرول ختم ہو گیا ہے۔" اس نے سٹیئرنگ پر ہاتھ مار کر نہایت لاپرواہی سے کہا۔

میری تو ہستی گم ہو گئی۔ "اب کیا ہو گا؟"

"کچھ بھی نہیں" وہ جیپ کے پچھلے حصے میں سے ایک جیری کین نکال لایا "میرے پاس پٹرول کا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ ویسے میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کی ضرورت افریقہ کی بجائے یورپ کے ایک ملک میں پڑ جائے گی۔"

میں نے پچاس پیسے کا ایک نوٹ ٹونی کی طرف بڑھا دیا "میرا حصہ!"

"رہنے دو" وہ ہنس کر کہنے لگا "اگر آج شب تک زندہ و سلامت رہے تو میرا چمڑے کا مشکیزہ سرخ شراب سے بھروا دینا تقریباً خالی ہو چلا ہے۔ ہو گیا نا چھوٹا سا لطیفہ؟"

جیپ پٹرول سے تر ہو کر سٹارٹ ہوئی تو پھر گنگنا دینے والا گرم سفر شروع ہو گیا۔ گرد اور گرما کا تو یہاں مناسب انتظام ہے۔ میں نے سوچا گداگر رستان بھی دستیاب ہو جائے تو ملتان کے مزے لوٹتے... ہسپانیہ کے بارے میں میرے تصورات پٹا کھا رہے تھے۔ اگر یہی الاندلس ہے تو اللہ معاف ورے یہ عرب کچھ زیادہ ہی مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں۔

لو کے تھپیڑے، جیپ کی تپتی ہوئی نشست، گرد کی تہیں، ٹونی کی کمبل نما داڑھی، میرا ننگا بدن جھلس رہا تھا۔ جسم میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں۔ حلق سوکھنے لگا۔ مجھے شدت کی پیاس لگ رہی تھی۔ ٹونی تو اپنا حلق بچی کھچی شراب کے قطروں سے تر کر رہا تھا مگر مجھے تو ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس درکار تھا۔ صرف سادہ پانی کا ایک گلاس۔ اور یا پھر شاید کہیں آس پاس ہی کوئی راہٹ چل رہا ہو جس کے "گتے" کی متواتر ٹک ٹک ٹک کی سریلی آواز وہاں تک میری راہبری کرے۔ شیشم کے "تالیاں بجاتے پتوں" کے سائے میں چچا حیدر چارپائی ڈالے حقے کے کش لگا رہا ہو اور ساتھ ساتھ اپنی انبیھیوں کی سی آواز میں راہٹ کے آگے جتے بیلوں کو پیار سے ہنکار رہا ہو "اوئے نبنوں کوہ کے کھاواں۔ اوئے مریں تو ٹں!" مجھے دور سے پگڈنڈی پر آتے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہو "اوئے بسم اللہ تنصر آیا اے" اور اپنی کھدر کی پگڑی سر پر جماتے ہوئے بیلوں کی کوٹھڑی میں سے ایک پوٹلی نکال کر لے آئے.... اسی راہٹ کے پانی سے سینچے ہوئے جو کے ستو اور چچا حیدر کے کھردرے ہاتھوں سے چھیلے ہوئے گنے کی شکر۔ ستو اور شکر.... اور پھر کنویں کا خنک پانی.... ہاں ہاں۔ ایک پرانی کھٹارا کار جسے ایک بوڑھا پادری چلا رہا تھا ہارن دیتی ہمارے پاس سے گزر گئی۔ شاید گرمی کی شدت سے میرا دماغ چلنا جا رہا تھا ورنہ میں تو ضلع گجرات پاکستان کی بجائے ضلع قشتالیہ میں تھا۔ بفرض محال یہاں کوئی راہٹ ہو بھی تو وہاں چچا حیدر کی بجائے کوئی مونچھوں والا سڑیل ہسپانوی سومبریرو ہیٹ پہنے بیلوں کو ہنکارنے کے لئے "اوئے مریں تو ٹں" کی بجائے "بے تورو۔ بے تورو" کی رٹ لگا رہا ہو گا اور جو کے ستو کی بجائے

حُر کا پانی یعنی شراب اُٹھالائے گا۔

سڑک کے بائیں ہاتھ پر گہرائی میں سفید رنگ کا ایک گھر نظر آیا۔ صحن میں زیتون کا ایک گردآلود درخت سر جھکائے کھڑا تھا۔

"ہے ٹرنی!" میں نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے مکان کی جانب اشارہ کیا "جیپ کھڑی کرو شاید وہاں سے پانی مل سکے۔ مجھے بے حد پیاس لگی ہے۔"

"مشکل ہے" اس نے بریک پر پاؤں رکھ دیا "بہر حال کوشش کر دیکھو۔ اگر مل گیا تو شکیزہ بھی بھر لانا۔ جیپ کا انجن بھی گرم ہو رہا ہے۔"

میں نے خالی شکیزہ اٹھایا اور جیپ سے باہر نکل آیا۔ تیز دھوپ میرے بدن کو چھید گئی۔ جیپ کے انجن کی آواز گرد و نواح کے خشک پہاڑوں میں گونج کر ایک ہولناک سائیں سائیں سی پیدا کر رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ قدم رکھتا کھڈ میں اُترا اور مکان کے صحن میں چلا گیا۔ زیتون کے درخت کے ساتھ ایک کالی بکری بندھی ہوئی تھی جو مجھے دیکھتے ہی ممیانے لگی۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور کالی چادر میں لپٹی ایک پستہ قد بڑھیا باہر نکل آئی۔ اس کی شکل بے حد ڈراؤنی تھی جیسے "میکبتھ" کی کوئی چڑیل ہو۔ جھریوں کے گنجان تانے بانے میں اس کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔

"پانی.... آکوا؟" میں نے ڈرتے ڈرتے ہتھیلی لبوں سے چھوتے ہوئے اپنا مدعا سمجھانے کی کوشش کی۔ اس کے افلاس زدہ بوڑھے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"مومنتو!" اس نے انگلی سے اشارہ کیا اور چادر سنبھالتی ہوئی مکان کے اندر چلی گئی۔

بکری اب ممیانے کی بجائے اپنے آگے پڑے زیتون کے پتوں پر منہ مارنے لگی۔ صحن میں تازہ قلعی کی مہک تھی۔ تیز دھوپ کی وجہ سے سفید دیواروں پر نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بڑھیا باہر آئی تو اس نے دونوں ہاتھوں سے دودھ سے لبالب ایک مٹی کا پیالہ تھام رکھا تھا۔

"پانی؟" میں نے پھر پوچھا۔

"ال لیچے" اس نے پیالہ میرے آگے کر دیا۔

عام حالات میں بکری کے دودھ کے نام سے ہی مجھے اُبکائی آجاتی ہے مگر شاید یہ ہسپانوی بکریاں ہمارے ہاں کی بکریوں سے زیادہ تہذیب یافتہ ہوتی ہیں۔ اس دودھ نے بے حد مزہ دیا۔

یا پھر میں بھی ڈان کے خوتے کی مانند تصورات کی دنیا میں بستا تھا اور بکری کے دودھ کو ستّو اور شکر کا شربت سمجھ کر پی گیا۔ دودھ ختم کر کے میں نے قیمت ادا کرنے کی نیت سے نیکر کی جیب سے دس پیسینے کا ایک نوٹ نکالا۔

"نادا۔ نادا" بڑھیا نے انکار میں زور زور سے سر ہلایا۔

"گراسیا۔ گراسیا"۔ میں نے بھی زور زور سے سر ہلایا اور نوٹ جیب میں ڈال کر واپس سڑک پر آگیا۔ دھوپ میں چمکتی ہوئی گرد آلود سڑک حدِ نظر تک سیدھی چلی جا رہی تھی۔ بالکل خالی۔ لڑنی کی جیپ وہاں موجود نہ تھی۔ میرے ماتھے پر چمکتے پسینے کے قطرے یکدم حجم میں بڑھے اور ٹپ ٹپ میری آنکھوں میں گرنے لگے۔ نمکین اور گرم۔ اب کیا ہو گا؟ مجھے یقین تھا کہ لُونی میرے سامان سمیت وہاں سے چمپت ہو گیا ہے۔ عام طور پر میں اپنے دونوں کیمرے ہر وقت اٹھائے پھرتا تھا۔ پاسپورٹ اور پیسے بھی ہمیشہ جیب میں رہتے۔ مگر آج میں نے نیکر پہننے کے بعد پتلون جیب کے پچھلے حصے میں پھینک دی تھی۔ پاسپورٹ اور پیسے اسی میں تھے۔ کیمرے بھی وہیں رکھے تھے۔ میرے سامنے ایک سنسان سڑک دھوپ میں لیٹی ہوئی تھی۔ اردگرد خشک اور بنجر پہاڑ سر اٹھائے کھڑے تھے۔ ہر سُو ایک ہولناک سنّاٹا طاری تھا۔ صرف گرم لُو کی سائیں سائیں اور شاید میرے دل کے دھڑکنے کی آواز۔ دھک۔ دُھک . . . . اب کیا ہو گا؟ دھک ایسی بدبخت قشتالیہ کی پتھریلی زمین پر آگ برساتے آسمان تلے بے یار و مددگار کھڑا تھا۔ میرا کُل سرمایہ ایک نیکر، دس پیسینے کا ایک نوٹ اور ایک خالی چمڑے کا شکیزہ تھا۔ کیا قشتالیہ ہمیشہ مسلمانوں کے لئے منحوس ہی ثابت ہو گا؟ آس پاس کہیں سایہ بھی نہ تھا۔ لُونی چھوٹے چھوٹے لطیفے کرتا میرے ساتھ ایک بہت بڑا لطیفہ کر گیا تھا۔ میرے ذہن میں بے حد خوفناک خیال آ رہے تھے۔ قشتالیہ اور حیدر کے راہبٹ کے درمیان پڑتے ہوئے درجنوں ممالک کے کسٹم آفیسر مجھے آنکھیں دکھانے لگے پاسپورٹ؟ پاسپورٹ؟ وہ سب چیخ رہے تھے۔ میں پیرس، وینس، استنبول اور تہران کے بازاروں میں ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا "مجھے بھیک دو میرے ساتھ ایک بڑا سا لطیفہ ہو گیا ہے"۔ میرا دماغ چکرانے لگا۔ تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد دُور سڑک پر دھول اٹھی۔ شاید کوئی ٹرک آ رہا تھا۔ میں ہاتھ پھیلا کر سڑک کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ جیپ تھی۔ میرا جی چاہا کہ میں پاگلوں کی

طرح قہقہے لگانے شروع کر دوں ۔ ہاں ہاں یہ ٹونی کی جیپ تھی ۔ جونہی جیپ میرے پاس آکر رُکی میں جلدی سے اندر بیٹھ گیا۔

"یہ تم ہاتھ پھیلا کر سڑک پر اس طرح کیوں کھڑے تھے ؟ دُور سے یوں لگتا تھا جیسے اوتھیلو مکالمے بولنے کی تیاری کر رہا ہے"۔ ٹونی نے ڈاڑھی کھجلا کر پُوچھا۔

"میں لمبی داڑھی والے ذیوس دیوتا کا استقبال کر رہا تھا"۔ میں نے اپنے بے پناہ غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"مجھے افسوس ہے کہ تمہیں یہاں انتظار کرنا پڑا"۔ اس نے معذرت کی "تم پانی کی تلاش میں گئے تو موٹر سائیکل پر ایک سوار ایک کسان مجھے یہاں کھڑے دیکھ کر رُک گیا۔ میں نے اس سے جیپ کے ریڈی ایٹر میں ڈالنے کے لئے پانی کے بارے میں پُوچھا تو وُہ مجھے یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک پُرانے قبرستان میں لے گیا جہاں مُوروں کے زمانے کا ایک کنواں تھا۔ . . . بس وُہیں دیر ہو گئی"۔ اُس کی داڑھی میں سے پانی نچڑ رہا تھا۔ جیپ میں پانی ڈالنے کے علاوہ شاید وہ خود بھی نہا کر آیا تھا۔

"مُوروں کے زمانے کا کنواں ؟" میں نے دِلچسپی لیتے ہوئے پُوچھا۔

"سینکڑوں برس پیشتر اس علاقے پر بڑی بڑی پگڑیوں والے وحشی مُور حکمران تھے۔ انہوں نے مسافروں کی سہولت کے لئے تمام بڑی شاہراہوں کے کنارے ہر چند کوس کے فاصلے پر کاروان سرائیں اور کنوئیں بنوائے ۔ مجھے اُس پادری نے بتایا تھا"

"کنوئیں کا پانی ضرور ٹھنڈا ہو گا ؟"

"ہاں ! کائی اور پُرانی اینٹوں کی ملی جُلی باس سے مہکتا ہوا خنک پانی . . . . لیکن تمہیں یہ کیسے معلوم ہے کہ کنوئیں کا پانی ٹھنڈا تھا ؟" ٹونی نے حیرت سے پوچھا۔

اب میں اُسے کیونکر بتاتا کہ یہ میرے چچا حیدر کا کنواں تھا۔

"اس قبرستان میں کنوئیں کے آس پاس کوئی فقیر وغیرہ بھی تھا ؟" میں نے قدرے توقف کے بعد ہنستے ہوئے دریافت کیا۔

"فقیر ؟" اُس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا "ہاں کنوئیں کے قریب پھٹے پُرانے کپڑوں میں ملبوس

ایک شخص زیتون کے درخت تلے سو رہا تھا.... ہو سکتا ہے کوئی فقیر ہو.... لیکن....“
”چار تحفے.... گر دہ گرما، گدا و گورستان.... بس ہوگیا ملتان!“ میں نے خوش ہو کر بچوں کی طرح تالی بجا دی۔
”مورٹان؟“ ٹونی کے گھاس پھونس میں اس کا منہ کسی گہرے غار کی مانند حیرت سے کھل گیا
”یہ مورٹان کیا ہوتا ہے؟“ میں نے کہا اوللہ برائے نہیں ہو گیا گیا ہے؟“
”مجھے؟“ میں نے ہنستے ہوئے کہا ”مجھے ایک چھوٹا سا لطیفہ ہو گیا ہے۔“
ٹونی نے سٹیئرنگ چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے اپنی داڑھی اتنے زور زور سے کھجلائی جیسے اُسے نوچ لینا چاہتا ہو اور پھر سر جھٹک کر جیپ سٹارٹ کر دی۔ وہ کن انکھیوں سے مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ ”مورٹان“ وہ ہر چند لمحوں کے بعد بڑبڑاتا اور پھر سر جھٹک دیتا۔
ہماری جیپ فنشالیہ کی وسیع سرزمین پر دھول اڑاتی چلی جا رہی تھی۔ ٹونی مورٹان والی بات چیت کی وجہ سے شاید مجھ سے ناراض ہو گیا تھا اور اب بے حد سنجیدگی سے جیپ چلانے میں مصروف تھا۔ سورج کی تمازت مدھم پڑ چکی تھی، کرنوں کی سیسہ پگھلی سفیدی اب زردی مائل تھی۔ گرد میں لپٹی ہوئی لُو کی جگہ خوشگوار اور زیر ہوا نے لے لی تھی اور ہم دونوں تاحد نظر لیٹی ہوئی سڑک پر نظریں جمائے چپ چاپ بیٹھے تھے۔

ثوریا! ثوریا! ثوریا!

شام کے دُھندلکے میں ہمارے سامنے ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے واقع ایک قدیم شہر کی عمارتوں کے دُھندلے نقوش اُبھرے۔ ندی کے پار بائیں طرف ایک ٹیلے پر کسی تاریخی قلعے کے کھنڈر دکھائی دے رہے تھے۔ ویران اور ہیبت ناک...... میں نے نقشہ کھول کر دیکھا۔ یہ ثوریا تھا۔

"آج شب یہیں بسر کرلی جائے" میں نے تجویز پیش کی۔ ٹونی نے داڑھی کھجلا کر اثبات میں سر ہلایا۔

پُل کی دوسری جانب قلعے کی دیوار کے ساتھ ساتھ ایک پادری سر جھکائے چلا آرہا تھا ہم نے جیپ روک لی اور اُس سے ثوریا کے یُوتھ ہوسٹل کا پتہ دریافت کیا۔ وہ کچھ دیر تو اپنے کالے چوغے کی گہری جیبوں میں ہاتھ ڈالے سر ہلاتا رہا۔ پھر اپنی ٹوپی درست کی اور ہمیں وہیں کھڑے رہنے کا اشارہ کرکے قلعے کے پہلو میں واقع ایک عمارت کے اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اُس کے ہمراہ گارڈیا سول کے دو گھڑسوار بھی تھے۔ گارڈیا سول...... جن کے چمکتے ہوئے فُل بوٹ اور ترچھی ٹوپی ہسپانوی دیہاتیوں کے لیے دہشت اور خوف کی علامتیں بن گئے ہیں۔ ۱۸۴۴ء میں مقامی ملیشیا کی جگہ اِن گارڈیا سول کا قیام زیرِ عمل لایا گیا۔ ہسپانیہ کی خانہ جنگی میں انھوں نے جنرل فرانکو کا ساتھ دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اُن دنوں دیہاتیوں نے انتقاماً گارڈیا سول کو بڑی بیدردی سے قتل کیا۔ آج بھی ہسپانیہ کے دیہات میں انھیں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ بے پناہ قانونی اور غیر قانونی اختیارات کے مالک ہیں۔ اُن کا ایک اِشارہ کسی غریب کسان کو عمر بھر پابندِ سلاسل رکھنے کے لیے کافی ہے۔ ہسپانیہ کے کسی کونے میں چلے جائیے گارڈیا سول وہاں موجود ہوں گے۔ سائیکل پر، پیدل یا گھڑسوار، اور ہمیشہ جوڑوں میں۔ دو سے کم سفر نہیں کرتے۔ گارڈیا سول موجودہ حکومت کی بساط پر ایسے مہرے

ہیں جن کی مدد سے عوام کی سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کو "چیک" کیا جاتا ہے۔ اور اب پادری اپنا لبا چوغا سنبھالتا ہوا دو گھڑسواروں کے آگے آگے تیز تیز چلتا ہوا ہماری جانب آ رہا تھا۔ ہسپانوی سوسائٹی کو "استحکام" بخشنے والے دو نگہبان .... پادری اور گارڈیا سول۔ جیپ کے قریب آکر انھوں نے نگاہیں کھینچ لیں۔ جیپ کے اندر بیٹھے ہوئے مجھے صرف گھوڑوں کی تھوتھنیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں باہر آ گیا۔

"سینیور ہم توریابیں رات بسر کرنا چاہتے ہیں" میں نے جھجکتے ہوئے کہا "کیا آپ ہمیں یہاں کے یوتھ ہوسٹل کا پتہ بتا سکتے ہیں؟"

"قومیت"؟ گارڈیا سول نے میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کرختگی سے پوچھا۔

"پاکستانی" میں نے فوراً جواب دیا۔

"انگریز" ٹونی نے اپنی پارسیس تھوتھنی جیپ سے باہر نکال کر کہا۔

"منزل؟" دوسرے گارڈیا سول نے اپنے گھوڑے کو تھپکتے ہوئے دریافت کیا۔

"رہوڈیشیا" ٹونی نے بتایا۔

"سپین، فرانس، سوئٹزرلینڈ، آسٹریا......" میں نے ساتھ ساتھ انگلیوں پر گنتی شروع کر دی۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے......" گارڈیا سول نے بے صبری سے کہا "مرکزی چوک، دو سڑکیں، دائیں ہاتھ کی سڑک پر تیسری گلی نمبر ۳۲"

اس دوران میں اُس کا ساتھی گھوڑے سے اتر کر جیپ کا جائزہ لیتا رہا اور بڑے اہتمام سے اپنی ڈائری پر کچھ لکھتا رہا۔ اُس نے جیپ کے پچھلے حصے میں بھی جھانکا مگر خوش قسمتی سے اُسے ٹونی کی چھریاں دکھائی نہ دیں ورنہ مصیبت کھڑی ہو جاتی۔ کہا جاتا ہے کہ گارڈیا سول کو ہسپانیہ میں داخل ہونے والے غیر ملکی کے نام پتے اور رُوٹ کا علم ہوتا ہے۔

جب ہم گارڈیا سول کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچے تو وہاں کسی روائتی یوتھ ہوسٹل کی عامیانہ عمارت کی بجائے ایک نہایت جدید طرز کی پانچ منزلہ عمارت کھڑی تھی۔ میں جیپ سے اُترا اور شیشے کے بڑے دروازے کے ساتھ ناک چپکا کر اندر دیکھنے کی کوشش کی۔ کچھ بھی دکھائی نہ دے رہا تھا۔ مکمل تاریکی..... میں نے ہینڈل گھمایا تو دروازہ کھل گیا۔ عمارت کا وسیع ہال

بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ کاؤنٹر بھی خالی پڑا تھا۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ مَیں جلدی سے باہر آ گیا۔
"ٹونی میرا خیال ہے کہ ہم غلط جگہ پر آ گئے ہیں۔ یہ عمارت تو بالکل ویران پڑی ہے۔ ویسے بھی اتنی جدید اور وسیع عمارت یوتھ ہوسٹل نہیں ہو سکتی۔"
"نمبر ۳۲ تو یہی ہے" ٹونی جیپ سے اُترتے ہوئے بولا "چلو ایک مرتبہ پھر دیکھ لیتے ہیں۔"
"کوئی ہے؟" مَیں نے اندر داخل ہوتے ہی منہ پر ہاتھ رکھ کر زور سے کہا۔ میری آواز سے پوری عمارت گونج اُٹھی "ہے ہے ہے"
"ہو ہو ہو" ٹونی کاؤنٹر کے ساتھ دوسری منزل کو جاتی ہوئی سیڑھیوں پر کھڑا ہو کر یونہی ہُو ہُو کرنے لگا۔
"مجھے تو یہ عمارت آسیب زدہ لگتی ہے" مَیں نے ہال میں رکھے آرام دہ صوفے پر دھپ سے بیٹھتے ہوئے کہا۔
"اتنی جدید عمارت آسیب زدہ نہیں ہو سکتی" ٹونی فرش پر بچھے نرم قالین پر لیٹ گیا۔ "ہو گیا نا چھوٹا سا لطیفہ؟"
"مُولتان" مَیں نے اُسے چھیڑا۔ وہ پھر ہُو ہُو کرنے لگا۔
"باہر کا دروازہ کھلا ہے۔ فرنیچر بھی موجود ہے...... لیکن...... لیکن......" مَیں ابھی اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ کہیں دُور قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ بے حد مدھم مگر نپے تُلے قدموں کی چاپ۔ مَیں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ ٹونی نے فوراً ہُو ہُو بند کر دی اور داڑھی کھجلا کر قالین سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ ہمارے کان قدموں کی چاپ پر لگے تھے اور آنکھیں کاؤنٹر کے ساتھ والی سیڑھیوں پر کیونکہ آواز اُدھر سے ہی آ رہی تھی۔ خاصی دیر بعد سیڑھیوں پر ایک ٹھنگنا سا بوڑھا نمودار ہُوا۔ اُس کی جھکی ہو کمر کے گرد بندھی ہوئی بیلٹ کے ساتھ چابیوں کا ایک وزنی گچھا لٹک رہا تھا۔ شاید وہ اس عمارت کا رکھوالا تھا۔
"سنیورا!" ٹونی نے ہکلاتے ہوئے کہا "ہم غلطی سے یہاں آ گئے ہیں۔ ہم تو یوتھ ہوسٹل....."
"مومنتو" بوڑھے نے ہم دونوں کی دھول میں اَٹی صورتوں اور میلی جیکٹ نیکروں پر ایک نگاہ

ڈالی اور بڑے اطمینان سے آہستہ آہستہ چلتا ہُوا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

موہنتو یعنی ایک لمحہ خاصا طویل ثابت ہُوا۔ آخر کار صدر دروازہ کھُلا۔ پہلے وہ چابیوں والا بوڑھا داخل ہُوا، اور اُس کے پیچھے ایک پستہ قد غلافی آنکھوں والی خوبصورت لڑکی ٹھمکتی چلی آئی۔ ٹونی کی تو باچھیں کھِل گئیں۔

"ہیلو" اُس نے اپنا ہاتھ نیکر کے ساتھ رگڑ کر صاف کیا اور مصافحہ کرنے کی خاطر آگے بڑھا۔

"سینور ؟" لڑکی نے ٹونی کا بڑھا ہُوا ہاتھ نظر انداز کرتے ہوئے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"نورستیکو۔ یوتھ ہوسٹل" مَیں نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"آپ درست جگہ پر آئے ہیں" اُس نے بغل میں سے ایک رجسٹر نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دیا اور نہایت شُستہ انگریزی میں ہم سے مخاطب ہوئی۔ "آپ کے کارڈز ؟"

"اوہ کارڈز ؟" ہم دونوں نے کورس میں جواب دیا۔ ہمارے کارڈ بقیہ سامان کے ساتھ جیپ میں رکھے تھے۔

"مومنتو" مَیں نے لڑکی سے کہا۔

"مومنتو" ٹونی تو کمر تک جھک گیا۔

ہم دونوں باہر آئے تو ٹونی کہنے لگا "ذرا مجھے سُونگھنا"

"کیا مطلب ؟" مَیں نے حیران ہو کر کہا۔

"بس ذرا سُونگھ کر بتانا کہ کیا اب بھی میرے جسم سے گوشت کی بُو آتی ہے جو اس لڑکی نے میرے ساتھ ہاتھ ملانے سے گریز کیا ہے ؟"

"کم از کم گوشت کی بُو تو نہیں آتی" مَیں نے ہنس کر کہا "ویسے ہسپانیہ میں مردوں سے ہاتھ ملانے کا رواج نہیں ہے۔"

"اس کا مطلب ہے پھر کوشش کی جائے۔ لڑکی خوبصورت ہے" اس نے خوش ہو کر کہا۔

"کوشش کرنے سے پیشتر کسی آئینے میں صُورت دیکھ لینا۔ اس بے ہنگم داڑھی میں بالکل چھوٹے سے لطیفے لگتے ہو۔"

"مُولٹان" ٹونی نے دانت نکال دیئیے۔

کارڈ تلاش کرکے ہم بھاگم بھاگ واپس ہال میں پہنچے۔ بوڑھا چوکیدار ہال کے مختلف کونوں میں رکھے لیمپ جلا رہا تھا اور لڑکی سر جھکائے رجسٹر پر کچھ لکھ رہی تھی۔

"کارڈز" ہم دونوں نے اپنے یوتھ ہوسٹل کارڈ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ اس نے رجسٹر پر اندراج کرکے کارڈوں پر مہر لگائی اور گردن ٹیڑھی کرکے کہنے لگی "تیسری منزل پر کسی بھی کمرے میں سو جائیے"

"اور آپ؟" ٹونی نے کمال عجلت سے دریافت کیا۔

"میرے بچّے میرا انتظار کر رہے ہوں گے" لڑکی نے خوش دلی سے جواب دیا۔ ٹونی کا چہرہ لٹک گیا۔

"کیا اِس..... یُوتھ ہوسٹل میں ہمارے علاوہ اور کوئی سیاح مقیم نہیں؟" مَیں نے دریافت کیا۔

"نہیں" اُس نے مُسکرا کر کہا "دراصل یہ عمارت حال میں ہی طب کے طالب علموں کی رہائش کے لیے تعمیر کی گئی۔ گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران میں جب طالب علم اپنے آبائی شہروں اور قصبوں کو لَوٹ جاتے ہیں تو اِسے سیاحوں کے لیے مخصوص کر دیا جاتا ہے۔ ویسے بھی ثوریا جیسے دُور افتادہ شہر میں کبھی کبھار ہی کسی سیّاح کا گذر ہوتا ہے ——— ایک مرتبہ تو کمال ہو گیا.....؟"

"آپ کے بچّے انتظار کر رہے ہوں گے" ٹونی نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"اور خاوند بھی" لڑکی نے شرارت سے کہا "بہرحال آپ کل صبح اپنے کارڈ کارلوس سے وصول کر لیجیے گا میں نہ آ سکوں گی۔ شب بخیر"

اُس نے رجسٹر بغل میں دابا اور دروازہ کھول کر اُسی طرح ٹھمکتی ہوئی باہر نکل گئی۔ بوڑھا کارلوس وہیں ایک صوفے پر بیٹھ کر سگرٹ پینے لگا۔ ہم دونوں باہر آئے۔ جیپ میں سے ضروری سامان نکالا اور پھر اسے پورچ میں کھڑا کرکے تیسری منزل پر چلے آئے۔ یہاں درجنوں کمروں میں سے ایک اپنی شب بسری کے لیے منتخب کیا اور اپنے سلیپنگ بیگ کھول کر بستروں پر

بچھا دیئے۔ ٹونی عمارت کا تفصیلی جائزہ لینے کی خاطر کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں بستر پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ آج صرف ایک دن میں مَیں نے ہسپانیہ کے کتنے رُوپ دیکھ ڈالے۔ صبح میں سان سباسٹیان میں تھا۔ بارش اور دُھند۔ پھر بُلند پیرانیز آئے۔ ہری بھری وادیاں۔ چمکیلے دریا اور برفپوش چوٹیاں۔ اس کے بعد قشتالیہ کی صحرائی وسعتوں میں سے گذر ہُوا۔ گرد آلود سناٹے، اور بیابانی ــــ اور اب ٹوریا۔

"ہُرّے" ایک دم پوری عمارت میں ٹونی کے ڈکرانے کی آواز گُونج گئی "ہُرّے۔ ہُرّے" وہ بے تحاشا چیخ رہا تھا۔ میں کمرے سے باہر آیا اور تیزی سے چلتا ہُوا راہداری کے آخر تک آگیا جہاں سیڑھیوں کے پاس ٹونی حلق پھاڑ پھاڑ کر "ہُرّے ہُرّے" کے نعرے لگا رہا تھا۔

"ارے او ہپ ہپ ہُرّے کے بچے" میں نے غصّے سے کہا۔ خدا کے لئے اس ویران عمارت میں یُوں نہ چیخو۔ مجھے پہلے ہی خوف آ رہا ہے ...... پیٹ میں درد ہے کیا؟"

"ارے مولانا دیکھو تو سہی" اس نے میرے کندھے پر زور سے دھپ لگائی اور ہاتھ پکڑ کر ساتھ والے کمرے میں لے گیا۔ یہ ایک اجتماعی غسل خانہ تھا۔ نہلانے کے شاورز دو چار نہیں۔ درجنوں لگے ہوئے۔ ٹھنڈا پانی۔ گرم ...... وہ غسل خانے کے ایک سرے سے شروع ہُوا اور گرم پانی ٹھنڈا پانی کی گردان کرتا ہُوا شاورز کھولتا گیا۔ گرم پانی سے اُٹھنے والی بھاپ نے پورے غسل خانے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

"ہُرّے" میں نے بھی نعرہ لگایا اور گرم پانی کی اس بارش سے لُطف اندوز ہونے کی خاطر میدان میں کُود پڑا۔ ایک گرد آلود اور گرم دن کی طویل مسافت کے اختتام پر اتنے وسیع پیمانے پر غسل ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کسی طور کم نہ تھا۔ ہم خاصی دیر تک ننھے بچّوں کی مانند شور مچاتے ہاؤ ہُو کرتے وہاں نہاتے رہے۔

غسل سے فارغ ہو کر ہم واپس کمرے میں آگئے۔ قشتالیہ کی دُھول اور گرمی سے نجات پانے کے بعد اب میں بے حد تر و تازہ اور ہلکا پھُلکا محسوس کر رہا تھا۔ ٹونی نے اپنے بیگ میں سے ہنڈ بیجن کا ایک چھوٹا سا پہاڑ برآمد کیا۔ اپنی پیشہ ورانہ مہارت کو بروئے کار لاتے ہوئے

ایک انتہائی باریک ٹکڑا کاٹا اور میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے گوشت کا ٹکڑا ایک کونے سے پکڑ کر اپنی ناک کے آگے لہرایا۔ اس میں سے ڈولنٹن مارکٹ میں واقع بڑے گوشت کی دکانوں میں سے آنے والی ناگوار بُو بدرجہ اُتم اُٹھ رہی تھی۔ تشتالیہ کا گرم موسم اس پر پوری طرح اثر انداز ہو چکا تھا۔

"ٹونی ڈیئر..... یہ ہنٹر بیف افریقہ جا کر کسی مگرمچھ کو کھلا دینا۔ اس میں سے بُو آ رہی ہے۔"

"بُو؟" اس نے گوشت کو اک عالمِ وارفتگی میں ایسے سُونگھا جیسے وہ سڑے ہوئے بیف کے ٹکڑے کی بجائے رُباعیات نامی مہکتا ہُوا گلاب ہو اور پھر پورا منہ کھول کر اپنے دانت اُس میں گاڑھ دیے۔ "مجھے تو نہیں آ رہی" اس کے جبڑے انجن کے پسٹن کی مانند تیزی سے حرکت کرنے لگے۔

"آ بھی نہیں سکتی" میں نے ناک سکیڑ کر کہا "بہر حال میں تو شہر جا کر صاف ستھری اور بھرپور قسم کی خوراک کھانے کے مُوڈ میں ہوں"

تین چار پاؤنڈ ہنٹر بیف نگلنے کے بعد ٹونی نے ایک مرتبہ پھر "ہُرّے" کا نعرہ بلند کر دیا۔

"اب کیا ہُوا ہے؟" میں نے کپڑے بدلتے ہوئے دریافت کیا۔

"آ رہی ہے" باقی ماندہ گوشت پر ناک جماتے ہوئے اُس نے فیصلہ دے دیا۔ "میں بھی تمہارے ہمراہ شہر جاؤں گا" اور پھر بڑی احتیاط سے بیف کو اپنے بیگ میں واپس رکھ لیا۔

"اور یہ گوشت کس سلسلے میں محفوظ کیا جا رہا ہے۔؟"

"افریقہ کے مگرمچھوں کے لیے....." اُس نے منہ کھول کر ایک زوردار قہقہہ داغ دیا۔ "ہو گیا نا ایک چھوٹا سا لطیفہ؟"

"ہو گیا" میں نے مسکرا کر کہا۔ "کم از کم باہر جانے سے پیشتر کوئی مناسب قسم کا لباس تو پہن لو۔"

ٹونی نے میری اس درخواست پر اپنی براؤن نیکر کے ساتھ ایک بوسیدہ سی کالی بنیان بھی پہن لی۔ سر کے بالوں اور داڑھی کو اُنگلیوں سے سنوارا اور اُٹھ کھڑا ہُوا "خوش پوشاکی ہمیشہ سے میری شخصیت کا ایک لازمی جُز رہی ہے۔" اُس نے اپنی بنیان کے ایک سُوراخ

میں اُنگلی چلاتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے اعلان کیا۔

میں نے ٹونی کی خوش پوشاکی سے متاثر ہو کر اُسے اُس حبشی کے بارے میں بتایا جو لنڈن کی کسی گلی میں ننگ دھڑنگ گھوم رہا تھا۔ ایک انگریز بڑھیا نے اُسے اس حالت میں دیکھا، تو ڈانٹ کر کہنے لگی "نوجوان لڑکے تمھیں شرم آنی چاہیے جاؤ کوئی مناسب قسم کا لباس زیبِ تن کر کے آؤ" حبشی نے نہایت برخورداری سے سر ہلایا اور چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس نے اپنے گلے میں ایک نہایت نفیس قسم کی ٹائی باندھ رکھی تھی۔ صرف ٹائی......!

ٹونی بدستور اپنی بنیان کے سوراخ میں بڑی سنجیدگی سے انگلی گھماتا رہا اور پھر شراب کا خالی مشکیزہ بغل میں داب کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اُسے شاید میرا چھوٹا سا لطیفہ بالکل پسند نہیں آیا تھا۔

ثوریا! دو پہاڑوں کے درمیان اور نیلے آسمان تلے پھیلا ہوا ایک سوتا جاگتا شہر جو اپنے گردو نواح کے جغرافیائی خدوخال میں کچھ ایسے رچ بس گیا ہے جیسے اِس کے سرخ چھتوں والے مکان، تنگ گلیاں اور بازار انسانی ہاتھوں کے تعمیر کردہ نہیں بلکہ زمین میں سے خود بخود اُگ آئے ہیں۔ پھوٹ پڑے ہیں! دریائے دویرو اسے ایک کمان کی مانند آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ ثوریا "سان جوان دے دارو" کی مشہور خانقاہ کے پہلو میں سے شروع ہوتا ہے اور پھر پاپلر اور سیاہ اوک کے جھنڈوں میں سے جھانکتا دریائے حدرہ کو عبور کر کے قدیم قلعے کے گرد تنگ و تاریک گلیوں میں گم ہو جاتا ہے۔ اس شہر کی خوبصورتی سے اشبیلیہ کے حسن پرست شاعر انتونیو مچادو کو بھی اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ مچادو نے قشتالیہ کے صوبے کو بدبخت کہا مگر اسی صوبے کے ایک شہر نے اُسے اپنے حُسن میں ڈبو کر اس بدبختی کو خوبصورتی میں بدل دیا۔ وہ لکھتا ہے۔

"خوبصورت اور پاکیزہ ثوریا، بنفشی پہاڑیوں کے درمیان
میں آج ایک مرتبہ پھر
تیری قدیم فصیل کے پہلو میں دریائے حدرہ کے کنارے پاپلر کے سنہری درخت دیکھ رہا ہوں۔
ثوریا سحر زدہ۔ ثوریا تسخیر کر لینے والا"

دریائے حدرہ کے کنارے پاپلر کے درختوں کے درمیان لیٹی ہوئی پُرسکون سڑک محبّادو کی پسندیدہ سیرگاہ تھی۔ آج شب جب ہم ثوریا میں داخل ہوئے تو مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ چھوٹی سی ندی جسے ہم نے عبور کیا تھا تاریخی دریائے دویرو تھا۔ ساڑھے چھ ہزار فٹ بلند از بیان کی پہاڑیوں پر پھیلے ہوئے پائن اور بیچ کے جنگلوں میں سے جنم لے کر یہ دریا ثوریا کو آچھوتا ہے اور پھر بڑی خاموشی سے پورے ہسپانیہ کے سینے پر بہتا ہوا پرتگال میں داخل ہو جاتا ہے

ثوریا بھی ایک زمانے میں ہسپانیہ کے دوسرے تمام شہروں کی طرح مسلمانوں کے زیرنگیں تھا۔ ہسپانوی تاریخ دان روائتی تعصب کی بناء پر ہمیں یہ تو بتاتے ہیں کہ یہ شہر اراگان کے بادشاہ الفانسو نے مسلمانوں سے دوبارہ حاصل کیا مگر مسلمان یہاں کب قابض ہوئے اِس کے بارے میں مُہر بلب ہیں۔ مجھے خود ثوریا مع اسلامی دور کے بارے میں کسی اسلامی تاریخ میں کوئی قابلِ ذکر حوالہ نظر نہیں آیا۔

یُوتھ ہوسٹل سے باہر نکل کر ٹونی اور میں "الامیڈا ڈی سروانٹ" کے ہرے بھرے پارک کے پہلو میں سے نکلتی ہوئی ایک سڑک پاسیلو سان فرانسسکو پر ہو لیے۔ ثوریا نیون اشتہاروں کی تیز روشنیوں، ٹریفک کے بے پناہ شور اور جدید زندگی کی دوسری قباحتوں سے پاک قشتالیہ کے بے آب گیاہ پہاڑوں میں گم، ایک خاموش مگر پُر وقار بستی ہے۔ زندگی سے بھرپور۔ مگر زندگی کی یہ لہر سطحی ہونے کی بجائے اس شہر کے قدیم در و دیوار اور اس کے باسیوں کے اندر چپکے چپکے اُبلتی رہتی ہے۔

ٹونی شاید ابھی تک مجھ سے ناراض تھا۔ وہ نیکر کی جیبوں میں ہاتھ ٹھونسے "جب آئرش آنکھیں مسکراتی ہیں" گنگناتا چلا جا رہا تھا۔ مرکزی چوک عبور کر کے ہم کائے دے کلاڈو کی چوڑی سڑک پر آ گئے جو نسبتاً پُر رونق تھی۔ ہم ایک قہوہ خانے کے پاس سے گذر رہے تھے کہ ٹونی اُس کے باہر دیوار پر لگا ایک بُل فائٹ کا اشتہار دیکھ کر رُک گیا۔ "ہُوں" اُس نے میری طرف دیکھ کر آنکھیں گھمائیں اور پھر اشتہار پر چھپی بُل کی تصویر سے مخاطب ہو کر نہایت سنجیدگی سے کہنے لگا،

"نوجوان بُل تمھیں شرم آنی چاہیے۔ جاؤ کوئی مناسب قسم کا لباس زیبِ تن کر کے آؤ"۔ اس کے ساتھ ہی اُس کے وسیع و عریض ڈیل ڈول میں سے ایک زوردار قہقہہ برآمد ہو گیا۔ قہوہ خانے کے باہر

بیٹھے ہوئے چند بوڑھے ہماری جانب بڑی دلچسپی سے دیکھنے لگے۔

"اور ذرا تصوّر کرو اگر یہ بیل ایک نفیس قسم کی ٹائی باندھ کر آ جائے تو؟ صرف ٹائی......" وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو رہا تھا۔

"ٹونی!" میں نے بزرگوں کی مانند ڈانٹا۔

"سوری" اُس نے فوراً ہتھیار ڈال دیے اور نیکر کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ایک مرتبہ پھر "جب آئرش آنکھیں......" گنگناتا ہُوا چلنے لگا۔ حساب برابر ہو چکا تھا۔

کالئے دے کلاڈو کے دونوں اطراف ثوریا کے پاسی قہوہ خانوں کے باہر فٹ پاتھ پر لگی کرسیوں پر بیٹھے رات کے کھانے سے پیشتر مختلف مشروبات سے معدے گرم کر رہے تھے۔ اطالیہ اور فرانس کی طرح ہسپانیہ میں بھی رات کا کھانا گھر کی بجائے باہر قہوہ خانوں میں کھانے کا رواج عام ہے۔ کھانے کے اوقات دس بجے سے شروع ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے اگر آپ کسی قہوہ خانے میں جا کر کھانے کے بارے میں دریافت کریں تو آپ کو خبطی سمجھا جائے گا۔ رات کے اس پہر سڑک پر ٹریفک بالکل بند تھی۔ چند نوجوان لڑکے اور لڑکیاں سڑک پر ادھر اُدھر بے مقصد گھوم رہے تھے۔ فٹ پاتھ کا جو حصّہ قہوہ خانوں کی کرسیوں سے خالی تھا، وہاں بچے تین پہیوں والی سائیکلوں پر سوار و بیٹر حضرات کی ٹانگوں کو نشانۂ مشق بنا رہے تھے۔ ہم پاس سے گذرتے تو وہ بطورِ خاص ٹونی کو دیکھ کر بے حد محظوظ ہوتے اور گھنٹیاں بجاتے۔ ایک پُر ہجوم قہوہ خانے کے باہر دو موٹی تازی فراخ دہن دوشیزائیں ٹونی کو دیکھتے ہی نہایت بھدّے طریقے سے ہنسنے لگیں۔ اُس کا بھاری تن و توش وہیں پا بند ہو گیا۔ "بس یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔"

"یہاں شور بہت ہے، کسی پُرسکون جگہ بیٹھا جائے" میں نے رکے بغیر جواب دیا۔

"مُولٹان" ٹونی نے جھنجھلا کر کہا اور پھر چلنے لگا۔

"خاسمین۔ خاسمین" ایک بوڑھی عورت گلی کے نکڑ پر کھڑی چنبیلی کے پھول بیچ رہی تھی۔ ہسپانیہ کی اکثر عمر رسیدہ عورتوں کی مانند اس نے سر کو ایک کالے رُومال سے ڈھانپ رکھا تھا، ٹخنوں تک لمبے سیاہ لباس میں ملبوس تھی۔ ہم قریب سے گذرے تو اس نے بڑی شکل سے

جھک کر آگے رکھی ٹوکری میں سے چنبیلی کا ایک گجرا اُٹھایا اور میری جانب بڑھا دیا۔ "خاسمین سنیورہ؟" اس کی پوپلی مسکراہٹ میں بچّوں کی سی معصومیت تھی۔

"گراسیا!" میں نے پانچ پسیتے کا ایک نوٹ جیب میں سے نکال کر بڑھیا کے رعشہ زدہ ہاتھوں میں تھما دیا۔ ہسپانوی چنبیلی کے ان پھولوں میں ایک جانی پہچانی مہک تھی۔ گرم اور مشرقی!

ہم نے گلی کے اندر جھانکا۔ نیم تاریک اور بے ڈھنگ! دونوں اطراف بنے ہوئے مکانوں کے خوشنما چھجے ایک دوسرے کو چھو رہے تھے۔ بائیں ہاتھ پر لوہے کی سلاخ سے ایک زنگ آلود بورڈ لٹک رہا تھا۔ "ال گرےکو"۔ ہم دروازہ کھول کر اندر چلے گئے۔ یہ ایک قدیم طرز کا انتہائی پُرسکون اور دیدہ زیب شراب خانہ تھا۔ کثرتِ استعمال سے اگرچہ قرطبہ کے چمڑے سے بنے ہوئے صوفوں کا رنگ ماند پڑ چکا تھا مگر اُن میں ایک کلاسیکی قسم کی جاذبیت بدستور قائم تھی۔ دیواروں کا پلستر سیاہی مائل تھا۔ بلند چھت کے سیاہ شہتیروں میں لوہے کے بڑے بڑے کنڈے پیوست تھے جن کے ساتھ سالم جانوروں کے دھڑ لٹک رہے تھے۔ مشرقی گرم مسالوں سے محفوظ کردہ سوکھا ہوا گوشت۔ مجموعہ اپنی کریہہ النظرلمبی تھوتھنیوں کے، پورے بکرے، گائے کے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے۔ ان جانوروں کے گوشت کا رنگ شراب خانے کی بقیہ آرائش کی مانند سیاہی مائل تھا۔ چھت کی جانب دیکھنے سے کچھ اس قسم کا تاثر اُبھرتا تھا جیسے مُردہ جانوروں کا یہ ریوڑ آپ پر حملہ آور ہونے کو ہے۔ جانے انھیں کتنے برس پیشتر سکھا کر یہاں لٹکایا گیا تھا۔ جب کبھی کوئی گاہک فرمائش کرتا تو شراب خانے کا پستہ قد مالک ایک سیڑھی شہتیر کے ساتھ لگا کر چھری سے پسندیدہ جانور کے جسم کا مطلوبہ حصّہ کاٹ کر لے آتا۔ یہ گوشت سلاد اور ڈبل روٹی کے ساتھ پیش کیا جاتا۔ کاؤنٹر کے عقب میں شیلف پر لکڑی کے درجنوں ڈرم دھرے تھے جن پر ہسپانیہ کے مختلف صوبوں میں کشید کی جانے والی انگوری شرابوں کے نام کندہ تھے۔ کاتالونیا صوبے کی لاسالو۔ آراگان کی لوزیا۔ گلیسیا کی ریبیرو۔ نوارا کی ٹیوڈلا۔ مُرسیہ کی جمیلہ اور اندلس کی منزانیلا۔ مونتیلا اور شیری وغیرہ۔ ہر ڈرم کے پیندے کے قریب ایک ٹونٹی لگی تھی

جیسے گھاگر تک میں شراب بھر لی جاتی۔ ہسپانیہ کے اکثر شراب خانوں کی طرح یہ جگہ بھی بے حد پُرسکون تھی۔ لالٹینوں کی مدھم روشنی میں چند خوش لباس بوڑھے اور عورتیں چمڑے کے صوفوں پر براجمان شراب نوشی میں مشغول تھے۔ حسبِ معمول اُن کے بچے بھی ہمراہ تھے جن کے لیے دُودھ کا انتظام کیا گیا تھا۔

"لاکومیدا اسینیور؟" ٹونی نے کاؤنٹر پر جا کر مالک سے کھانے کے بارے میں استفسار کیا جو اس وقت ایک ڈرم کی ٹونٹی چمکانے میں مصروف تھا۔

"سی سینیور!" اُس نے سر ہلایا اور کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر ہمیں شراب خانے کے کونے میں واقع ایک تنگ دروازے کے پاس لے گیا۔ "لاکومیدا" اس نے سال خوردہ لکڑی کی درجن بھر سیڑھیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا جو دوسری منزل تک جا رہی تھیں۔ سیڑھیاں طے کر کے ہم اُوپر پہنچے تو اپنے آپ کو کسی ہوٹل کے ڈائننگ روم کی بجائے سیدھے سادھے گھریلو قسم کے کمرے میں پایا جس کے وسط میں ایک میز کے گرد درمیانی عمر کا ایک ہسپانوی، اُس کی پستہ قد بیوی اور گول مٹول لڑکا بیٹھے شاید ہماری ہی راہ تک رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ تینوں اُٹھ کھڑے ہوئے اور بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ ٹونی نے ایک مرتبہ پھر "لاکومیدا" والا مدعا پیٹ پر ہاتھ پھیر کر بیان کیا۔ مرد نے بڑی مستعدی سے میز اور دو کرسیاں کمرے کے باہر بالکونی پر لگا دیں اور کمر تک جھک کر تقریباً کورنش بجا لایا۔ "تشریف رکھئے سینیور!"

یہ بالکونی ایک چھوٹے سے پُررونق چوک کی جانب کھلتی تھی جس کے درمیان میں نصب قدیم وضع کے ایک کھمبے کے لالٹین نما شیڈ میں سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ کھجور کے دو درخت ہماری بالکونی کے پہلو میں سے اُٹھ کر ارد گرد کے مکانوں کی چھتوں سے بھی اُوپر نکل گئے تھے۔ بے شمار لوگ کرسیوں پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ایک چھوٹا سا لڑکا زمین پر آلتی پالتی مارے ایک موٹے بوڑھے کے بوٹ پالش کر رہا تھا۔ بُرش چلاتے چلاتے وہ لمحہ بھر کے لیے رُکتا "اوے" کا ایک زوردار نعرہ بلند کرتا اور پھر سر ہلاتا ہُوا پالش کرنے میں مگن ہو جاتا۔ چند نوجوان سامنے کے مکان کی دیوار پر

چسپاں بُل فائٹ کے پوسٹروں کے سامنے کھڑے بڑے زور شور سے کسی گذشتہ بُل فائٹ کے بارے میں بحث کر رہے تھے۔ اسی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے ایک ہسپانوی عورت بڑے اطمینان سے اپنے بچے کو دودھ بھی پلا رہی تھی اور بُل فائٹ والی بحث میں بھی حسب مقدور حصہ لے رہی تھی۔ اس ہجوم سے الگ تھلگ روشنی کے کھمبے کے نیچے دو نوجوان سر جھکائے گٹار پر کوئی اُداس اور سُست رو دھن چھیڑ رہے تھے..... یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ چھوٹا سا چوک اپنی ذات میں بالکل مکمل ہے۔ روشنی کا ایک قدیم کھمبا۔ کھجور کے دو درخت بُل فائٹ کے پوسٹر، دو نوجوان موسیقار اور اس میں موجود لوگ اپنی اس مختصر دنیا سے اتنے مطمئن کہ انھیں نظریں اٹھا کر ہماری جانب دیکھنا بھی گوارا نہیں۔

"مینو توریسٹیکا سینیور!" قہوہ خانے کے مالک کے لڑکے نے ہسپانوی حکومت کی جانب سے خصوصی طور پر غیر ملکی سیاحوں کے لئے منظور شدہ کھانے کی فہرست ہمارے آگے رکھ دی۔ "مینو توریسٹیکا" میں درج شدہ کھانے روایتی ہونے کے علاوہ ارزاں بھی ہوتے ہیں چالیس پسیتے یعنی تقریباً چھ روپے میں سُوپ کا پیالہ، خوراک کی ایک پلیٹ، سویٹ ڈش، انگوروں کی سُرخ شراب کا ایک مگ اور کافی۔ ٹونی توریا کے باشندوں کی مرغوب خوراک بُھنا ہوا کیکڑا کھانا چاہتا تھا اور میں تندور میں دم پخت کی گئی ٹراؤٹ مچھلی۔ ہماری پسند معلوم کرنے کے بعد دونوں میاں بیوی باورچی خانے میں جا کر کھانے کی تیاری میں مصروف ہو گئے اور ان کے لڑکے نے میز پر ایک صاف ستھرا کپڑا بچھا کر اس پر بڑے قرینے سے چھری کانٹے اور چٹنیوں کے پیالے سجا دیئے۔ کھانے کی تیاری کے دوران میں ہم خستہ ڈبل روٹی پر توریا کا مشہور اور مزے دار مکھن لگا کر کھاتے رہے اور اپنی بھوک چمکاتے رہے۔ پہلے کچے ٹماٹروں اور کالی مرچ سے تیار شدہ "گازپاچو" نامی ٹھنڈا سُوپ آیا پھر ٹونی کے سُرخ کیکڑے کا ورود ہوا جس کی لاتعداد پتلی پتلی ٹانگیں پلیٹ سے باہر رینگ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی چھلانگ لگا کر ٹونی کی داڑھی میں جا گھسے گا۔ میری ٹراؤٹ مچھلی بھی سالم تھی مگر کانٹا چبھونے سے چھوٹے چھوٹے خستہ ٹکڑوں میں بکھر گئی۔ کھانے کے بعد کافی آ گئی اور ہم کرسیوں پر دراز ہو کر نیچے چوک میں بجنے والی گٹاروں کی موسیقی سے لطف اندوز ہونے لگے۔

نوجوان موسیقار پاپ موسیقی بجانے والوں کی مانند اپنی گٹار کے تاروں کو بے رحمی سے جھنجھوڑنے کی بجائے انھیں نہایت نرمی سے ہلکے ہلکے چھو رہے تھے۔ دُھن قدرے شوخ ہوتی تو بھی چھیڑ چھاڑ میں پیار کا عنصر ہی غالب رہتا۔ "فلیمنکو" کی یہ روایتی دُھن گٹار پر بجانے کے علاوہ گائی بھی جاتی ہے۔ مالاگوئینا اور رنڈ نگوس بھی اسی موسیقی کی شاخیں ہیں۔ اگرچہ یہ نوجوان صرف اپنی تفریح کی خاطر گٹاریں بجا رہے تھے مگر جب کبھی اُن کی دھن میں کوئی خصوصی لَے اُبھرتی تو چوک میں بیٹھے لوگ نعرہ ہائے "اولے اولے" بلند کرکے انھیں داد سے نوازتے، ہوا کے لطیف جھونکوں سے کھجور کے پتّے آہستگی سے حرکت کرتے اور ان کے متحرک سائے بے فکر بوڑھوں اور زندہ دل نوجوانوں کے چہروں پر کھیلنے لگتے۔

نصف شب کے قریب چوک خالی ہونا شروع ہو گیا۔ نوجوان موسیقاروں میں سے ایک نے کلائی پر بندھی گھڑی پر ایک نظر ڈالی اور پھر چپکے سے اپنے ساتھی کے کان میں کچھ کہا۔ دونوں مسکرائے اور پھر گٹاریں کاندھوں پر ڈال کر چوک سے باہر بڑی سڑک کی جانب چل دیئے۔

"شراب نہایت عمدہ تھی" ٹونی نے تقریباً اونگھتے ہوئے کہا "یار ایک سگریٹ تو پلاؤ۔"

"باہر چل کر پیتے ہیں۔" میں نے میز پر سے چنبیلی کا گجرا اُٹھاتے ہوئے کہا۔ اپنے اپنے حصے کا بل ادا کرنے کے بعد ہم سیڑھیاں اُتر کر نیچے شراب خانے میں آ گئے۔

"مَزتیلا" ٹونی نے اپنا پچکا ہوا مشکیزہ کاؤنٹر پر رکھ کر اپنی پسندیدہ شراب کے ڈرم کی جانب اشارہ کیا۔ مالک نے مشکیزے کا منہ ٹونٹی پر کسا اور پھر اسے لبالب بھر کر ٹونی کے حوالے کر دیا۔ "پچاس پسیتے"۔ قیمت ادا کرنے کے بعد اس نے مشکیزے کا خمار آور بوجھ کاندھے پر لادا اور ہم دونوں شراب خانے سے باہر آ گئے۔ گلی کے نکڑ پر چنبیلی کے گجرے بیچنے والی بڑھیا اب سر جھکائے اپنی ہتھیلی پر پھیلے سکّے گننے میں مصروف تھی۔ پھولوں کی ٹوکری خالی ہو چکی تھی ہم گلی سے نکل کر ایک مرتبہ پھر کالے دُ سے گلاڈو کی بڑی سڑک پر آ نکلے۔

"کرائسٹ!" ٹونی کا چہرہ یوں متغیر ہوا جیسے اس پر مرگی کا دورہ پڑنے والا ہو،

"بلائی مستنصر" اس نے چیخ کر کہا "بھئی لڑکیاں ! ہائے ہائے !"

ٹونی درست کہہ رہا تھا۔ ہم لاتعداد لڑکیوں کے نرغے میں تھے۔ ہمارے چار سُو کالئے وِسے کلاڈو کی سڑک پر لڑکیوں کا ایک ہجوم خراماں خراماں شائد معطر معطر بھی چلا آ رہا تھا چلا جا رہا تھا۔

"ہے تورو" ایک پستہ قد موٹی ہسپانوی لڑکی نے ٹونی کی کمر میں اپنے پنکھے کی ڈنڈی گھونپتے ہوئے غصّے سے کہا "شرم نہیں آتی پاسیو کے آداب کی خلاف ورزی کرتے ہوئے؟ دوسری جانب چلو۔ لڑکوں کے ساتھ !"

"شکریہ سینیوریتا" ٹونی جھک کر آداب بجالایا "اگر میں "تورو" یعنی بُل ہوں تو کیا میں آپ پر حملہ آور ہو جاؤں ؟"

موٹی خاتون نے ہسپانوی میں جو کچھ بھی جواب دیا وہ ہماری سمجھ سے بالاتر تھا۔ البتہ لہجے سے محسوس ہو گیا کہ "فِتے منہ" قسم کا لفظ ادا ہوا ہے۔ سڑک کے نصف حصّے میں نوجوان لڑکیاں دو دو تین تین کی ٹولیوں میں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے بڑے طمطراق سے چل رہی تھیں۔ دوسری جانب لڑکوں کے گروہ رواں دواں تھے۔ مگر ان کا رُخ مخالف سمت میں تھا۔ مری کی مال روڈ کی طرح یہاں بھی ٹریفک دو حصّوں میں منقسم تھی۔ لڑکیاں دھیرے دھیرے سڑک کے آخر میں واقع چوک تک پہنچتیں اور پھر فوجی انداز میں ایکدم گھوم کر واپس ہو جاتیں۔ اُدھر لڑکے بھی سڑک کے مخالف سرے پر پہنچ کر اباؤٹ ٹرن ہو جاتے اور یہ پریڈ یونہی جاری رہتی۔ پریڈ یعنی "پاسیو"۔

"شام کا پاسیو" ہسپانیہ کی ایک خوبصورت اور رُومانی رسم ہے جو اب آہستہ آہستہ بڑے شہروں میں جدید زندگی کی گہما گہمی سے خوف زدہ ہو کر دُور افتادہ قصبوں اور چھوٹے شہروں میں سمٹ رہی ہے۔ "پاسیو" کا لفظ بُل فائٹ کے آغاز میں بُل فائٹر اور اس کے معاونین پریڈ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مگر شام کے پاسیو میں صرف پریڈ کی قدر مشترک ہوتی ہے۔ جہاں بُل فائٹ میں مدِمقابل کو زیر کرنے کے لیے نیزے اور تلوار کی کاٹ کام آتی ہے وہاں "شام کے پاسیو" میں جیتنے کے لیے حُسن کی شوخیاں بھرپور وار کرتی ہیں۔ اُدھر نیزے کی انی جسم میں

پیوست ہو کر کام تمام کرتی ہے اور ادھر اس دیس میں جہاں چشم غزال عام ہے اب بھی نگاہوں کے تیر ہی دل نشیں ہوتے ہیں۔ ایک میدان میں بُل فائٹر کا مقدر لازمی جیت ہوتا ہے اور بُل کی قسمت میں ہمیشہ سرنگوں ہونا۔ اور اس سڑک پر "پاسیو" میں دونوں فریق ہار جیت سے بے نیاز صرف گھائل ہونے کے لئے ہی حصہ لیتے ہیں۔ "پاسیو" کی رسم کا آغاز عربوں کے زمانے میں ہُوا، اور اسی لیے آج بھی اس میں مشرقی حجاب کی خوشبو ہے۔ ہسپانیہ کے صوبے VEJER کی عورتیں اسی مشرقی حُسن کی بنا پر اپنا چہرہ رُومال سے ڈھانپ کر گھر سے باہر نکلتی ہیں سینکڑوں برس گذرنے کے باوجود وہ اپنے عرب ماضی کی ایک روایت کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ وہ پردہ کرتی ہیں۔

ہسپانیہ میں شادی کے رسم و رواج کچھ کچھ ہمارے ملک کے ساتھ لگّا کھاتے ہیں شادی سے پیشتر آزادانہ میل ملاپ گناہِ کبیرہ سمجھا جاتا ہے۔ بہر حال اگر والدین کی رضا شامل ہو تو ایک مختصر سی کورٹ شپ کی اجازت مل جاتی ہے جو ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق سرانجام پاتی ہے۔ مثلاً لڑکا کلیسا میں عبادت کرتے وقت لاٹ پادری کا "تم سب یسوع کی بھیڑیں ہو" والا وعظ سننے کی بجائے اپنی پسندیدہ لڑکی کو گھور سکتا ہے۔ محبوبہ کی بالکونی کے نیچے سے گذر ہو تو ایک آدھ آہ بھرنے پر بھی کوئی پابندی نہیں۔ نوجوان اگر شادی پر مائل ہو تو سینما جانے کی اجازت بھی مل سکتی ہے۔ شو کے دوران میں وہ رواج کے مطابق اپنی محبوبہ کا ہاتھ پورے تین منٹ کے لئے تھام سکتا ہے۔ میرے خیال میں اگر تین منٹ سے زیادہ کا عرصہ ہو جائے تو لڑکی اُسے اپنی بے عزتی سمجھتی ہو گی اور اپنا ہاتھ نہیں چھڑاتی ہو گی۔ ان کٹھن رُومانی مرحلوں کے درمیان چند متعینہ عشقیہ تقاریر بھی ہوتی ہیں، جو صدیوں سے کسی ردّ و بدل کے بغیر رائج ہیں۔ ان میں ذرّہ بھر تحریف لڑکے کو عمر بھر کنوارہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ مثلاً وہ جذباتی ہو کر یہ تو کہہ سکتا ہے کہ "کنول کے پھول مجھے بے حد اچھے لگتے ہیں اور آپ بھی ......" لیکن اگر وہ بلا تکلف "ہائے تم مجھے پیاری لگتی ہو" پر اُتر آئے تو کشیدگی بڑھنے کا امکان ہوتا ہے۔ ہسپانیہ میں اگر آپ کسی لڑکی کو باہر لے جانا چاہیں (باہر لے جانے سے مراد سینما وغیرہ دکھانا ہے بھگا کر لے جانا ہرگز نہیں) تو آپ کو

بہر صورت مندرجہ بالا قوانین کی پابندی کرنا ہو گی۔ اگر نہیں کریں گے تو آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ دنیا کا بہترین پستول "لاما" ہسپانیہ میں ہی بنتا ہے۔ دنیا کے اکثر ملکوں کی طرح بڑے شہروں میں رہنے والی بیبیاں خاصی آزاد خیال واقع ہوئی ہیں مگر دُور افتادہ دیہات اور ثوریا جیسے چھوٹے شہروں میں ابھی تک از منۂ وسطیٰ کی ذہنیت کا راج ہے۔ ایسی جگہوں پر میل ملاپ کے لیے پاسیلو کی رسم کا سہارا لیا جاتا ہے۔ ہفتے میں ایک شب اس کارِ خیر کے لیے مخصوص کر دی جاتی ہے۔ رات کے کھانے فارغ ہو کر والدین قہوہ خانوں کے باہر فٹ پاتھ پر بچھی کرسیوں پر بیٹھ کر کافی یا شراب سے دل بہلاتے ہیں اور ان کے چھینے اور چھینیاں قسمت آزمائی کے لیے سڑک پر مٹرگشت شروع کر دیتے ہیں۔ بائیں جانب لڑکوں کے غول کے غول شام کے بہترین لباسوں میں نکھرے مسکراتے آنکھیں گھماتے چلے جا رہے ہیں اور دوسری طرف قصبے کی کنواری لڑکیاں آپس میں چہلیں کرتیں "آنکھیں بائیں" کے فوجی اصول پر عمل پیرا لہک لہک کر چل رہی ہیں۔ پوری مخلوق میں سے ایک زہرہ جبیں کا انتخاب ہو رہا ہے۔ آپس میں مشورے ہو رہے ہیں لیکن یہ نظارہ صرف دُور دُور سے کیا جا سکتا ہے، پاس آئیے گا تو کرسیوں پر براجمان خواتین کے والدین آپ کے خلاف فاؤل دے کر میدان سے باہر نکال دیں گے۔ حسینوں کی اس پریڈ میں اگر آپ کو کوئی خاتون بھلی لگے اور وہ بھی آپ کے قریب سے گذرتے وقت اِک شانِ دلربائی سے بالوں میں لگا پھول اُتار کر سونگھنا شروع کر دے تو پھر آپ پر لازم ہے کہ دوسری شب گٹار کاندھے پر ڈالے پھولوں کا گلدستہ ہاتھ میں تھامے اُن محترمہ کی بالکونی تلے کھڑے ہو کر "مورشے میو" قسم کا گانا گائیں۔ لڑکی کو آپ کا گانا اور اس کے والدین کو آپ کا گلدستہ پسند آجائے تو آپ کو گھر کے اندر بُلا لیا جائے گا۔ ذریعۂ معاش، تعلیم اور خاندان کے مکمل کوائف دریافت کرنے کے بعد آپ کو مطلع کیا جائے گا کہ برخوردار کل اپنی اماں کو ہمارے گھر بھیج دینا یا پھر دوسری صورت میں "خبردار جو آئندہ ہماری لڑکی کو۔۔۔۔" وغیرہ۔

پاسیلو کی ایک لطیف روایت یہ بھی ہے کہ قصبے کی تمام لڑکیاں سڑک پر ہونے والی پریڈ میں شریک نہیں ہوتیں بلکہ ان میں سے نسبتاً شرمیلی خواتین ارد گرد کے مکانوں کی بالکونیوں پر سج بن کر

براجمان ہو جاتی ہیں۔ ان بالکونیوں کے آگے کسی ایک رنگ کا ریشمی کپڑا لٹکا دیا جاتا ہے سیلا خیل سے اُسی رنگ کی دیدہ زیب جھنڈیاں اور ربنیتے بندھے ہوتے ہیں۔ پیدل چلنے والی خواتین تو اشاروں کنایوں میں اپنا مدعا بیان کر لیتی ہیں، یا پھر وہ سر میں لگا چمبیلی کا پھول بھی اس کام آتا ہے مگر بالکونیوں میں بیٹھی ہوئی خواتین اپنی پسند کا اظہار بالکل مختلف اور انوکھے طریقے سے کرتی ہیں۔ ان کے پاس کاغذ کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے گیند ہوتے ہیں جن کے ساتھ تقریباً دو گز لمبے دو تین پتلے کاغذ کے فیتے چپکے ہوتے ہیں۔ ان فیتوں کا رنگ وہی ہوگا جو بالکونی سے لٹکتے والے کپڑے اور جھنڈیوں کا ہوتا ہے۔ ادھر نگہہ انتخاب کسی خوش قسمت پر ٹھہری اور ادھر اس شرمیلی بی بی نے بالکونی سے جھک کر ایک عدد گیند تاک کر دے مارا۔ گیند کے درمیان میں ایک ابھری ہوئی چھوٹی سی پن لڑکے کے لباس میں اٹک جاتی ہے اور وہ س کے پیچھے لہراتے ہوئے فیتوں کا رنگ دیکھ کر جان جاتا ہے کہ جان جاں کس بالکونی تشریف فرما ہے۔

بہر حال اس وقت میں ایک جھینپا نما انگریز کے ساتھ ثوریا کی کالئے دستے کا ڈور پر ٹا تھا اور ہمارے گرد خوبصورت پاسیو جاری تھا۔ ٹونی ابھی تک موٹی لڑکی کے عطا کردہ ب "ہے تورو" پر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ "بُل فائٹر کی بچی" وہ بار بار بڑبڑاتا۔ ہم ونوں ایک ہی جگہ پر کھڑے بیوقوفوں کی طرح دائیں بائیں اور اوپر بالکونیوں کی جانب ٹھیں گھما رہے تھے کہ فٹ پاتھ پر ایک کرسی پہ بیٹھا ہوا بوڑھا اُٹھ کر ہمارے پاس آ "سینور آپ شاید غیر ملکی ہیں" اس نے ملائمت سے کہا "اگر آپ پاسیو میں شامل ہونا ہتے ہوں تو براہِ مہربانی لڑکوں کے حصے کی طرف چلے جائیے۔ یوں لڑکیوں کے بیچ ے ہونا خلافِ آداب ہے۔"

"ضرور۔ ضرور" ٹونی نے مرعوب ہو کر کہا اور ہم دونوں دوسری جانب جا کر پاسیو یعنی ریڈ میں شامل ہو گئے۔ اکثر لوگ ٹونی کو بے حد دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ پستہ قد ہسپانویوں کے رمیان وہ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے بونوں کی دنیا میں کوئی باریش دیو گھس آیا ہو۔ ہ بے حد تیز چل رہا تھا۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ٹونی میرے بھائی ذرا آہستہ..... اطمینان سے۔ ہمیں کونسا گاڑی پکڑنی ہے۔ ہر لڑکی کو گھورنے کی بجائے صرف ایک کو منتخب کرو اور اس پر نگاہیں مرکوز رکھو!"

ہسپانوی سینورتیا! گرمیوں کے ہلکے پھلکے شوخ لباس میں ملبوس۔ شانوں پر سفید یا کالی شال۔ کالے بھورے بالوں میں چمبیلی کے پھول۔ ہونٹوں سے دبی دبی ہنسی پھوٹتی ہوئی، اُس کا زندہ جسم لباس کی موجودگی سے بے نیاز۔ علیحدہ اور متناسب۔ حرکت کرتا ہوا! انتخاب ہو رہا تھا۔ جو یہ مرحلے طے کر چکی تھیں اُنھوں نے اپنی مسکراہٹیں بھی مخصوص کر دی تھیں۔ وہ چلیتیں تو اُن کی گردن دھیرے دھیرے ایک خاص زاویے سے مڑتی رہتی نگاہیں اپنے پسندیدہ لڑکے پر مرکوز! ادھر وہ خوش قسمت سینور بھی دنیا و مافیہا سے بے خبر بلکہ دوسری لڑکیوں کی موجودگی سے بے خبر اسی پر نظریں جمائے انیچیوں کی طرح چلتا رہتا۔ اگرچہ درمیانی حدِّ فاصل عبور کرنا پاسیو کے آداب کے خلاف ہے مگر پھر بھی ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ وہ اس غیر مرئی لکیر کے قریب تر ہو کر چلے تاکہ جونہی اس کی منزلِ مراد چلتی ہوئی نزدیک آئے سلسلۂ راز و نیاز شروع کیا جا سکے۔ پاس آتے ہی دونوں جانب سے کھسر پھسر کا آغاز ہو جاتا۔ لڑکی مائلِ کرم ہوتی تو بالوں سے پھول اتار کر سونگھتی اور مسکرا دیتی ورنہ صرف خوبصورت ناک کو سکیڑنے سے ہی "دفع دور" کا مطلب واضح کر دیا جاتا۔

ہم ایک سجی سجائی بالکونی کے نیچے سے گذرے تو اوپر سے تین چار گیند آئے اور میری قمیض میں اٹک گئے۔ بالکونی کا رنگ نیلا تھا اور گیندوں کے پیچھے لہرانے والے لمبے فیتے بھی نیلے تھے۔ میں نے اوپر دیکھا چار حسین چہرے ہسپانوی پنکھوں کی آڑ میں صرف آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ ہنستی ہوئی شرارت سے بھرپور! دوسری بالکونی کے نیچے بھی اسی قسم کی بارش کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں کا رنگ سُرخ تھا...... پھر سبز آیا۔ گیندوں کے پن مجھے چبھ رہے تھے اور ان سے چپکے مختلف رنگوں کے فیتے میرے پیچھے کسی اصیل مرغ کی دُم کی مانند لہرا رہے تھے۔ میں نے ایک ایک کرکے انھیں قمیض سے علیحدہ کیا اور انھیں فٹ پاتھ پر پھینک دیا۔

"بیوقوف" میرے قریب چلتے ہوئے ایک لڑکے نے بے حد غصے سے کہا اور پھر جھک کر گیند سمیٹنے لگا۔

اس وقت تو مجھے اس بدکلامی پر بے حد تعجب ہُوا مگر کچھ عرصہ بعد جب میں نے اس واقعہ کا ذکر میڈرڈ میں ایک دوست سے کیا تو اس نے ہنستے ہوئے مجھے بتایا کہ ان گیندوں کو یُوں پھینک کر میں نے یقیناً بے وقوفی ہی کا ثبوت دیا تھا۔ بالکونی میں بیٹھی ہوئی کوئی بھی لڑکی جب کسی لڑکے پر پھولوں والا گیند پھینکتی ہے تو یہ اس تمنا کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ پاسیو کے اختتام پر قمیص کے رنگ کو دیکھ کر اسی رنگ کی بالکونی ڈھونڈے اور اوپر جا کر گیند پھینکنے والی خاتون کا شکریہ ادا کرے۔ شکریے کے بعد بات آگے بھی بڑھائی جا سکتی ہے۔ کسی لڑکے پر پھینکے جانے والے گیندوں کی تعداد سے اس کی مقبولیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

"مستنصر ڈیئر وہ پونچھ ہوسٹل والی لڑکی بھی یہیں کہیں ہوگی۔؟" ٹونی نے ایک دم خوش ہو کر پوچھا۔

"ٹونی ڈیئر پاسیو میں صرف غیر شادی شدہ لڑکیاں ہی حصہ لے سکتی ہیں۔ فی الحال تم اُس موٹی لڑکی کا خیال کرو جو پچھلے دس منٹ سے تمہیں گھور رہی ہے۔ ہو گیا نا چھوٹا سا لطیفہ؟"

"وہ بُل فائٹر کی بچی" ٹونی نے منہ بنا کر کہا "شکل سے پارک شائر کی گائے لگتی ہے۔"

پاسیو میں شامل لڑکے اور لڑکیاں اپنے بہترین لباسوں میں ملبوس تھے اور ادھر ٹونی صرف نیکر اور بنیان میں کسی سیارے کی مخلوق لگ رہا تھا۔ اتنی بے شمار نرم و نازک لڑکیوں کی قربت سے اس کا دماغ چل گیا تھا۔ وہ دائیں طرف دیکھتا، کھی کھی کر کے ہنستا۔ بائیں جانب نگاہ دوڑاتا تو اس کی آنکھیں اُبلنے کو آتیں۔ اُوپر نظر ڈالتا تو گردن اکڑ کے رہ جاتی۔ وہ یوں منہ اُٹھائے گھوم رہا تھا جیسے کوئی اڑنا بھینسا چینی کے نازک ظروف کی دکان میں آ گھسا ہو۔

"اوہ لالا" ٹونی کی نظر ایک انتہائی خوبصورت لڑکی پر پڑی اور اس نے منہ میں اُنگلیاں گھسیڑ کر سیٹی بجا دی۔ ہمارے آگے چلنے والے چند لڑکوں نے ایک دم مڑ کر ٹونی کو گھورا اور پھر اُس کے تن و توش کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے کچھ کہے بغیر دوبارہ چلنے لگے۔

"ٹونی ڈیئر کیوں رنگ میں بھنگ ڈالتے ہو۔" میں نے ناگواری سے کہا۔

"سوری" اُس نے کندھے سکیڑ دیئے۔

میں ایک منجھے ہوئے سیاح کی مانند پاسیو میں شامل لڑکیوں کا جائزہ لے رہا تھا۔

اس وقت تو مجھے اس بدکلامی پر بے حد تعجب ہُوا مگر کچھ عرصہ بعد جب میں نے اس واقعہ کا ذکر میڈرڈ میں ایک دوست سے کیا تو اس نے ہنستے ہوئے مجھے بتایا کہ ان گیندوں کو یُوں پھینک کر میں نے یقیناً بے وقوفی ہی کا ثبوت دیا تھا۔ بالکونی میں بیٹھی ہوئی کوئی بھی لڑکی جب کسی لڑکے پر نیبتوں والا گیند پھینکتی ہے تو یہ اس تمنّا کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ پاسیو کے اختتام پر نیبتوں کے رنگ کو دیکھ کر اسی رنگ کی بالکونی ڈھونڈے اور اوپر جا کر گیند پھینکنے والی خاتون کا شکریہ ادا کرے۔ شکریے کے بعد بات آگے بھی بڑھائی جا سکتی ہے۔ کسی لڑکے پر پھینکے جانے والے گیندوں کی تعداد سے اس کی مقبولیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

"مستنصر ڈیئر وہ یوتھ ہوسٹل والی لڑکی بھی یہیں کہیں ہو گی۔؟" ٹونی نے ایک دم خوش ہو کر پوچھا۔

"ٹونی ڈیئر پاسیو میں صرف غیر شادی شدہ لڑکیاں ہی حصہ لے سکتی ہیں۔ فی الحال تم اُس موٹی لڑکی کا خیال کرو جو پچھلے دس منٹ سے تمہیں گھور رہی ہے۔ ہو گیا نا چھوٹا سا لطیفہ؟"

"وہ بُل فائٹر کی بچی" ٹونی نے منہ بنا کر کہا "شکل سے پارک شائر کی گائے لگتی ہے۔"

پاسیو میں شامل لڑکے اور لڑکیاں اپنے بہترین لباسوں میں ملبوس تھے اور ادھر ٹونی صرف نیکر اور بنیان میں کسی سیارے کی مخلوق لگ رہا تھا۔ اتنی بے شمار نرم و نازک لڑکیوں کی قربت سے اس کا دماغ چل گیا تھا۔ وہ دائیں طرف دیکھتا، کھی کھی کر کے ہنستا۔ بائیں جانب نگاہ دوڑاتا تو اس کی آنکھیں اُبلنے کو آتیں۔ اُوپر نظر اُٹھاتا تو گردن اکڑ کے رہ جاتی۔ وہ یوں منہ اُٹھائے گھوم رہا تھا جیسے کوئی ارنا بھینسا چینی کے نازک ظروف کی دکان میں آگھسا ہو۔

"اوہ لالا" ٹونی کی نظر ایک انتہائی خوبصورت لڑکی پر پڑی اور اس نے منہ میں اُنگلیاں گھسیڑ کر سیٹی بجا دی۔ ہمارے آگے چلنے والے چند لڑکوں نے ایک دم مڑ کر ٹونی کو گھورا اور پھر اُس کے تن و توش کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے کچھ کہے بغیر دوبارہ چلنے لگے۔

"ٹونی ڈیئر کیوں رنگ میں بھنگ ڈالتے ہو۔" میں نے ناگواری سے کہا۔

"سوری" اُس نے کندھے سکیڑ دیئے۔

مَیں ایک منجھے ہوئے سیاح کی مانند پاسیو میں شامل لڑکیوں کا جائزہ لے رہا تھا۔

ان کے نقش و نگار سراسر مشرقی ہیں...... قد نسبتاً چھوٹے...... رنگت کھلتی ہوئی آنکھیں سیاہ یا مجُوری صحت مند۔ چال پُر وقار۔ پاؤں بے حد نازک.....اور ہونے بھی چاہئیں۔ مصنف اڈیورڈ ہٹن ایک مکمل عورت کی تعریف کچھ یوں کرتا ہے کہ وہ گردن تک انگریز ہو۔ کمر تک فرانسیسی۔ اُس سے نیچے ولندیزی اور اس کے پاؤں ہسپانوی ہٹن نے ہسپانوی عورت کو ایک اور خصوصیت سے بھی نوازا ہے۔ میں فی الحال اس خاصیت کے بارے میں حتمی فیصلہ دینے کے قابل نہیں ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ انگریز عورت چائے بناتے وقت۔ فرانسیسی عورت رقص کرتی ہوئی، ولندیزی باورچی خانے میں، اطالوی کھڑکی میں اور ہسپانوی بستر میں.... بے حد خوبصورت لگتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب!

میں یونہی بے دھیانی سے آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ پاسیلو کے روحانی ماحول میں کھویا ہُوا۔ دبی دبی ہنسی، نازک قدموں کی چاپ، حسین چہرے ایک فلم کی مانند گذرتے رہے اور پھر ایک لڑکی..... پُرکشش انداز میں چلتی ہوئی۔ شانوں پر سفید شال۔ بالوں کے جوڑے میں چنبیلی کے شگوفے سجے ہوئے۔ سنجیدہ اور اُداس۔ آنکھیں کالی بھور...... مجھ پر! قدیم کھمبوں کی ناکافی روشنی میں اس کا تصویر چہرہ۔ قدیم اور پُراسرار۔ انجانے احساسات کی آماجگاہ.... وہ گذر گئی! میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا..... وہ مُڑ مُڑ کر مجھے دیکھ رہی تھی..... پاسیلو جاری تھا۔ میں ثوریا میں تھا۔ ثوریا جو صرف چند گھنٹے پیشتر میرے لیے ایک اجنبی شہر تھا۔ جس کے نسوانیت سے بھرپور نام سے میں اب تک ناآشنا تھا۔ ثوریا ثریا بھی ہو سکتا تھا... جس کے وجود سے میں بے خبر تھا۔ میرے لئے ثوریا کہیں بھی ہو سکتا تھا..... افریقہ، ایشیا کہیں بھی لیکن وہ تو ہسپانیہ کے صوبے قشتالیہ میں بنفشی پہاڑیوں کے درمیان آباد تھا۔ صدیوں سے۔ اس اجنبی شہر کی یہ شام جسے   نے "ثوریا کی پُراسرار شام کہا تھا مجھے یہاں کھینچ لائی تھی۔ یا پھر ثوریا اور اس کی یہ شام دونوں غیر اہم تھے۔ صرف وہ قدیم اور پُراسرار چہرہ میری آمد کا ہمیشہ سے منتظر تھا۔ میں نے نظر اُٹھا کر دیکھا۔ اُسے تلاش کرنا چنداں دُشوار نہ تھا۔ وہ سب سے ممتاز نظر آ رہی تھی..... سفید شال لپیٹے خاموش آنکھوں والی لڑکی۔ اُس کے نوجوان چہرے پر اُمید اور مایوسی کی پرچھائیاں تھیں، وہ میرے قریب سے گذرتی تو آنکھیں جھکا لیتی...... میں پیچھے مُڑ کر دیکھتا تو اُس کی لمبی پلکیں بھوؤں کو چھُو

رہی ہوتیں۔ٹھنڈی آگ کی آماجگاہ۔اُداس آنکھیں.....پاسیلو جاری رہا اور وقت گذرتا رہا۔ شاید صدیاں بیت گئیں۔

ثوریا کی شب بھیگ رہی تھی۔کالئے دے کلاڈو کے سوا تمام گلی کوچوں کی روشنیاں ایک ایک کرکے بجھتی چلی جا رہی تھیں۔وہ میرے قریب پہنچی تو اُس کے قدم رُک گئے۔اُس کی خوابیدہ آنکھیں مجھ پر تھیں جیسے کہہ رہی ہوں کہ اے اجنبی تم آج کی شب ثوریا میں کیوں چلے آئے؟.....تم نے اپنی منزل پر پہنچنے کے لیے کسی اور راستے کا تعین کیوں نہ کرلیا؟ اُس نے اپنی گردن میں ہلکا سا خم دے کر بالوں میں سے چمبیلی کا ایک شگوفہ اُتارا، اُسے اپنے لبوں سے چھُوا، اور پھر سر جھکا کر چلی گئی........چمبیلی کا شگوفہ وہیں سڑک پر پڑا تھا اور پاسیو میں حصّہ لینے والی لڑکیاں اُسے رَوندتی ہوئی چلی جا رہی تھیں.....ایک مختصر چاہت! آغاز کے بغیر ایک اُداس انجام۔

ہم ہوسٹل واپس آ رہے تھے تو پاسیلو کی خوشبو میرے بدن میں رچی ہوئی تھی۔دبی دبی ہنسی اور سلیپروں قدموں کی چاپ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ہمارے چہرے اس انوکھے اور خوبصورت تجربے کی شدت سے دَمک رہے تھے۔سیاحت تو دیوانگی ہے، مگر ثوریا کو چھوڑ کر چلے جانا بھی تو دیوانگی تھی۔مجھے کل صبح ثوریا چھوڑ کر چلے جانا تھا۔کل! اور آج...؟ آج مَیں نے قشتالیہ کے اِن دُور دراز ریگزاروں کے درمیان کوہستانی راستوں اور اجنبی گھاٹیوں میں گھِرے اِس شہر ثوریا میں ایک لڑکی کو دیکھا تھا۔وہ سفید شال میں لپٹی، بالوں میں چمبیلی کے پھُول سجائے اپنے راستے پر چلتی گئی۔جانے کون؟ اُسے شاید کبھی خیال بھی نہ آئے گا کہ ایک مرتبہ ایک گمنام غیر ملکی ثوریا کی پُراسرار شام میں اُس کی آنکھوں میں سے نکلنے والی اُداس کالی شعاعوں کی زد میں آیا تھا۔جانے وہ کہاں رہتی ہوگی......اُس کا پس منظر کیا ہوگا۔جُوں جُوں میں کالئے دے کلاڈو سے دُور ہوتا گیا، وہ لڑکی ایک زندہ تجربے کی بجائے ایک واہمے، ایک خواب کا رُوپ دھارتی گئی....ابھی سے! آج! اور کل یہ خواب یادوں میں بدلیں گے اور پھر وقت کی پرواز کے ساتھ یہ یادیں بھی دھندلانے لگیں گی۔کاش میرا ایسے کارِ ذہن اس قابل ہوتا کہ یادیں حنوط کرکے اُس میں محفوظ رکھی جاسکتیں۔مگر یادوں میں

ہمیشہ تازگی کی مہک نہیں آسکتی۔ نرم و نازک یادوں کے رنگ پھیکے پڑ جاتے ہیں۔ وہ خزاں رسیدہ پتّوں کی مانند بکھر جاتی ہیں۔ چنبیلی کے شگوفوں کی طرح بالآخر کمہلا جاتی ہیں۔ افلاطون نے کہا تھا "ہر خوشی ایلس کے فوارے کی مانند ہے جس کا پانی حکایت کے مطابق محفوظ نہیں کیا جا سکتا۔ سو ہر لمحے کو اپنے ساتھ وہ تمام خوشیاں لے جانے دو جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔"

اُس رات جب میں سویا تو ثوریا کی شام کے وہ لمحے مجھ سے دُور ہوتے گئے جن میں حاصل کردہ خوشیاں ایلس کے فوارے کے پانیوں کی طرح لاکھ چاہنے پر بھی میرے ذہن میں محفوظ نہیں ہو سکتی تھیں۔ تمام شب ثوریا کا مترنم اور نسوانیت سے بھرپور نام میرے ذہن کی خاموش جھیل پر چاندی کی بارش کی طرح برستا رہا —— ثوریا! ثوریا! ثوریا!

مدینہ سالم

دوسری صبح روانگی سے پیشتر ہم نے حسب سابق ہوسٹل کے وسیع غسل خانے کے تمام شاور رز کھول کر غسل فرمایا اور حسب معمول نیکریں زیب تن کر کے مائل بہ سفر ہوئے۔

ادھر ثوریا سے باہر نکلتے ہی اولین پٹرول پمپ کی قربت سے جیپ ڈیڈ کی پیاس بھی عود کر آئی اور وہ بھلی مانس تب تک ٹس سے مس نہ ہوئی جب تک کہ اس کے شکم میں مبلغ تین سو پسیتے کا پٹرول نہ انڈیل دیا گیا۔

ہم ثوریا کی بنفشی پہاڑیاں عبور کر رہے تھے تو میں نے شہر پر آخری نگاہ ڈالی۔ قشتالیہ کے دور دراز ریگزاروں کے درمیان کوہستانی راستوں اور گھاٹیوں میں گھرے اس شہر کی جانب جہاں کل شب پاسیلو میں، مَیں نے اُداس آنکھوں والی ایک لڑکی کو دیکھا تھا۔ سفید شال، سفید چنبیلی کے پھول ——— شاید وہ بھی اس وقت سفید روشنی میں نہائے ہوئے سرخ چھتوں والے کسی مکان کے آنگن میں بیٹھی اُس اجنبی کے بارے میں سوچ رہی ہو گی، جو اُس کی آنکھوں سے نکلنے والی شعاعوں کی زد میں آیا تھا۔

”کیوں بھئی موٹشان کیا سوچ رہے ہو؟“ ٹونی نے ایک ہاتھ سے سٹیئرنگ وہیل کو سہارا دیا اور دوسرے سے مشکیزہ پچکا کر شراب کی ایک پتلی دھار حلق میں اتارتے ہوئے پوچھا۔

”ہُوں!“ ثوریا کا سحر ریزہ ریزہ ہو گیا۔ ”کچھ بھی نہیں۔“ میں نے سر جھٹکا اور ڈیش بورڈ میں سے ہسپانیہ کا نقشہ نکال کر اپنے گھٹنوں پر پھیلا لیا۔

اَل میزان کے قصبے کے قریب ہم نے ایک مرتبہ پھر دریائے دوئیرو عبور کیا۔ اگلا قصبہ

مدینہ سلی تھا جہاں ہم دس بجے کے قریب پہنچ گئے۔ خیمے سے باہر ہم ایک قہوہ خانے میں ناشتے کے لئے رک گئے۔ میرے سامنے عربوں کا مدینہ سالم خشکی اور بنجر پہاڑیوں کے درمیان ایک عمر رسیدہ بوڑھے کی مانند تیز دھوپ میں سستا رہا تھا۔ زندگی کی حرارت اور گہما گہمی سے یکسر عاری ایک معمولی اور غیر مؤثر قصبہ۔ المنصور ابن ابی عامر یہیں کہیں ان سفید مکانوں اور چٹیل پہاڑیوں تلے ابدی نیند سو رہا تھا۔

قرطبہ کے ایک وکیل کا بیٹا عامر جس کے لئے دربار میں ایک معمولی عرضی نویس کی ملازمت اس سنہری زینے پر پہلا قدم ثابت ہوئی جس کی معراج اُسے اندلس کی وزارت عظمٰے تک لے گئی زمانۂ طالب علمی میں مسجد قرطبہ کے صحن میں اُسے بے حد سنجیدہ اور خاموش دیکھ کر اس کے دوستوں نے پوچھا "عامر تم آج اتنے خاموش کیوں ہو؟"

اُس نے نہایت متانت سے جواب دیا "میں اس وقت کے بارے میں سوچ رہا ہوں جب مجھے اندلس کی وزارت عظمٰے پر فائز ہو کر اس ملک کے تمام مسائل حل کرنا ہوں گے۔" اس کے دوست بے حد محظوظ ہوئے اور ہنسنے لگے۔ عامر نے غصے سے کہا "میں واقعی عنقریب اندلس کا وزیر اعظم ہونے کو ہوں۔ ابھی وقت ہے اپنے لئے جو کچھ مانگنا ہے مانگ لو۔" ایک نے مالقہ کا قاضی بننے کی خواہش کا اظہار کیا۔ دوسرے نے پربس کے حاکم اعلیٰ کا عہدہ مانگا۔ تیسرے نے کہا۔ مجھے باغات کا شوق ہے۔ میں قرطبہ کے باغوں کا نگران بننا پسند کروں گا۔ چوتھے دوست نے آگے بڑھ کر منصور کے گال پر ایک طمانچہ رسید کیا اور حقارت سے کہنے لگا "تیری اگلی بارہ پشتوں میں بھی کوئی اگر اندلس کی وزارت عظمٰے کے منصب کو پہنچا، تو مجھے گدھے پر اُلٹا سوار کر کے شہر میں گشت کروانا۔ چند برس بعد قرطبہ کے بچوں کے جم غفیر کے درمیان یہی طالب علم گدھے پر اُلٹا سوار اس روز بدر کو یوں رہا تھا جب اُس نے اپنی رضامندی سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔"

"تاریخ دان لین پول کے مطابق عبدالرحمٰن سوم نے جس عظیم اندلس کے خواب دیکھے تھے، ان کی تعبیر المنصور کے عہد میں ظہور پذیر ہوئی۔ اُس کی قوت برداشت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ اپنے وزراء کے ساتھ انتظامی امور پر بڑے اطمینان سے محو گفتگو تھا۔ یکدم دربار میں گوشت

کے جلنے کی ناگوار بو پھیل گئی۔ معلوم ہوا کہ شاہی جراح المنصور کی ٹانگ پر آئے ہوئے ایک زخم کو گرم لوہے کی ایک سلاخ سے داغ رہا ہے۔ انتظامی امور کے علاوہ وہ فن حرب میں بھی باکمال تھا۔ ہر سال موسم بہار اور خزاں میں ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق وہ بار سلونا۔ پامپلونا۔ فوارا۔ لیان اور قشتالیہ کی عیسائی ریاستوں پر حملہ آور ہوتا۔ لیان کے شہر کی فصیلیں منہدم کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اپنے چھتیس سالہ عہد میں پچاس سے زیادہ جنگوں میں حصہ لیا اور ہمیشہ کامران لوٹا۔ ابن ابی عامر اسی لئے تاریخ میں المنصور یعنی فاتح کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہر معرکے سے واپسی پر وہ اپنے لبادے پر جمع شدہ خاک بڑی احتیاط سے جھاڑتا اور اُسے ایک ڈبیہ میں محفوظ کر لیتا۔ قشتالیہ کے خلاف ایک مہم سے واپسی پر وہ مدینہ سلی میں علیل ہوا۔ اور چند روز بعد اندلس کا یہ جری فرزند راہئ ملک عدم ہوا۔ اُس کی وصیت کے مطابق چالیس معرکوں میں جمع شدہ خاک اس کے چہرے پر چھڑکی گئی اور اُسے اُس کفن میں دفنایا گیا جو اُس کے ذاتی کھیت کی روئی سے اُس کی اپنی بیٹیوں نے کاتا تھا۔ عیسائیوں نے اُس کی موت پر جس طرح اطمینان کا اظہار کیا، وہ ایک راہبانہ جریدے کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے " ۱۰۰۲ء میں المنصور مر گیا اور جہنم میں دفن ہوا۔" تاریخ کی ایک قدیم کتاب میں اُس کے کتبے کی عبارت کچھ یوں رقم ہے۔

"اُس کی نشانیاں تمہیں اُس کی خبر بتلائیں گی۔ گویا تم اُسے اپنے سامنے دیکھ رہے ہو، اس جیسا زمانہ کبھی نہ رکھے گا۔"

آج مدینہ سلی میں اُس کی قبر جانے کس مکان۔ کونسے کوچے اور کس کھنڈر تلے ہے اُس کی کوئی نشانی نہیں اُس کی خبر نہیں بتلاتی۔ ہاں تاریخ گواہ ہے کہ اُس جیسا زمانہ کبھی نہ رکھے گا۔ مدینہ سلی کے بعد ہم گواڈل جارہ کے قصبے سے گذرے جسے اہل عرب وادی الحجارہ بھی کہتے تھے اور مدینۃ الفرج بھی۔ یہ قصبہ جو گئے دنوں میں ایک اہم شہر تھا، موسیٰ اور طارق کی متحدہ افواج کے ہاتھوں فتح ہوا۔ مشہور مورخ اور ادیب علامہ الحجاری بھی اسی قصبے کے رہنے والے تھے۔

گواڈل جارہ سے الکا دے ہنارس پہنچے تو دوپہر ہو چکی تھی اور گرمی عروج پر تھی۔ سڑک کے کنارے ایک بوڑھا ہسپانوی چھپر تلے بیٹھا تربوز بیچ رہا تھا۔ ٹونی نے جیپ روک کر ایک تربوز خریدا اور چیرتے ہوئے اُس نے ایک مرتبہ پھر اپنی قصابیت کا مظاہرہ کیا اور نہایت نفیس ٹکڑے کاٹے۔

ہنارش ہسپانیہ کے مایۂ ناز ادیب سروانتیس کی جائے پیدائش ہے جس کی شہرۂ آفاق کتاب "ڈان کے خوتے" کا حوالہ میں نے اس کتاب کے پہلے باب میں دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی قصبے سے طارق کو وہ بیش قیمت میز دستیاب ہوئی تھی جو بعد میں اُس کے اور مُوسیٰ کے درمیان "تنازعے" کا باعث بنی۔

الکادرے ہنارس سے کچھ فاصلے پر ہم دُھول سے اَٹی ہوئی اُس سڑک سے جُدا ہُوئے جس نے پچھلے دو روز سے قشتالیہ کے کھلے میدانوں اور بے آب و گیاہ پہاڑوں میں ہمارا ساتھ دیا تھا۔ ہم ایک دو طرفہ اور کشادہ سڑک پر آ گئے تھے۔ بائیں ہاتھ ایک بورڈ نظر آیا "ہوائی اڈہ بائیں جانب" بے ترتیبی سے بکھری ہوئی ڈبّہ نما جدید عمارتیں جن میں سے بیشتر زیرِ تعمیر تھیں۔ کرین اور بُل ڈوزر سر اٹھائے کھڑے تھے۔ نیون سائن جو دن کی روشنی میں لوہے کے کھنڈر لگ رہے تھے۔ بے شمار ٹریفک۔ جلتی بجھتی ٹریفک کی روشنیاں اور بے پناہ شور۔ ہم ہسپانیہ کے دارالحکومت میڈرڈ میں داخل ہو رہے تھے۔

گویا کہ ..... میڈرڈ

مسلمانوں کے عہد میں متعدد عرب قبیلے ایسے بھی تھے جو ہسپانیہ میں سینکڑوں برس سے قیام پذیر ہونے کے باوجود آبائی خانہ بدوشی کی حس کو دبا نہ پاتے تھے۔ یہ قبائل شہروں سے دُور دریاؤں کے کنارے اور زرخیز وادیوں میں خیمہ زن ہوتے اور پھر جس صبح گردو نواح کے مناظر سے اجنبیت کا پہلا پردہ سرکتا اُن کے خیموں کی طنابیں ڈھیلی پڑ جاتیں میخیں اُکھڑتیں اور وہ ایک مرتبہ پھر اَن دیکھی سرزمینوں کی تلاش میں وہاں سے کُوچ کر جاتے۔ ایک سیّاح کی مانند کسی انجانے مقام پر اجنبی کی حیثیت سے وارد ہونا ان کے لئے زندگی کا سب سے بڑا جذباتی تجربہ ہوتا تھا۔ ایک ایسے ہی صحرا نورد قبیلے نے دریائے منیزناس کے کنارے ایک بُلند ٹیلے پر ایک حصار تعمیر کیا اور اُسے مجریط کے نام سے پکارا۔ مجریط صدیوں قرطبہ، غرناطہ اور اشبیلیہ ایسے چمکتے شہروں کی روشنی تلے گمنامی کے اندھیروں میں بھٹکتا رہا۔ ۱۵۶۱ء میں فلپ دوم نے کتب خانہ و خانقاہ ال اسکوریل کی تعمیر کے دوران یہاں چند برس قیام کیا اور اس کی مرکزیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے ملک کا صدر مقام قرار دیا۔ اسی مرکزیت کی بنا پر مجریط جو اب بگڑ کر میڈرڈ ہو چکا ہے ہسپانیہ کا پیٹ بھی کہلاتا ہے۔ آج سے دو سو سال پیشتر تک دریائے منیزناس کے کنارے عربوں کے تعمیر کردہ حصار القصر کے کھنڈرات موجود تھے اب وہاں شاہی محل کی عالی شان عمارت کھڑی ہے اور میڈرڈ اس کے گرد میلوں تک پھیلا ہُوا ہے۔ ہسپانیہ کی قدیم تاریخ میں ایک نو وارد شہر۔

پیرانیز کی بلندیوں اور قشتالیہ کے ریگزاروں کو عبور کر کے اب ٹونی کی جیپ کاساڈے کامپو کے جنگل میں پائن اور فر کے درختوں تلے کھڑی تھی اور ہم دونوں مڈگارڈ پر بیٹھے پچھلے دو روز کے سفر کی یادیں تازہ کر رہے تھے۔ ثوریا کی شب کا ذکر آیا تو ٹونی جیسا سکھ بھی جذباتی ہو گیا۔

"یقیناً ثوریا کے پاسیو میں حصّہ لینے والی ہسپانوی لڑکیوں کے قدموں کی چاپ افریقہ کے جنگلوں تک میرا پیچھا کرے گی۔ واپسی پر اس قہوہ خانے میں ضرور جانا جہاں اُس شب....."

"اُس شب ٹونی؟..... ابھی کل کی تو بات ہے۔"

"ہاں شاید کل کی ہی بات ہو مگر مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔"

اس سے پہلے کہ ٹونی کی حالت مزید غیر ہوتی میں نے اپنا رک سیک کاندھے پر ڈالا اور اس سے اجازت چاہی۔

"اہم" اُس نے بمشکل گلا صاف کیا "یہ شہر بے جان اور رڈل سا لگتا ہے..... تم میرے ساتھ افریقہ کیوں نہیں چلتے؟"

"مگر مچھوں اور آدم خوروں سے ملاقات کرنے؟..... ہو گیا نا چھوٹا سا لطیفہ؟"

"تم کہتے ہو تو ہو گیا" اس نے منہ بنا کر کہا "مجھے یقین ہے کہ تم واپسی پر ثوریا ضرور جاؤ گے اور پاسیو میں شامل اس لڑکی کو تلاش کرو گے جس نے بالوں میں چنبیلی کے پھول سجائے تھے....."

فراور پائن کے درختوں کی چوٹیاں ایک سبز دیوار کی صورت میں سورج کا راستہ روکے کھڑی تھیں۔ روشنی کی ایک کرن بھی مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔

"نہیں ٹونی ڈیئر..... تم خود ہی تو کہہ رہے تھے کہ وہ صدیوں پہلے کی بات ہے۔ اگر واپس بھی چلا جاؤں تو ہو سکتا ہے اُن بنفشی پہاڑیوں کے درمیان ثوریا کا وجود بھی نہ ہو..... بہر حال لفٹ کا شکریہ! اور ٹونی تمھاری رفاقت میں یہ طویل سفر بے حد خوشگوار طریقے سے کٹا....."

"یہ تم دوبارہ کہہ سکتے ہو!..... لاؤ اب ایک سگرٹ تو پلا دو..... اب ہوا ہے نا ایک چھوٹا سا لطیفہ۔ کیوں مُستان؟" ٹونی کی جھاڑی داڑھی میں حرکت ہوئی اور درمیان میں سے اُس کا مخصوص قہقہہ برآمد ہو گیا۔

"ہاں ہو گیا" میں نے اُسے سگرٹ سُلگا کر دیتے ہوئے اعتراف کیا "خدا حافظ ٹونی!"

ایک طویل کش لگانے کے بعد اس نے داڑھی کھجلائی۔ میرے دونوں کندھوں پر تھپکی دی اور جیپ میں سوار ہو کر چابی گھما دی۔ درختوں میں چند نیم خوابیدہ پرندے انجن کی آواز سے خوفزدہ ہو کر پھڑ پھڑا لئے۔ کاساؤے کامپو کی کچی پگڈنڈی پر دھول اُٹھی اور ٹونی کی جیپ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ پائن کے ایک درخت کے تنے پر "یوتھ ہوسٹل بائیں جانب" کی تختی آویزاں تھی، میں ایک پہاڑی خچر کی طرح کاندھوں پر بوجھ اُٹھائے سر جھکا کر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ جنگل کے وسط میں لکڑی کے ایک کرم خوردہ پھاٹک پر "میڈر ڈ یوتھ ہوسٹل" کے الفاظ لکھے دکھائی دیئے۔ کواڑ دھکیل کر میں نے اندر جھانکا۔ دھول میں اٹا ہوا ایک وسیع و عریض سنسان صحن میڈرڈ کی تپتی دوپہر میں چمک رہا تھا۔ بائیں ہاتھ پر ایک بیرک نما سادہ سی عمارت تھی۔ فرلانگ بھر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جب میں عمارت میں داخل ہوا تو اندر بالکل خاموشی تھی۔ ٹھنڈک اور نیم تاریکی۔ مَیں نے رک سیک کاندھے سے اتار کر اپنے تئیں ایک خالی بستر پر رکھ دیا۔

"کون ہے؟" بستر پر لیٹے ایک ہیولے نے اپنے پیٹ پر رکھے رُک سیک کو بے حد خوف زدہ ہو کر ٹٹولتے ہوئے دریافت کیا۔

"میں ہوں"! مَیں نے جلدی سے رُک سیک اُٹھا لیا "یہ جگہ یوتھ ہوسٹل ہی ہے نا؟"

"یہ جگہ...... ہیولے صاحب اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر جھک گئے۔

"یہ جگہ قدیم مصر ہے۔ فرعون ریمسیس کی سواری آرہی ہے!!"

"ہیلو" میں نے خوش دلی سے کہا۔

"ہائے! ہائے! ہا...... "مخالف سمت میں ایک بنکر پر آدھا لیٹا آدھا بیٹھا ہپّی غنودگی کے عالم میں بڑبڑایا۔

"ہالو! ہالو!" کسی صاحب نے بنکر کے نیچے سے ہاتھ نکال کر میری ٹانگ پکڑ لی۔

"آپ سے مل کر بے حد مسرت ہوئی" میں نے مسکرا کر نیچے جھانکا۔

نیم وا مسکراہٹ لبوں پر سجائے اب وہ صاحب گٹار کو آغوش میں دبوچے اُونگھ رہے تھے۔

میری نظریں تاریکی کی عادی ہوئیں تو انکشاف ہوا کہ ہوسٹل کے بنکروں پر درجنوں حضرات نروان کی مختلف منزلوں کی سمت رواں ہیں۔ ایک حبشی لڑکا میری جانب ٹکٹکی باندھے

تب تک آنکھیں جھپکاتا رہا جب تک میں نے بھی اُسی رفتار سے آنکھیں جھپکا کر اُسے "ہیلو" نہ کہہ دیا۔ قندھار کے ہوٹل میرواعظ میں جس بُو سے واسطہ پڑا تھا اُس کی مہک اِن فضاؤں میں بھی رچی بسی تھی۔ اتنے میں ہوسٹل کی ایک کھڑکی کے پٹ کُھلے اور ایک یونانی نقوش کا حامل نوجوان چھلانگ لگا کر اندر آ گیا۔

"کھڑکی!...... بند کر دو۔ روشنی!...... نہیں چاہیئے" ملنگ باباؤں نے آنکھیں ڈھانپتے ہوئے دھیرے دھیرے احتجاج کیا۔ نوجوان نے بآوازِ بلند ہسپانوی میں چند ناپسندیدہ الفاظ کہے اور کھٹاک سے کھڑکی بند کر دی۔

"آپ بھی شاید میری طرح یہاں نووارد ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں۔ نہیں ...." اس نے شانوں تک آئی ہوئی زلفوں کو جھٹکا اور بے دھیانی میں بولا "میں تو وارڈن کی لڑکی سے ملنے گیا تھا۔ پچھلے بیس روز سے تپسیا کر رہا ہوں مگر وہ کمبخت تو برازیلین لڑکیوں سے بھی گئی گذری ہے۔ مانتی ہی نہیں۔ ہر روز پوری دوپہر وارڈن صاحب اپنی چہیتی مرغیوں کو دانہ ڈالتے ہیں اور میں ان کی چہیتی...... خیر...... تم کون ہو؟"

میں نے اپنا تعارف کروایا۔

"اچھا اچھا تو ایسے ہوتے ہیں پاکستانی!" اس نے سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیتے ہوئے کہا "تم میرے پہلے پاکستانی ہو" اور پھر بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا "میرا نام بانکو ہے۔ برازیل سے آیا ہوں۔ عرف عام میں مجھے بانکو وی برازیلین کہا جاتا ہے۔ میڈرڈ تو پسند نہیں آیا، البتہ یہاں کے وارڈن کی بیٹی پسند آ گئی ہے"

"مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے ہوسٹل کے کسی بھی مکین کو میڈرڈ پسند نہیں آیا جو اس وقت شہر کی سیر کی بجائے عالمِ بالا کی سیر کر رہے ہیں"

"یہ حضرات؟" اس نے اونگھتی ہوئی مخلوق کی جانب اشارہ کرتے ہوئے قہقہہ لگایا۔

"یار تمہیں یسوع مسیح کا واسطہ۔ خاموشی سے ہنسو" ایک مخلوق نے احتجاج کیا۔

"ہسپانوی بندرگاہ الجیسرس سے مراکش صرف دو گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے" بانکو نے سرگوشی کی "اور وہاں اعلیٰ قسم کی حشیش کی اتنی بہتات ہے کہ سبزی فروش بھی آلوؤں اور ٹماٹر کی

کے ساتھ اسے ٹوکروں کے حساب سے فروخت کرتے ہیں چنانچہ اپنے یہ ہپی مراکش میں قدم رکھتے ہی سٹون ہو جاتے ہیں؟"

"سٹون؟ یعنی پتھر ہو جاتے ہیں؟"

"نہیں سٹون یعنی دُھت ہو جاتے ہیں یکمکل نروان۔ اور پھر جب تک مراکشی حکومت انہیں کان سے پکڑ کر ملک سے باہر نہیں کر دیتی یہ وہاں سے ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ ہسپانیہ واپسی پر اُن کے ٹرک بیگوں میں غلیظ بنیانوں اور جرابوں کے نیچے سیروں حشیش بھری ہوتی ہے اکثر پکڑے جاتے ہیں اور ہسپانوی جیلوں میں سڑتے ہیں۔ جو بچ نکلتے ہیں وہ سیدھے میڈرڈ کے یوتھ ہوسٹل میں چلے جاتے ہیں۔ یہاں کے وارڈن کو جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں اپنی مرغیوں سے ہی فرصت نہیں اس لیے یہ حضرات خوب کھل کھیلتے ہیں بلکہ کھل پیتے ہیں۔"

"یہاں خوب گذرے گی۔" میں نے اپنا سونے کا تھیلا بستر پر بچھا دیا اور لیٹ کر ڈائری لکھنے میں مشغول ہو گیا۔ جس مدھ بھری فضا میں سانس لے رہا تھا وہاں زیادہ دیر تک فی ہوش رہنا ناممکنات میں سے تھا۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد میں نے ڈائری بند کر دی اور اُونگھنے لگا۔ آنکھ کھلی تو دس بجنے کو تھے اور حسبِ سابق ہر سُو خاموشی تھی۔ میں نے بانکو کی جانب دیکھا وہ نہایت باربط قسم کے خراٹے لے رہا تھا۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور صرف ایک نیکر میں ملبوس عمر رسیدہ وارڈن کاندھے پر بندوق جمائے اندر داخل ہُوا۔ اس نے فوجی انداز میں ایڑیوں پر گھوم کر دروازہ بند کیا اور پھر ہوسٹل کی راہداری میں باقاعدہ پریڈ کرنے لگا۔ دو چکر لگانے کے بعد اُس نے بندوق کندھے سے اُتار کر بغل میں داب لی اور پورا منہ کھول کر کاشن دینے لگا "لڑکو! دس بج رہے ہیں۔ اب قانونی طور پر تم اس ہوسٹل سے باہر نہیں جا سکتے۔ صدر دروازہ مقفل کر دیا گیا ہے۔ روشنیاں گل کر دو (حالانکہ روشنیاں پہلے سے گل تھیں) اور سو جاؤ (سب لوگ سو رہے تھے) شب بخیر!" اس تقریر کے بعد وارڈن نے حسبِ سابق دو مرتبہ راہداری میں مٹر گشت کی اور پھر دروازہ کھول کر پریڈ کرتا ہُوا باہر نکل گیا۔ اُس کے باہر نکلنے کی دیر تھی کہ تمام مردہ اجسام نے چھلانگیں لگائیں اور بستروں سے باہر آ گئے "بَراوو۔ ویوا۔ ہُرّے" متعدد زبانوں میں زندہ باد کے نعرے فضا میں گونجنے لگے۔ تمام بتیاں روشن کر دی گئیں

بنکر کے نیچے لیٹا ہپّی گٹار بجانے لگا۔ اگر واقعی لفظوں کو بجایا جا سکتا ہے تو وہ اس وقت بجائی جا رہی تھیں۔

"بانکو بھائی! میں نے بانکو کے ریڈیا ۔ ویڈیا میں مداخلت کرتے ہوئے دریافت کیا۔" کیا سلسلے ہیں؟"

"اب میڈرڈ کی سیر کا وقت ہے ..... ریڈیا، اس نے نعرہ لگایا۔

"لیکن صدر دروازہ مقفل ہے اور باہر وارڈن صاحب بندوق لئے ٹہل رہے ہوں گے۔"

"صدر دروازے کے پہلو میں جو پتھر نصب ہے اس پر چڑھ کر دیوار بآسانی پھلانگی جا سکتی ہے اور رہی ۱۹۳۶ء کی زنگ آلود نشانی وارڈن صاحب کی بندوق تو وہ خانہ جنگی کے بعد آج تک کارتوس کے لمس سے آشنا نہیں ہوئی بلکہ شائد ان دنوں بھی نہیں ہو گی۔ بہر حال تم فکر نہ کرو تمام دن بستروں میں پڑے اونگھنا اور پھر پوری شب میڈرڈ کی آوارہ گردی کرنا اس ہوسٹل کے مکینوں کی روایت ہے۔"

تھوڑی دیر بعد پوری قوم سج بن کر زیر زمین ریلوے اسٹیشن پر میڈرڈ کے مرکز پورتا دیل سول جانے والی گاڑی کے انتظار میں کھڑی تھی۔ گاڑی آئی تو یوں لگا کہ جیسے مغلپورہ لوکو شیڈ میں زیر مرمت کسی مال گاڑی کو دھکیل کر سٹیشن کے اندر بھیج دیا گیا ہو۔ البتہ یہاں مال گاڑیوں جیسی وسعت ناپید تھی۔ ہر سو مسافر ٹھنسے پڑے تھے۔ فیصلہ دے دیا گیا کہ گاڑی میں سوار ہونا ناممکنات میں سے ہے۔ فدوی کو چونکہ لاہور کی اومنی بسوں میں سوار ہونے کا وسیع تجربہ تھا اس لئے یہاں بھی چنداں دشواری پیش نہ آئی۔

پورتا دیل سول یعنی "باب شمس" میڈرڈ کا ثقافتی اور تجارتی مرکز ہے۔ کلاسیکی طرز تعمیر کی چند عمارتیں ایک نیم دائرے کی شکل میں اُسے گھیرے ہوئے ہیں اور اس کے وسط میں سے میڈرڈ کی دس شاہراہیں جنم لیتی ہیں۔ ناول نگاروں نے پورتا دیل سول کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے مگر مجھے اس "باب شمس" میں سے خوبصورتی کی کوئی شعاع طلوع ہوتی نظر نہ آئی۔ میڈری لینوز یعنی میڈرڈ کے باشندوں کی وضع قطع بھی دوسرے یورپی ملکوں کے باشندوں کی نسبت قصباتی اور عامیانہ ہے۔ البتہ ان کے چہروں پہ انگریزوں کی سنجی گی

جرمنوں کی کرختگی، سوسوں کی کاروباری مسکراہٹ اور اطالویوں کی شاطرانہ ہنسی مفقود تھی۔ یہ چہرے ایک کھلی کتاب تھے۔ تازہ ہنس مکھ اور بےفکر۔ میڈرڈ میں مجھے کوئی ایسی خاصیت نظر نہیں آئی جسے خالص میڈرڈی کہا جا سکے۔ قہوہ خانوں پر امریکی چھاپ ہے۔ ملبوسات کی دوکانوں پر فرانسیسی رنگ غالب ہے اور طرزِ تعمیر بھی کسی طور منفرد نہیں۔ ول سول سے دائیں ہاتھ والی سڑک کے اختتام پر پلازا میئر کا خوبصورت چوک ہے جہاں ۱۶۸۰ء میں جنونی بادشاہ کارلوس دوم نے دربارِ عام لگا کر ڈیڑھ سو سے زائد "کافروں" کو اذیتیں دے کر مروایا تھا۔ اسی دروازے کے عقب میں درجنوں چھوٹے چھوٹے بازار اور تنگ گلیاں ہیں جنھیں قدامت کی وجہ سے میڈرڈ کا خوبصورت ترین علاقہ شمار کیا جاتا ہے۔ بانکو نے انہی گلیوں میں سے ایک میں ایک ایسا ریستوران دریافت کیا تھا جہاں بقول اُس کے دنیا کا ارزاں ترین ڈنر دستیاب ہوتا ہے۔ ٹھنڈا سوپ، مچھلی، تورتلا یعنی آملیٹ، سویٹ ڈش، کافی اور ان سب کو ہضم کرنے کے لیے سرخ شراب صرف پچیس پیسیٹے!

ایک مرتبہ جنوبی فرانس کے انگوروں کے باغوں میں سرِشام جانے کا اتفاق ہوا۔ پہلے پہل کسی انگور کے خوشے میں سے ایک آدھ جھینگر کے بولنے کی آواز بلند ہوئی۔ پھر وقفے کے ساتھ ان میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر میلوں میل تک پھیلے ہوئے باغات ان کے شور سے گونجنے لگے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ بات کرنی بھی مشکل ہو گئی۔ رات کے تین بجے جب میں بانکو کے تجویز کردہ ریستوران میں کھانا کھانے کے بعد کاساڈے کامپو کے گھنے درختوں میں سے گذر رہا تھا تو یہاں بھی ہر سُو جھینگروں کا شور تھا۔ البتہ ہسپانوی جھینگر اپنے فرانسیسی بھائی بندوں کی نسبت زیادہ مضبوط پھیپھڑوں کے مالک واقع ہوتے تھے۔ یہ جنگل ایک زمانے میں شہر سے خاصے فاصلے پر تھا مگر بعد میں میڈرڈ کی پھیلتی ہوئی آبادی نے اسے مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیا۔ ان دنوں یہ صرف شاہی خاندان کے افراد کے لیے مخصوص تھا اور بطور شکارگاہ استعمال کیا جاتا تھا۔ شکار اب بھی ہوتا ہے مگر شکاری شہزادوں کی بجائے ہسپانوی نوجوان ہوتے ہیں اور شکار جانوروں کا نہیں متناسب جسم کی مالک اُن جرمن اور سویڈش لڑکیوں کا کیا جاتا ہے جو شام ڈھلے جنگل کے مختلف حصوں میں واقع قہوہ خانوں میں بیٹھی آنکھیں

جھپکنی ملتی ہیں۔ اسی قسم کا ایک قہوہ خانہ ہوسٹل کے رستے میں پڑتا تھا۔ جہاں اس وقت بانکو سمیت ہوسٹل کے تمام مکین ہڑبونگ مچا رہے تھے۔ سویڈش لڑکیاں وافر تعداد میں۔ سرخ شراب مٹکوں کے حساب سے اور موسیقی ہوسٹل والے ہپی لڑکے کی گٹار میں سے اُبلتی ہوئی۔ ایک غیر ملکی لڑکی انگلیوں میں کاسترانات پر دستے میز پر کھڑی بولیرو رقص ناچنے کی کوشش میں۔ بانس کے ساتھ بندھے رستے سے جھولتے ہوئے رنگ برنگے قمقمے۔ میں پاس سے گذرا تو بانکو نے مجھے بھی دبوچ لیا۔

"ہائے ہائے کیا کر رہے ہو امیڈرڈ میں رات کے تین بجے بھی کوئی سوتا ہے۔"

میرے لیے" ہورشاتا ڈی شوفا "منگوایا گیا۔ ناریل ملا دودھ قسم کا مشروب۔ اپنی "مرزائی" جیسا ذائقہ تھا۔ گلاس ختم کرنے کے بعد مجھے یوں محسوس ہُوا کہ جیسے کاساڈے کا میوکے جھینگر نری ٹرٹر نہیں کر رہے باقاعدہ چائے کوسکی کی سمفنی بجا رہے ہیں۔ گٹار کی لَے ہے کہ دل میں اُترتی ہی چلی جا رہی ہے۔ جنگل میں سرسراتی ہوا کچھ زیادہ ہی خوشگوار ہے اور میز پر ناچنے والی لڑکی جو پہلی نظر میں بس یونہی سی لگی تھی اب بہت ہی خوبصورت ہو چلی ہے۔ دوسرے روز معلوم ہُوا کہ بانکو نے ویٹر کے ساتھ ساز باز کر کے ہورشاتا میں برانڈی کی آمیزش کر دی تھی تبھی!

صبح سات بجے ہوسٹل واپسی پر ابھی ہم بستروں میں ٹانگیں اور بازو پھیلا کر سونے کے لیے مناسب پوزیشن کی جستجو میں تھے کہ دروازہ کھلا اور وارڈن صاحب حسبِ معمول بندوق تھامے وارد ہو گئے "حضرات صبح کے سات بج چکے ہیں۔ اُمید ہے آپ رات مزے سے سوئے ہوں گے اب آپ اچھے سیاحوں کی مانند تیار ہو کر میڈرڈ کی سیر کو نکل جائیے۔ صبح بخیر!" وارڈن نے دروازے سے باہر قدم رکھا تو ایک مرتبہ پھر نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے۔ سگرٹوں میں سے تمباکو جھاڑ کر ان میں چرس ملائی گئی۔ کش لگے۔ تھوڑی دیر بعد قبرستان میانی صاحب...... ہرسُو مکمل خاموشی!

میں نے سفید ہورشاتا کا ایک گھونٹ پیا۔ میز پر بکھرے گھر سے آئے ہوئے خطوط پر ایک سرسری

نگاہ ڈالی جنھیں میں تین مرتبہ پڑھ چکا تھا اور پھر سر کھجلانے لگا۔ اب کیا کیا جائے؟ آج میڈرڈ میں قیام کا چوتھا روز تھا۔ پہلے دو روز تو ہوسٹل کی روایات کے مطابق گذرے یعنی دن بھر پڑے اونگھتا اور پھر کا سارا وقت کامپو کے قہوہ خانے میں رت جگا۔ تیسرے روز فہرست بنا کر میڈرڈ کے تمام قابل دید(؟) مقامات کو بھگتایا اور آج صبح کالیئے دے الکالے پر واقع سفری ادارے تھامس کُک سے پاکستان کی ڈاک وصول کر کے اب میں پچھلے دو گھنٹوں سے پلازا دیل سیب چوتا کے ایک قہوہ خانے کے باہر ہوٹشا تا کا تیسرا گلاس سامنے رکھے سر کھجلانے میں مصروف تھا۔ یہاں میری طرح کے سینکڑوں نکمّے لوگ قطار اندر قطار منہ اُٹھائے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اُن لوگوں کو دیکھ رہے تھے جنھیں زندگی میں اور بھی بہت سے کام تھے مثلاً کسی اور قہوہ خانے میں جا کر بیٹھنا اور پھر فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ان لوگوں کو دیکھنا جنھیں . . . . . فٹ پاتھ کے ایک سرے پر لاہور کی بیڈن روڈ کی طرح درجنوں بوٹ پالش کرنے والے بیٹھے تھے۔ البتہ یہ حضرات بُرش۔ سٹینڈ پر کھٹکھٹا کر "خُو بوٹ پالش" کے نعرے بلند کرنے کی بجائے اخبار سامنے پھیلائے پچھلی بل فائٹ کی تفصیلات پڑھنے میں مگن تھے۔ اگر کوئی صاحب اُن کی بے خبری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے سٹینڈ پر اپنا بوٹ جما دیتے تو وہ شکایت بھری نظروں سے یوں دیکھتے جیسے کہہ رہے ہوں، "بھلے آدمی بُل فائٹر آل کو روبس پچھلے اتوار بارسلونا کے اکھاڑے میں مرتے مرتے بچا ہے اور تمہیں بوٹ پالش کروانے کی پڑی ہے۔" بہرحال وہ دو چار مرتبہ بڑی بے دلی سے بُرش چلا کر انھیں فارغ کر دیتے اور پھر باچھیں پھیلا کر مطالعہ میں محو ہو جاتے۔ ان کے سامنے دو بوڑھے ہسپانیہ کی مشہور نیشنل لاٹری کے کوپن گلے میں لٹکائے "لاٹری کوپن، لاٹری کوپن" کی صدائیں بلند کر رہے تھے۔

ہمارے ہاں کی طرح ایک عام ہسپانوی کی ہزاروں خواہشیں ایسی نہیں ہوتیں جن پر اس کا دم نکلتا ہے۔ ان کی تعداد صرف چار ہوتی ہے (۱) بُل فائٹر بننا (۲) جرمنی میں ملازمت کرنا (۳) کسی سویڈش دوشیزہ کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لانا (۴) نیشنل لاٹری جیتنا۔ خواہش نمبر تین ہر ہسپانوی کی بآسانی پوری ہو جاتی ہے بلکہ اتنی مرتبہ پوری ہوتی ہے کہ واقعی دم نکلنے کو آتا ہے۔ جرمنی میں چونکہ پہلے سے ہی لاتعداد ہسپانوی موجود ہیں اس لیے وہاں ملازمت کا بندوبست بھی ہو جاتا ہے، البتہ بُل فائٹر بننا اور کروڑوں لپیٹنے کی نیشنل لاٹری جیتنا ایسے ارمان

ہیں جو کم ہی نکلتے ہیں۔ اُن دنوں ایک چھوٹے سے قصبے کی بڑی دھوم تھی جس کے باشندے کئی برسوں سے اجتماعی طور پر نیشنل لاٹری کے کوپن خرید رہے تھے اور بالآخر اس ماہ کروڑوں پیسیٹے کی نیشنل لاٹری ان کے نام نکل آئی تھی۔ وہاں کے تمام مردوں نے کام سے ریٹائر ہونے کا اعلان کر دیا ہے اور اب سارا دن مقامی قہوہ خانے میں بیٹھے گپیں ہانکتے رہتے ہیں۔

میڈرڈ کے بارے میں ٹونی کے تاثرات سو فیصد درست ثابت ہوئے تھے۔ لمبے جان اور روڈل سا شہر۔ پچھلے چار روز سے میرے جیسے "ٹرگر ہیپی" شخص کے سامنے ایک بھی ایسی عمارت نہیں آئی تھی جسے دیکھ کر کیمرے کا بٹن دبانے کو جی چاہے۔ کسی شہر کے بے جان ہونے کے حق میں اس سے زیادہ مثبت دلیل اور کیا ہو سکتی ہے۔ اپنے عالیجناب میر دبیر قاضی ولی محمد صاحب بھی میڈرڈ آئے۔ "سفر نامۂ اندلس" میں لکھتے ہیں :

"جدید شہر کے ہوادار ہفت منزل محلات۔ کشادہ شوارع۔ پُر فضا باغات، نگہت افزا چمن۔ پیرس و فرانکفورٹ یاد دلاتے ہیں۔ پٹڑیوں پر قہوہ خانے سجے ہوئے ہیں صہبائے جلیقیہ و شریش کا دور چل رہا ہے۔ برف کی بھرمار ہے۔ برقی پنکھ کے علاوہ خوش وضع سبک پنکھیہ کو نازک کلائیاں ایک خاص اندازِ دلربائی سے چلا رہی ہیں۔"

قاضی صاحب نے قدیم شہر کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ لکھتے ہیں :

"بجز غربا و مساکین کے اس کی تنگ، پیچیدہ اور متعفن گلی کوچوں میں اور کوئی بھلا آدمی نہیں رہتا۔ شکستہ سڑک پر ٹاٹ بچھا ہوا ہے جس پر سامان بساط خانہ کے پاس فربہ اندام اندلسی خاتون مانگ پٹی سے آراستہ برہنہ سر ہاتھ میں پنکھا لیے ایک مونڈھے پر بیٹھی گاہکوں کا منہ تک رہی ہے۔ میوہ فروش کیا ٹن خربوزوں کی ڈھیری پر اسی بے تکلفی سے بیٹھی ہے جس طرح پیدا اربناس پر ٹونک کی عنبر پٹھانی پیشواز پہنے متمکن ہو۔ بلنشیہ کی کھادی اور مالقہ کی اوڑھنیاں ایک طرف فروخت ہو رہی ہیں۔ طلیطلہ کے چاقو دوسری طرف جمع ہیں۔ ایک سافن دو پیسے کے معاوضہ میں آب زلال کا ایک جرعہ پیش کر رہی ہے۔ تنبا کو فروش ایک ایک پیسہ کے

تلخ گوسوز سگرٹ فروخت کر رہا ہے۔ خچر کھانچیوں کے پاس کھڑے ہیں۔"
میں نے ہورشاتا کا چوتھا گلاس منگوایا اور چوک میں ایستادہ سروانتیس میموریل کے کانسی کے مجسموں کا جائزہ لینے لگا۔ روزی ناتنتے پر سوار بارلیش ڈان کوئکزاٹ ہاتھ میں نیزہ تھامے اور اس کا وفادار ساتھی سانچو پانزا خچر ہانکتا ہوا۔

"معاف کیجئے گا شاید میری پنسل آپ کی میز کے نیچے گر گئی ہے" میں نے سانچو پانزا کے آہنی خدوخال سے نظریں ہٹا کر امریکی لہجہ کی اس "معاف کیجیے گا" کی جانب دیکھا۔ درمیانی عمر کی ایک قدرے قبول صورت خاتون ساتھ والی میز پر کہنیاں ٹیکے میری جانب نہایت معصومیت سے ٹک ٹک تکے جا رہی تھیں۔ میڈرڈ کی طرح جدید، بے جان اور ڈل سا چہرہ۔ مجھ جیسے شرفا کو پنسل گرا کر متوجہ کرنے کے طریقۂ کار سے میں بخوبی واقف تھا۔ بہرحال میں نے پنسل اُٹھا کر اُنھیں تھما دی۔

"بہت بہت شکریہ" انھوں نے نہایت بھولپن سے مسکرا کر کہا۔
"یو آر ویلکم" میں نے حسب آداب تکلف برتا۔
"اوہ ....." اُن کی آنکھیں مصنوعی حیرت سے پھیل گئیں "آپ تو انگریزی بھی جانتے ہیں۔"
"جی!"
"بہت خوب! مجھے تو میڈرڈ سے پیار ہو گیا ہے اور آپ کو؟"
"نہیں ہوا۔"
"اوہو...... آپ نے یہاں کیا کیا دیکھا؟"
"الرتیرو۔ پلازا ویل سول دیکھ لیا ہے .... اور یہ پلازا دیل ہیپ چوناا اب دیکھ رہا ہوں۔"
"کیا؟" ان پر خود ساختہ سکتہ طاری ہو گیا "یعنی آپ نے اب تک پراڈو نہیں دیکھا؟ یا خدا۔ وہ دیکھئے سامنے ہی تو نظر آ رہا ہے۔ وہ جس کی عمارت کے سامنے گویا کا مجسمہ نظر آ رہا ہے۔"
"گویا کہ ......"
"نہیں نہیں گویا کہ نہیں گویا مشہور ہسپانوی مصوّر ......"
"جس نے ڈچس آف باجا کی برہنہ تصویر بنائی تھی ....."

"اوہ! یہ تو شرارت ہے" انھوں نے انتہائی مسرت سے اعلان کر دیا۔ یہ آخری فقرہ قطعی طور پر خطرے کا الارم تھا۔ چنانچہ میں نے بقیہ ہور شا تا ایک ہی سانس میں ختم کیا اور اُٹھ کھڑا ہوا "آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ مجھے اس وقت ٹورسٹ آفس سے کچھ معلومات حاصل کرنا ہیں اس لئے اجازت دیجئے۔"

"اوہ......" انھوں نے فوراً اپنا ٹوکری نما پرس اُٹھایا اور کھڑی ہو گئیں۔ "مجھے بھی اس وقت ٹورسٹ آفس سے......"

ٹورسٹ آفس میں میں نے کاؤنٹر پر رکھا ایک کتابچہ اُٹھایا اور باہر نکل آیا۔ ان محترمہ نے بھی وہی کتابچہ اُٹھایا اور میرے ساتھ ہی چپکی چلی آئیں۔

"اب ہم کیا کریں؟" محترمہ نے "ہم" پر یوں زور دیا جیسے ہم ایک مدت سے ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا چلے آ رہے ہیں۔

"میں سونا چاہتا ہوں" میڈرڈ کی گرم دوپہر اور محترمہ کے بے جا التفات سے بچاؤ کا واحد طریقہ ہوسٹل واپس جا کر آرام کرنا تھا۔

"اوہ! پھر شرارت۔ تم یقیناً اپنا وقت ضائع کرنے میں یقین نہیں رکھتے" انھوں نے ایک گہری سانس لے کر پیار سے کہا "لیکن اس وقت..... پراڈو چلتے ہیں۔"

ہسپانیہ کے شاہی خاندانوں کو شائد فنِ مصوری کا اتنا شوق نہ تھا جتنا اپنی ذاتی تصاویر بنوانے کا چاؤ تھا۔ چنانچہ پراڈو آرٹ گیلری کی دیواروں سے موٹے بادشاہ، بدہیئت شہزادیاں اور پستہ قد شہزادے آپ کو حقارت سے گھورتے نظر آتے ہیں۔ کارلوس پنجم، فلپ دوم اور فلپ چہارم کی تصاویر کی تو اتنی بہتات ہے کہ آنکھیں دُکھنے کو آتی ہیں۔ پراڈو دُنیا کی دوسری آرٹ گیلریوں سے یوں ممتاز ہے کہ اس میں آویزاں تمام شاہکار یا تو نقد رقم ادا کر کے حاصل کئے گئے اور یا پھر ٹیتیان، ولاسکز اور روبنز جیسے شہرۂ آفاق مصوروں کو ٹھیکے دے کر سینکڑوں کی تعداد میں بنوائے گئے۔ نپولین کی طرح نہیں کہ یورپ فتح کرنے کے بعد ہر شاہکار تصویر پر "لُوور" کا ٹھپہ لگایا اور پیرس روانہ کر دی۔ جہاں اس فن پرستی سے بہت سے مصوروں کا بھلا ہوا وہاں ہسپانوی بادشاہ بھی گھاٹے میں نہ رہے۔ فلپ دوم نے

ولاسکز سے ایک بڑھیا قسم کی تصویر بنا کر ولائت روانہ کی جسے دیکھ کر ایک اٹھارہ سالہ نوخیز شہزادی اس بری طرح فریفتہ ہوئی کہ جہیز سے بھرے ہوئے جہاز میں سوار ہو کر خود شادی کرنے ہسپانیہ آپہنچی۔ ٹیشیان، ولاسکز اور روبنز کے علاوہ پراڈو میں مریلو، ریبیرا اور گویا کی تصاویر بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ روبنز نے متناسب جسم کی خواتین کی تصاویر بنائی ہیں اور حسب عادت ننگی بنائی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے دودھیا سنگِ مرمر نرم ہو کر جسمانی ابھاروں اور پیچ و خم میں ڈھل گیا ہے۔ گویا کی بنائی ہوئی سیاہی مائل "بلیک گویا" سیریز کی چودہ تصویریں جنگ کی ہولناکیوں کے خلاف ایک مصوّر کا احتجاج ہیں۔

ہم پراڈو کے کمرہ نمبر ۱۲ میں گئے جو صرف ولاسکز کے لیے مخصوص ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اگر اس کمرے میں آویزاں تصاویر کو نیلام کیا جائے تو بارہ ارب روپے سے زائد رقم حاصل ہو سکتی ہے۔

باہر نکلنے سے پیشتر گویا کی "دوماجا" نامی تصاویر بھی سامنے آئیں۔ ایک میں ڈچیس آف ماجا شریف زادیوں کی طرح نیم ڈھکی چھپی صوفے پر نیم دراز۔ دوسری اسی حالت میں مگر بالکل برہنہ۔ ناقدین فن آج تک یہ طے نہیں کر پائے کہ ان ہر دو تصاویر میں سے کونسی کینوس پر پہلے اُتری۔ حالانکہ ظاہر ہے برہنہ تصویر بعد میں ہی بنائی جا سکتی ہے۔

ہم پراڈو سے باہر آئے تو ملحقہ باغ میں بلند ستون پر آویزاں گویا کا مجسّمہ دیکھ کر محترمہ پھر جذباتی ہو گئیں۔ "اوہ گویا.....!"

"گویا کہ"

"یہ تم گویا کو ہمیشہ گویا کہ کیوں کہتے ہو؟"

"ہمارے ہاں اُسے گویا کہ ہی کہتے ہیں۔"

"اور اب ہم راستروکی مارکیٹ میں چلیں گے۔" انھوں نے نہایت بے تکلفی سے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھتے ہوئے اعلان کیا۔

"اور اب ہم یعنی صرف میں واپس ہوسٹل جا رہا ہوں" میں نے ان کا ہاتھ بصد احترام نیچے کرتے ہوئے کہا "مجھے صبح قرطبہ جانے کے لیے سامان پیک کرنا ہے۔"

"اوہو! لیکن راستوں میں نوادرات ملتے ہیں" وہ گھبرا گئیں۔

"ایک دن کے لیے میں نے ضرورت سے زیادہ نوادرات دیکھ لیے ہیں اور اُن میں آپ سے ملاقات بھی شامل ہے۔"

"اوہ ..... لیکن ہو سکتا ہے کہ ہمیں وہاں کسی کباڑیئے کے سٹور میں سے اُن درجن بھر گویا کی تصاویر میں سے ایک ہاتھ لگ جائے جو ۱۸۷۰ء میں پراڈو سے چوری ہو گئی تھیں۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"پھر؟" وہ کھِل اُٹھیں۔

"پھر خدا حافظ مسز ..... کیا نام ہے آپ کا؟"

"مس جین ہاورڈ۔ آرٹ ٹیچر اِن باسٹن ہائی۔ یو۔ ایس۔ اے" وہ روہانسی ہو گئیں۔

"خدا حافظ مس ہاورڈ" میں نے جلدی سے کہا اور پھر چوروں کی طرح نظریں نیچے کئے تیزی سے چلتا ہوا پراڈو کے احاطے سے باہر آ گیا۔ مس ہاورڈ کے ساتھ میں میڈرڈ کو بھی خدا حافظ کہہ دینا چاہتا تھا اور اب میرا رُخ اٹوچا سٹیشن کی جانب تھا جہاں قرطبہ جانے کے لئے پیشگی ٹکٹ ملتے تھے۔ ایڈورڈ ہٹن نے اپنی کتاب "ہسپانیہ کے شہر" میں لکھا ہے "میڈرڈ کی سڑکیں ناپختہ اور گندی ہیں۔ یہاں کے لوگ منہ پھٹ اور بدتمیز ہیں۔ آب و ہوا ہسپانیہ بھر میں بدترین۔ ایک ایسا شہر جس سے کوئی بھی پیار نہیں کر سکتا۔" ہٹن کے آخری فقرے سے میں کلی طور پر متفق ہوں۔ کم از کم میرے اور میڈرڈ کے درمیان کسی قسم کا تعلق پیدا نہیں ہو سکا تھا۔ برسلز اور فرینکفورٹ کے ہمراہ میں نے میڈرڈ کو بھی یورپ کے ناپسندیدہ شہروں کی فہرست میں شامل کر دیا ہے۔

قرطبہ - دُور افتادہ

ایک سفید چمکتا گھر۔ روشن صحن میں ایک سانولا لڑکا ہاتھ ہلاتا ہوا۔ پستہ قد، زیتون کے چھدرے گرد آلود باغ۔ ڈھلوانوں پر سبزے کی ایک تہہ کی صورت بچھی انگوروں کی بیلیں، قدیم وضع کا ایک رہٹ جسے ایک تھل تھل کرتا بوڑھا بھینسا تھوتھنی جھکائے سُست روی سے کھینچ رہا تھا۔ پگڈنڈی پر چلتے ہوئے ایک سیاہ پوش پادری نے اپنا ہیٹ اُتار کر سر کھجلایا اور آنکھیں بھینچ کر ادھر دیکھنے لگا۔ ہریالی سے پرے ایک خشک ٹیلے پر کسی مُورش قلعے کے شکستہ درودیوار دکھائی دیئے۔ رفتار کا ساتھ نہ دے سکے اور پیچھے رہ گئے۔ ایک اُجاڑ قصبے کی تنگ گلی میں سے نکلتا ہُوا گدھے پر سوار ایک افلاس زدہ بوڑھا۔ شاہراہِ اندلس پر تربوزوں سے بھرا ایک ٹرک جو ایک عرصے سے اس الیکٹرک ایئرکنڈیشنڈ ٹرین کے پہلو بہ پہلو جُھولتا چلا آرہا تھا۔ گھُڑدوڑ کے کسی بدقسمت گھوڑے کی مانند آہستہ آہستہ پیچھے رہ گیا۔ فلیش کی سی تیز روشنی ایسی سفید دھوپ سرزمینِ اندلس پر اُتری ہوئی تھی اور ایئرکنڈیشننگ کے باوجود کھڑکی کے دبیز شیشے میں سے اس کی حدّت سرایت کرتی ہوئی میرے جسم کو چھُو رہی تھی۔

"بلییتے سینیور!" متحرک نظاروں کا تسلسل یکدم ٹوٹ گیا۔ چیکر میرے سامنے یوں ہاتھ بڑھائے کھڑا تھا جیسے فوراً مجھ سے مصافحہ کرلینا چاہتا ہو۔

"سی۔ ہاں!" میں نے سر ہلایا اور پاسپورٹ میں سے ٹکٹ نکال کر اُسے تھما دیا۔ "میں قرطبہ جارہا ہوں۔"

"قرطبہ؟" ٹکٹ چیکر نے بے یقینی کے عالم میں میری جانب غور سے دیکھا۔ لمحہ بھر کے

لئے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کہہ دے گا۔ قرطبہ؟ کونسا قرطبہ؟ تم شاید تاریخ سے واقف نہیں، مُوروں کا شہر قرطبہ تو مٹ بھی چکا۔ وہ چلے گئے اور ان کے شہر کا وجود بھی ختم ہو گیا۔ اب وہاں کھنڈر ہیں۔

"قرطبہ..... میڈرڈ سے...... میل........ ۵۴ پیسیتے نقد....." مَیں نے اُس کے ہاتھ سے ٹکٹ لے کر قرطبہ کی مہر پر اُنگلی جماتے ہوئے وضاحت کی۔

"آہا کوردوبا......" چیکر نے زور زور سے سر ہلایا اور اپنے موٹے جُثے کے اندر ہی اندر ہنسنے لگا۔ اس کی توند میں پھنسی چمڑے کی کالی پیٹی پسٹن کی طرح آگے پیچھے چھک چھک چلنے لگی۔

"وآہا کوردوبا" میں نے رعشہ زدہ پُتلیوں کے مانند جواباً سر ہلا کر اُس کی نقل اُتاری اور پھر قریب آکر نہایت احترام سے کہا "کوردوبا نہیں۔ قرطبہ سینیور جی۔ قرطبہ....... قبتہ الاسلام و مجمع اعلام الانام۔ اُم القریٰ و قرارۃ اولی الفضل والتقیٰ۔ اُم البلاد...... قرطبہ!"

"پوِتر مریم" چیکر نے فوراً اپنے سر سے ٹوپی اُتار کر سینے پر صلیب کا نشان کھینچا "مجھے مُوروں سے بچانا" اور بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

قرطبہ میرے لیے اب تک صرف تاریخ کی ضخیم کتابوں میں بکھرے اُن سحر انگیز ناموں میں سے ایک تھا جن کے بارے میں یقین نہیں آتا کہ ان شہروں کا وجود کبھی تھا یا اب بھی ہے۔ یُوں لگتا ہے جیسے ہرات، یارقند، سمرقند، ثمرنا، بلخ، ختن اور قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ، ایسے نام صرف داستانوں کے لیے اختراع کیے گئے۔ اِن ناموں کے شہر تاریخ کے صفحوں پر اُن نخلستانوں کی طرح ملتے ہیں جنھیں دیکھ کر جدید تہذیب میں جکڑے انسان کی آنکھ میں ٹھنڈک کے چشمے اُترتے ہیں اور وہ لمحہ بھر کے لیے اِس دنیا کی چوہوں کی دَوڑ سے الگ ہو کر سکون اور آشتی سے آشنا ہو جاتا ہے۔ "ایکس پنڈ یسیاں الیکٹرونیکا" یعنی برقی ایکسپریس اٹوچا سٹیشن میڈرڈ سے آج صبح دس بجے روانہ ہوئی تھی اور اِسے پورے تین بجے قرطبہ پہنچ جانا تھا، دو بجا چاہتے تھے اور گھڑی کی سوئیوں کا ایک اور دائرہ مکمل ہونے پر قرطبہ تاریخ کی قدیم

کتابوں کے کرم خوردہ صفحات سے نکل کر میرے سامنے ایک زندہ حقیقت کی صورت میں ظاہر ہونے کو تھا۔ میرے ذہن میں خوف کے ننھے منے سپنولیے سر اُٹھا رہے تھے۔ کیا تاریخ کے صفحوں میں پنہاں یہ نخلستان پیاس کے اُس بھانبڑ کو بجھا سکے گا جو اوائل عمری سے لے کر اب تک اس شہر اور اس کی تاریخ نے میرے اندر مچا رکھا ہے؟ دس ہزار میل کی مسافت کی گرد جو میرے جسم پہ جمی ہے کیا اس کے چشموں میں دُھل جائے گی؟...... یا پھر یہ نخلستان ایک سراب نکلے گا...... چاہتیں منتشر ہو جائیں گی۔ پیاس کی شدت اور سفر کی دھول سے اَٹے جسم میں اتنی سکت نہ رہے گی کہ وہ دوبارہ کسی نخلستان کی جانب رختِ سفر باندھے...... میں نے جب ٹکٹ چیکر کو ان طویل القابات کی فہرست سنائی تھی جن سے تاریخ دانوں نے قرطبہ کو نوازا ہے تو اس نے سینے پر صلیب بنا کر کہا تھا "پوتر مریم۔ مجھے مُوروں سے بچانا" یہ کیسا خوف ہے۔ جو مُوروں کی آخری سلطنت غرناطہ کے زوال کے ۴۷۷ برس بعد بھی ہسپانوی ذہن پر سوار ہے یا پھر یہ صرف اس لاشعور کو دبانے کی ایک شعوری کوشش ہے جو ہر لحظہ ذہن کے نہاں خانوں میں انھیں اپنی ذات کی نفی کرنے کے عمل سے روکتا ہے۔ تم اپنے آباؤ اجداد سے کیسے منہ موڑ سکتے ہو؟ تمھاری شریانوں میں عرب اور بربر خون ہمک رہا ہے۔ تمھارے بیشتر شہروں اور دریاؤں کے نام عربی میں ہیں۔ بولیرو کی تانوں کے ہمراہ گٹار کی سنگت نہ ہو تو اذان کی لَے لگتی ہے، تم کوئی کام شروع کرنے سے پیشتر "اوجالاّ" کہتے ہو جو دراصل انشاء اللہ ہے۔ اور تو اور یاسمین کے پھول ابھی تک "خاسمین" ہیں۔

"کاؤنٹ جُولین مجھے علم ہوا ہے کہ تمھاری افریقی ریاست سبوتا کے صحراؤں میں بے حد تُند خُو عقاب پائے جاتے ہیں۔ تم سبوتا واپسی پر مجھے شکار کے لیے چند عقاب روانہ کر دو۔"

کاؤنٹ جُولین نے کچھ عرصہ پیشتر اپنی نوجوان بیٹی لذریق شاہِ ہسپانیہ کے محل میں آدابِ شاہی کی تعلیم و تربیت کی غرض سے بھیجی تھی۔ ایک روز دریائے تاجو کے کنارے جُولین کی بیٹی حمام زریہ میں غسل کر رہی تھی۔ لذریق نے اُسے دیکھا۔ شاہانہ مزاج کے مطابق چند لمحوں کے لیے یُوں فدا ہُوا کہ اس کی عزت پر ہاتھ ڈال دیا۔ جُولین کو جو شاہِ ہسپانیہ کا باجگذار تھا، اپنی بیٹی کی عصمت کے لُٹ جانے کا علم ہُوا تو فوراً تولیدو آن پہنچا۔ شاہ کی فرمائش سُن کر

جولین نے مسکرا کر کہا "میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو افریقہ سے ایسے تند خو عقاب روانہ کروں گا جو آپ کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوں گے۔"

اگلے سال ۷۱۱ء میں کاؤنٹ جولین کی شکایت پر مسلمان تند خو عقابوں کی طرح ہسپانیہ پر جھپٹے اور چشم زدن میں اس کی فضاؤں پر چھا گئے۔ جولین نے اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا۔ ویسے گبن لذریق کے ہاتھوں جولین کی بیٹی فلوریڈا کے لٹنے کی داستان کو فرضی قرار دیتا ہے اور اس کی تصدیق ابوالفدا سے ہوتی ہے جو لکھتا ہے "حضرت عثمانؓ کے زمانے میں بھی عربوں کے جنگی جہاز ساحلِ اندلس پر حملہ آور ہوا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ ہسپانویوں کو کارتھیج کے محاصرے کے دوران میں مدد کی سزا دینا چاہتے تھے۔" بہرحال جولین نے کسی ذاتی عداوت کی بناء پر افریقہ کے گورنر موسیٰ بن نصیر کو ہسپانیہ پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی۔ موسیٰ نے فضا کو سازگار پایا مگر بھرپور حملے سے پیشتر خلیفہ ولید سے اجازت طلب کی۔ ولید نے پیغام بھیجا "باقاعدہ حملے سے پہلے ایک چھوٹا سا دستہ اندلس روانہ کرو تاکہ ہمیں ہسپانویوں کی اصل قوت کا اندازہ ہو سکے۔ میں مسلمانوں کی بڑی تعداد کو طوفانی سمندر کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑنا چاہتا۔" عرب صحرا نشین ہونے کے ناتے سے ہمیشہ سمندر سے خوف زدہ رہے اور یہ ترک ہی تھے جنہوں نے بعد میں یورپ کے اس مفروضے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا کہ تمام مسلمان سمندر سے خائف ہیں۔

ولید کے حکم کے مطابق موسیٰ نے ۷۱۰ء میں طریف نامی ایک آزاد غلام کو چار سو افریقی پیدل سپاہ اور ایک سو عرب گھڑ سواروں کی کمان دے کر چار بحری جہازوں میں اندلس کی جانب روانہ کر دیا۔ طریف ساحل پر لنگر انداز ہوا اور اس کی مختصر فوج خشکی پر اٹھارہ میل اندر تک بلا مقابلہ چلی گئی۔ ساحلِ اندلس پر آج بھی وہ مقام طاریف کہلاتا ہے جہاں تقریباً ساڑھے بارہ سو برس پہلے اس نام کے ایک آزاد غلام نے قدم رکھ کر مسلمان ہسپانیہ کی بنیاد کی پہلی اینٹ رکھی۔ طریف کی انتہائی کامیاب مہم نے موسیٰ بن نصیر کو مطمئن کر دیا اور وہ اندلس پر ایک باقاعدہ اور بڑے حملے کا منصوبہ بنانے لگا۔ پورا سال طنجہ کی بندرگاہ میں اس مہم کے لیے جنگی جہاز بنتے رہے اور موسیٰ اپنے محل میں اندلس کا نقشہ سامنے پھیلائے جنگی منصوبہ بندی میں مگن رہا۔ اگلے سال کے موسم بہار میں موسیٰ کے سپہ سالار طارق بن زیاد نے

پانچ ہزار سپاہ کی معیت میں افریقہ اور یورپ کے برّاعظموں کے درمیان حائل مختصر سمندری فاصلے کو جہازوں پر عبور کیا اور اُس بے نام چٹان کے پہلو میں لنگرانداز ہُوا جس نے بعد میں اُس کا نام پایا اور جبل الطارق کہلائی۔ کہتے ہیں جب طارق کے جہاز طنجہ سے چلے تو ساحل پر کھڑے سینکڑوں بربر جوش میں آکر سمندر میں کُود پڑے اور تیرتے ہوئے جہازوں پر جا سوار ہوتے۔ تاریخ دان گبن ساحل اُندلس پر جہازوں کے جلائے جانے والے واقع کے بارے میں شک کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے نزدیک اس قسم کا بے مقصد اور سنسنی خیز فعل طارق ایسے باشعور جرنیل کے ہاتھوں ممکن نہیں۔ جونہی طارق خشکی کے اندر بڑھا اردگرد کے چھوٹے حکمرانوں نے لذریق کو اطلاع کر دی۔ سب سے پہلے لذریق کا ایک نائب ایڈیکو مقابلے پر آیا مگر چند گھنٹوں کی لڑائی کے بعد میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ ایڈیکو کی شکست سے لذریق کو موقع کی نزاکت کا احساس ہُوا اور وہ پوری تیاری کے ساتھ اپنے ڈیوک، کاؤنٹ اور بشپ ہمراہ لیے ایک لاکھ سپاہ کی قیادت کرتا ہُوا آگے بڑھا۔ آخری جنگ کی جائے وقوعہ کے بارے میں تاریخ دانوں میں اختلافِ رائے ہے۔ بیشتر عرب تاریخوں میں اسے وادئ برباط میں جھیل لاجنڈا کے کنارے بتایا گیا ہے۔ لیکن گبن کہتا ہے کہ یہ جنگ قادس کے قصبے کے نواح میں شریس کے آس پاس لڑی گئی۔ اسی مقام پر طارق نے اپنی سپاہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا "میرے بھائیو دشمن تمہارے سامنے ہے اور سمندر تمہارے عقب میں۔ کہاں جاؤ گے۔؟ اپنے قائد کے پیچھے چلے آؤ کیونکہ میں نے عہد کر لیا ہے کہ یا تو جان دے دوں گا اور یا ہسپانویوں کو مسل کر رکھ دُوں گا"۔ قاضی ولی محمد نے اس تقریر کا حوالہ دیتے وقت "سمندر تمہارے عقب میں" کی بجائے "جھیل تمہارے عقب میں" لکھا ہے جس سے اس رائے کو تقویت ملتی ہے کہ جنگ جھیل لاجنڈا کے کنارے ہی لڑی گئی۔ تین دن تک فریقین میں چھوٹی موٹی جھڑپیں ہوتی رہیں اور چوتھے روز ۱۹ جولائی ۷۱۱ء کو باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ لذریق ہاتھی دانت کی بنی ہوئی رتھ پر سوار میدان میں آیا جسے دو سفید خچر کھینچ رہے تھے قلیل تعداد میں ہونے کے باوجود مسلمانوں کے حملے میں اتنی شدت تھی کہ ہسپانویوں کے قدم اکھڑنے لگے۔ موتیوں کی لڑیاں سر پر لپیٹے، ریشم کے سنہری لبادے میں ملبوس لذریق یقیناً اس وقت

کوکوس رہا تھا جب اس نے خود صحرائی عقابوں کی خواہش کی تھی۔ جب شکست یقین کی حدود کو چھونے لگی تو لذریق شاہی رتھ سے اُترا اور راوریلیا نامی سفید گھوڑے پر سوار ہو کر میدانِ جنگ سے بھاگ نکلا۔ بقول گبن وہ ایک بہادر کی موت مرنے کی بجائے وادی الکبیر کے پانیوں میں ڈوب مرا۔ ہسپانیویوں کا عقیدہ ہے کہ وہ ایک غار میں گوشہ نشین ہو گیا اور باقی عمر عبادت میں گذار دی۔ پادری کہتے ہیں کہ "کافروں" سے شکست کھانے کی سزا میں اُسے خدا نے ناگنوں سے رینگتے ہوئے ایک ایسے گڑھے میں ڈال دیا جہاں وہ چلا چلا کر فریاد کرتا تھا "ناگنیں میرے جسم کے اُس حصے کو ہڑپ کر رہی ہیں جس کی مدد سے میں نے تمام تر گناہ کیے۔" اور ایک مسلمان تاریخ دان ابن اطہر نے لذریق کے انجام کے بارے میں لکھا ہے "گوتھوں کے بادشاہ لذریق کا سفید گھوڑا دلدل میں پھنسا کھڑا تھا۔ ہیروں سے جڑی کاٹھی پر لبادۂ شاہی رکھا تھا۔ کچھ فاصلے پر اس کا ایک جوتا اور ایک کلائی لباس پڑا تھا، وہ یا تو مارا گیا یا فرار ہو گیا۔" لذریق سا پہاڑ راستے سے ہٹا تو طارق کو گویا پورا ہسپانیہ ایک وسیع میدان کی صورت نظر آیا جہاں کہیں کہیں شہری ریاستوں کے ٹیلے اُبھرتے تھے مگر بیشتر حصہ سپاٹ اور رکاوٹوں سے مبرا تھا۔ اس نے فوج کو چار حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ آرکی ڈونا کی طرف۔ دوسرا البیرا یعنی وادیٔ غرناطہ کی جانب۔ تیسرا مُغیث رُومی کی قیادت میں قرطبہ روانہ کیا گیا اور بقیہ فوج کے ہمراہ طارق خود ٹولیدو کی طرف بڑھا۔ احتیاط پسند مُوسیٰ کو جب طارق کی مسلسل کامیابیوں کی خبریں موصول ہوئیں تو اُس نے اپنے جرنیل کو مزید پیش قدمی کرنے سے روک دیا۔ کچھ لوگ اِس نامناسب حکم میں موسےٰ کا جذبۂ حسد پنہاں دیکھتے ہیں۔ ادھر مُوسےٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے طارق کی سپاہ نے اپنے گھوڑوں کی ڈوریں بدستور ڈھیلی چھوڑے رکھیں یہاں تک کہ گرمیوں کے آخر نے اُنھیں ہسپانیہ کے دوسرے سرے پر واقع ٹولیدو کی فصیلوں کے سائے تلے دیکھا۔ اس اثناء میں مُوسےٰ نے اپنے نافرمان جرنیل کا تعاقب کرنے کی ٹھانی۔ اور جون ۱۲ء میں افریقہ کی گورنری اپنے سب سے بڑے بیٹے کو سونپ کر دس ہزار شامیوں اور آٹھ ہزار بربروں کی قیادت میں ہسپانیہ کے ساحل پر اُترا۔ طارق کے چھوڑے ہوئے شہروں قرمونہ اور اشبیلیہ کو روندتا گلیشیا اور لیون کے پہاڑوں کو عبور کرتا وہ ٹولیدو پہنچا۔ اس نے طارق

کہ حکم عدولی کی بنا پر چابک سے پیٹا اور فی الفور معزول کر دیا۔ اب موسیٰ کا ارادہ تھا کہ وہ کوہ پیرانیز عبور کر کے اطالیہ، فرانس اور جرمنی کو زیر کرے، پھر ڈینیوب کے کنارے کنارے پیش قدمی کرتا ہُوا بحیرہ اسود تک جا پہنچے اور قسطنطنیہ ختم کرنے کے بعد سیدھا شام میں خلیفہ ولید کے دربار میں پیش ہو کر اپنی فتوحات کو ایک ایسے نیم دائرے پر محیط کرلے۔ جس میں تقریباً پورا یورپ اور ایشیائے کوچک شامل تھا۔ مگر طارق کے چند ساتھی دمشق پہنچ گئے اور انھوں نے اپنے سپہ سالار کی معزولی کو بنیاد بنا کر خلیفہ ولید کو موسیٰ کے خلاف بھڑکا دیا۔ لوگا کے مقام پر خلیفہ کے قاصد نے موسیٰ کو جا لیا اور اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر واپسی کا حکم سُنایا۔ موسیٰ یورپ فتح کرنے کی حسرت دل میں لیے واپس دمشق لوٹا مگر اس شان و شوکت کے ساتھ کہ اس کے گھوڑے کے پیچھے چار سو ہسپانوی شہزادے تاج پہنے چل رہے تھے شاہانہ لباس میں ملبوس سینکڑوں شہزادیاں پالکیوں میں سوار ہیں اور چالیس ہزار سفید فام غلام مالِ غنیمت اُٹھائے چلے آ رہے ہیں۔ یہ بے مثال جلوس فلسطین پہنچا تو ایک قاصد خلیفہ ولید کی شدید علالت کی خبر لے کر آیا۔ ساتھ ہی ولید کے بھائی سلیمان کا پیغام آیا کہ جلوس فلسطین میں ہی روک دیا جائے تاآنکہ ولید فوت ہو جائے اور اس کی جگہ سلیمان تخت نشین ہو جائے، یوں سلیمان اس فاتحانہ جلوس کا استقبال کر کے اندلس کی فتح کا سہرا اپنے سر باندھنا چاہتا تھا۔ اس نقطے پر موسیٰ کا مستقبل قابلیت سے دامن چھڑا کر قسمت کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ اس کے لیے فوراً رُک جانا یا دمشق کی طرف بڑھنا یکساں پُر از خطر تھا۔ رُکنے کی صورت میں ولید خلاف توقع صحت مند ہو جائے تو سازش کا جُرم اور اگر بدستور دمشق کی جانب گامزن رہے تو ولید کی موت کی صورت میں نئے خلیفہ سلیمان کے قہر کا سامنا۔ موسیٰ نے حال کی حکمرانی پر بھروسہ کیا اور رُکے بغیر آگے بڑھتا رہا۔ فروری ۷۱۵ء میں فاتح اندلس دمشق میں داخل ہُوا اور اُس کا استقبال مسجد اُمیہ کی وسیع عمارت میں کیا گیا۔ سینکڑوں تاجدارانِ یورپ سرنگوں ہو کر خلیفہ کے حضور آداب بجا لائے۔ کہتے ہیں اس موقع پر موسیٰ نے دوسرے مالِ غنیمت کے علاوہ خلیفہ کی خدمت میں وہ تاریخی میز بھی پیش کی جس کے بارے میں روایت ہے کہ اسے حضرت سلیمانؑ کے جنوں نے تخلیق کیا تھا۔ اسی نسبت سے یہ سلیمانؑ کی میز کہلائی بیت المقدس

کی فتح کے بعد رُومی اس میز کو یورپ لے آئے اور بعد ازاں یہ گوتھک بادشاہوں کے ہاتھ لگی جو قیمت سنوارنے کے لالچ میں یکے بعد دیگرے درجنوں بادشاہوں نے اسے جواہرات سے سجایا۔ مسلمانوں کے حملے کے وقت یہ میز تولیدو کے کلیسائے اعظم میں دھری تھی۔ طارق نے اسے ایک فرار ہوتے ہوئے راہب سے چھینا جس نے یہ میز اپنے لبادے میں چھپا رکھی تھی۔ ایک روایت کے مطابق اس کے تین سو ساٹھ پائے تھے اور جس وقت موسیٰ نے اسے خلیفہ کے حضور پیش کیا تو ان میں سے ایک موجود نہ تھا۔ طارق نے اس موقع پر آگے بڑھ کر وہ ایک پایہ اپنے لباس میں سے نکال کر میز پر رکھ دیا اور یوں ثابت کر دیا کہ اندلس کا اصل فاتح وہ ہے نہ کہ موسیٰ بن نصیر۔ خلیفہ نے جب اندلس کے اتنی آسانی سے فتح ہو جانے کا سبب دریافت کیا تو موسیٰ نے جواب دیا "وہاں کے شہزادوں کی نامردی" لیکن یہ جواب اس نے خلیفہ ولید کو نہیں دیا تھا کیونکہ اس کی جگہ اب خلیفہ سلیمان تخت نشین تھا۔ مُوسےٰ کا شاندار استقبال اس بات کی ہرگز دلیل نہ تھا کہ سلیمان اس کی حکم عدولی بھلا بیٹھا ہے بلکہ اس نے تو صرف اب تک بوڑھے مُوسےٰ کو اُس تاریخی کھیل میں مرکزی کردار ادا کرنے کی اجازت دی جب تک کہ فتحِ اندلس کی شہرت اُس کے نام منتقل ہو کر تاریخ کے صفحوں پر نہ اُتر گئی۔ یہ کھیل ختم ہُوا تو اُسے موجودہ خلیفہ کی حکم عدولی کے الزام میں عدالت میں پیش کیا گیا۔ دو لاکھ درہم جرمانے کے علاوہ تمام جائیداد چھین لی گئی۔ کل مراعات سے محروم کر دیا گیا اور پھر برسرِ عام کوڑے لگانے کے بعد شاہی محل کے باہر تپتی دھوپ میں ایک ستون سے باندھ دیا گیا۔ جرم تھا "دروغ گوئی اور اَنا"۔ آتشِ نمرود تو ایک معجزے سے سرد ہو گئی مگر اس کے بعد مطلق العنان حکمرانوں کی آتشِ انتقام کو ٹھنڈا کرنے کے لیے شاید خدا کے پاس بھی کوئی معجزہ باقی نہیں رہا۔ سلیمان بھی آدھی دنیا کا حکمران تھا۔ وہ مہندی سے سرخ کی ہوئی لمبی داڑھی والے عمر رسیدہ موسیٰ کو ذلت کے عمیق گڑھوں میں دھکیلنے کے باوجود مطمئن نہ ہُوا اور اس نے اشبیلیہ کے گورنر مُوسےٰ کے بیٹے عبدالعزیز کو قرطبہ میں تہ تیغ کروا دیا۔ جلاد نے عبدالعزیز کا سر ایک طشتری میں سجا کر مُوسےٰ کے سامنے رکھا اور پوچھا "کیا تم اس باغی کے خدوخال پہچان رہے ہو؟" مُوسیٰ نے جواب دیا "میں صرف اپنے بیٹے کے خدوخال

پہچان رہا ہوں؟ بالآخر مُوسیٰ کا بڑھاپا اور اس کی حرماں نصیبی اُسے بادشاہوں کے غیظ و غضب
سے بلند لے گئے اور وہ چند برس بعد مکہ میں فوت ہو گیا۔ تاریخ دان مُقری نے لکھا ہے کہ
آخری مرتبہ فاتح اُندلس مُوسیٰ بن نصیر کو وادئ القرا (حجاز) کے ایک چھوٹے سے گاؤں
میں بھیک مانگتے دیکھا گیا تھا۔

ایک اُجڑا ہُوا باغ۔ بیچ میں ایک شکستہ کنواں جیسے صدیوں سے سُوکھا پڑا ہو۔ اینٹیں
اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں۔ خشک رَوِشیں۔ پژمردہ کیاریاں۔ پھول کملائے ہوئے۔ پتوں سے عاری
مُنڈ پیلوں کی شاخیں کسی لاغر کی پسلیوں کی مانند قدیم دیواروں سے چمٹی ہوئی۔ گاڑی آہستہ
تی جارہی تھی۔ پھر نیلے آسمان کو ایک پلیٹ فارم کی ٹین کی چھت نے چھیدا اور ڈھانپ
لیا۔ چھت سے ایک چھوٹا سا بورڈ جھُولتا نظر آیا۔ "کاردوبا" قرطبہ! مُغیث رُومی نے انجیر کے
درخت پر چڑھ کر اپنا عمامہ فصیل پر پھینکا اور اس کی مدد سے شہر کے اندر کُود گیا۔ پہلے مسلمان
فاتح کی حیثیت سے۔ مَیں اپنا رُک سیک اُٹھا کر اس کے پلیٹ فارم پر اُترا۔ ایک سیاح کے طور
پر اس بزرگ شہر کا سٹیشن کالا شاہ کاکو سے بھی گیا گذرا تھا۔ کہیں یہ نخلستان سراب ہی نہ ہو؟
ل نے دھک سے دُہائی دی۔ مَیں دیر تک باہر جانے کے راستے سے منہ موڑے چھت
سے ٹنگے بورڈ پر لکھے سات حرفوں کے مجموعی تأثر کو اپنی پیاسی آنکھوں میں سموتا رہا ——
"کاردوبا!" یہاں تک کہ گاڑی کے ڈبے آپس میں بھڑے۔ حرکت میں آئے اور ایک ایک
کے کاردوبا کے بورڈ کے نیچے سے سرکتے سرکتے پلیٹ فارم سے نکل گئے۔

یورپ میں ایک رسم بلائنڈ ڈیٹ نام کی ہے۔ آپ کے کسی دوست کی گرل فرینڈ آپ
اکیلا پا کر (دوست بھی ساتھ ہوتا ہے) سر سے پاؤں تک آپ کا تفصیلی جائزہ لے کر
چے گی؟! ان دنوں میری سہیلی اینجلا بھی بالکل بے کار ہے کیوں نہ ان دونوں کا تعارف کروا
یا جائے؟ چنانچہ وہ اُس کی خوبصورتی اور شُستہ مذاق کی تعریف میں زمین و آسمان کے
لابے ملا دے گی اور اسی انداز میں اپنی سہیلی کے سامنے آپ کی وجاہت کی داستانیں سُنا کر
لی مرتبہ اُس بی بی کو بھی ہمراہ لے آئے گی۔ ویسے یہ دوہری ترغیب سراسر رسمی ہوتی ہے۔
رنہ فریقین اپنی اپنی صنعت کے مطابق "سکرٹ میں ہو! کچھ بھی ہو!" اور "پتلون پہنے! کوئی

بھی جاندار کے منولے پر یقین رکھتے ہیں۔ بہرحال اس ان دیکھی بی بی کے ساتھ آپ کا تعارف کروا دیا جاتا ہے اور باقی معاملہ "ہمتِ مرداں یا سویڈش لڑکی کی صورت میں "ہمتِ عورتاں" پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس انجانی ملاقات کا نام بلائنڈ ڈیٹ ہے یعنی آنکھیں بند کر کے بحرِ دوران آنکھیں بند کر کے کود پڑنے کا نام۔ صرف کودنے کے بعد ہی پانی کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ..... کچھ اسی طور قرطبہ کے ساتھ بھی آج میری بلائنڈ ڈیٹ تھی۔ تاریخی کتابوں نے "میچ میکرز" کا فرض سرانجام دیتے ہوئے اُس کے حُسن کے تذکروں سے مجھے بے چین کر دیا تھا۔ لیکن قابلِ فہم طور پر اس پہلی ملاقات کے موقع پر میرے دل میں کھُد بُد مچی تھی۔ میں سٹیشن سے باہر قدم رکھنے سے ہچکچا رہا تھا۔ جانے یہ خاتون میری توقعات پر پوری اُترتی ہے یا مجھ غریب کو خواہ مخواہ پھانس لیا گیا ہے۔ میں نے بُکنگ کلرک سے ٹورسٹ آفس کا پتہ دریافت کیا اور جھجکتا ہوا ملاقات کے لیے سٹیشن سے باہر آ گیا۔

عمارت سے اگری کلتور نامی ایک خشک اور بے ربط باغ سے بائیں ہاتھ پر کالیے جنرل کی سڑک تھی اور اس کے ساتھ کالیے گران کا پی تان کی شاہراہ شروع ہوتی تھی۔ وہی جدید دکانیں۔ جہازی ہوٹل۔ نیون سائن، ٹریفک سگنل، لاٹری کے ٹکٹ بیچنے والے بوڑھے۔ قرطبہ بھی میڈرڈ کا چھوٹا بھائی لگ رہا تھا۔ یہ تو وہی عام سا شہر ہے۔ میرا دل ڈوبنے لگا... بلائنڈ ڈیٹ بالکل بلائنڈ تھی۔ ایک قہوہ خانے کے ویٹر سے ٹورسٹ آفس کا راستہ دریافت کیا تو وہ جھاڑن کاندھے پر ڈال کر میرے ساتھ ہو لیا۔ ٹورسٹ آفس بند تھا۔ شیشے کے دروازے سے اندر ایک تختی لٹک رہی تھی جس پر کچھ ہندسے درج تھے۔ ویٹر نے نچلا جبڑا کھینچ کر منہ لمبا کیا اور کھلی ہتھیلی پر سر رکھ کر آنکھیں جھپکانے لگا یعنی بند ہے۔ قیلولے کے لیے۔ مہربان ویٹر کا شکر ادا کرنے کے بعد میں وہیں فٹ پاتھ پر اپنے رک سیک سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا اور اپنی آنکھوں کے سامنے متحرک اجسام کا جائزہ لینے لگا۔ نیم درازی کی اس سطح سے سب سے پہلے شہر کے باشندوں خصوصاً خواتین کی ٹانگوں کی بناوٹ سامنے آتی ہے۔ نظر اُوپر اُٹھتی ہے تو جسم کے بقیہ خطوط کا حجم آشکارا ہوتا ہے۔ قرطبہ کی دوشیزاؤں پر زیتون تیل اور پائیلیا یعنی پلاؤ کے اثرات نمایاں تھے۔ پلنگ کے پایوں ایسی موٹی اور گھیلی ٹانگیں

چھوٹے قد اور چشمِ غزال بھی کچھ اتنی عام نہ تھی۔ کبھی میں دکانوں پر آویزاں بورڈ پڑھنے لگتا، مفہوم تو سمجھ میں نہ آتا البتہ ان کے نیچے کا رد و بدل دیکھ کر عجیب سکون سا محسوس ہوتا۔ ٹورسٹ آفس کے پہلو میں ایک فٹ پاتھی قہوہ خانہ تھا جس کی ایک میز پر بیٹھا کوئی غیر ملکی جوڑا کافی کے ہر گھونٹ کے بعد یہ لازم سمجھتا کہ لبوں کے ذریعے ایک دوسرے کے گالوں کا درجۂ حرارت معلوم کیا جائے۔ اُن کے سامنے دو موٹی قرطبیں چہروں کے آگے ہسپانوی پنکھے پھیلائے بیٹھیں بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ میں صرف اُن کی سُرمے سے بھری آنکھوں کے پھیلنے اور سُکڑنے سے اندازہ لگا لیتا کہ اب غیر ملکی جوڑا کافی پینے میں مشغول ہے یا صرف مشغول ہے۔ اوقات اُن کی آنکھیں مزید پھیلنے سے انکار کر دیتیں تو وہ جھٹ سے میز پر دھرا شراب گلاس اُٹھا کر حلق میں انڈیل لیتیں۔

"ہیلو" میں نے قہوہ خانے کے ویٹر کو پکارا جو پچھلے پندرہ منٹ سے ہاتھ میں ایک ...ی لیے میری طرح فٹ پاتھ پر سے گذرنے والی نسوانی مخلوق کو بنظرِ غور دیکھ رہا تھا۔ ...س نے بے یقینی کے عالم میں میری جانب مُڑ کر دیکھا تو میں نے آنکھ میچ کر اُسے اپنی طرف ...نے کا اشارہ کر دیا۔

"سی سینیور!" ویٹر کو میرے لبوں پر آنے کے لیے خاصا جُھکنا پڑا۔

"ایک ہورشاتا ڈی شوفا"

"یہیں فٹ پاتھ پر؟ اُس نے مسکرا کر دریافت کیا۔

"کیا حرج ہے؟" میں نے ہاتھ پھیلا کر کہا۔

ویٹر میری اس شانِ فقیری سے بے حد متاثر ہوا اور اپنی طشتری دَف کی مانند بجاتا ہوا ...ہ خانہ کے اندر سے ایک ہورشاتا لے آیا۔

"بس لیجیئے" اس نے گلاس مجھے تھمانے سے پیشتر طشتری میں رکھا اور آگے کر دیا۔

ہورشاتا کے ناریل ملے دودھ کا ایک گھونٹ بھر کے میں پھر اہلِ قرطبہ کی جانب یکھ یوں چاہیے کہ ان کے جسموں کے زیریں حصوں کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"سینیور کیا آپ میرا انتظار کر رہے ہیں؟" ایک خوش مزاج بڑی بڑی آنکھوں والی لڑکی

منی سکرٹ کو گھٹنوں پر کھینچتی میرے پاس آ بیٹھی ..... 'بانڈ ڈیٹ؟' میں نے سوچا۔ اللہ میاں جب دیتا ہے چھپر پھاڑ کر دیتا ہے اور یہاں تو چشمِ غزال بھی عام تھی۔

"ہورشانا پیجئے گا؟" میں نے خوش دلی سے دعوت دی۔

"نو" ہر دو چشمِ غزال بڑے تباہ کن انداز میں جھپکیں۔ اس نے اپنی کہنیاں منی سکرٹ میں سے دھیرے دھیرے پھسلتے گھٹنوں پر جمائیں اور دودھیا باہوں نے ایک سفید فریم کی مانند اس کے خوبصورت چہرے کا احاطہ کر لیا۔

"ماما میا" میرے منہ سے بے اختیار ایک ایسا فقرہ ادا ہو گیا جو ایسا ہی خوبصورت چہرہ دیکھنے کے فوراً بعد اطالوی نوجوان مصنوعی طور پر بے ہوش ہو جانے سے قبل ہاتھ لہرا کر بولتا ہے۔ پنجابی میں اسے "ہائے نیں میریئے مائے" کہہ لیجئے۔

"تو پھر اگر آپ کو فرصت ہو تو آج شام ......" میں نے ملاقات کے لیے تمہید باندھی ہی تھی کہ وہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی اور قدرے بے رُخی سے کہنے لگی "سینیور میں ٹورسٹ آفیسر ہوں۔ آپ کو آفس کے سامنے فٹ پاتھ پر یوں لیٹا دیکھ کر جان گئی تھی کہ آپ میرا ہی انتظار کر رہے ہیں ..... آئیے دفتر کے اندر چلتے ہیں۔"

چمکتی دوپہر میں میری اُمید دل پر اوس پڑ گئی۔ چھپر اپنی جگہ موجود قائم و دائم تھا۔ اللہ میاں فی الحال اسے پھاڑنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

"مزکیتا کیتھڈرل صبح آٹھ بجے سے ڈیڑھ بجے تک اور پھر پانچ بجے سے ساڑھے سات بجے تک سیاحوں کے لیے کھلتا ہے۔" اس نے دفتر کا دروازہ کھولتے ہوئے اطلاع فراہم کی۔

"مزکیتا کیتھڈرل؟" میں رُک سیک گھسیٹتا اُس کے پیچھے چلا آیا۔

"آپ مسجدِ قرطبہ کہہ لیں .... میں جانتی ہوں کہ اکثر مشرقی سیاح قرطبہ صرف اس مسجد کی خاطر آتے ہیں۔"

"مسجد کے علاوہ قرطبہ میں اور کون کون سی قابلِ دید تاریخی عمارتیں ہیں؟" ٹمان ٹزدان کا لبادہ اُتار کر میں نے ایک طرف رکھ دیا اور ایک مرتبہ پھر سیاح کے رُوپ میں آ گیا۔

"میں یہ بھی جانتی ہوں کہ قابلِ دید تاریخی عمارتوں سے تمھاری مراد صرف مُورش عمارتیں ہیں"
میری سابقہ لیڈی لُوتے چند سیاحتی کتابچے کاؤنٹر سے اُٹھا کر میرے حوالے کر دیئے: "شہر سے باہر سیرا مورینو کے دامن میں مدینۃ الزہرا کے کھنڈرات ہیں۔ وہاں بس نہیں جاتی ٹیکسی آنے جانے کے دو سو پیسیٹے لے گی۔ وادی الکبیر کی مُورش پن چکیاں اور رُومی پُل..... تمھارے لیے پُل۔ القصر اور پرانے حماموں کے کھنڈر۔ قدیم فصیلِ شہر کے دروازے اور عربوں کے زمانے کا قدیم قرطبہ جو شہر کا خوبصورت ترین حصہ ہے"۔
"عربوں کے زمانے کا قرطبہ"..... میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ نخلستان سے آنے والی بادِ نسیم کا پہلا جھونکا "یعنی یہ جو شاہراہِ گراں کا پی تال اور کا لیے جنرل ازمو وغیرہ ہیں تو یہ......"
"یہ تو جدید قرطبہ ہے ......اور کچھ ؟"
"ہاں دو چار روز قیام کا ارادہ ہے۔ اگر عہدِ قدیم کی کوئی کارروان سرائے ابھی تک شہر موجود ہو تو اس کا پتہ بتلا دیجیے .... شرط یہ ہے کہ وہاں اُونٹ باندھنے کا تسلی بخش انتظام ہونا چاہیئے"۔
"اُونٹ ؟" اس کی آنکھیں مزید پھیلیں اور گردن لمبی ہو گئی کیونکہ وہ تھوک نگلنے کی کوشش مصروف تھی۔
"ہاں ہاں اونٹ سٹیشن پر ہی چھوڑ آیا ہوں"۔
"یُو جوک ؟" چشمِ غزال نے بے دلی سے پوچھا۔
"یس آئی جوک...... بہرحال چند روز کے لیے کسی سستی رہائش کا متلاشی ہوں"
"بونیتو" وہ یُوں کھلکھلا کر ہنسی کہ میرے اندر کا سیاح ڈانواں ڈول ہُوا اور رڑان ژدان اُسے ھوبی سپٹر اوے کراس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ "ماما میا" کے ممنوعہ الفاظ کی ادائیگی سے وہ سنجیدہ ہو گئی اور اس نے بے حد سرکاری انداز میں مجھے شہر کے متعدد پانسیان اور ہوٹلوں کے نے بتانے شروع کر دیئے۔
"پانساں ال کانڈے ...... پچاس پسیتے ! ہوٹل ٹوریوڈور...... ستر پسیتے"۔ وہ کسی ل یا پانسیان کا نام رجسٹر سے پڑھتی اور پھر گردن میں خم دے کر میری جانب یوں دیکھتی جیسے

نکاح خواں منظوری کی اجازت چاہتا ہو۔ مَیں بلا سوچے سمجھے اسے مہنگا قرار دے کر انکار میں سر ہلا دیتا۔ اس پرچشم غزال اُو ہنہ کر کے منہ کچھ یُوں سکیٹرتی کہ جیسے اس نے کوئی ایسی نتھ پہن رکھی ہے جو تنگ ہونے کی وجہ سے اُسے زبردست کُھجلی کر رہی ہے۔ ہوٹلوں کے کرائے گراں تو کجا دیگر یورپی شہروں کی نسبت بزبانِ انگریزی "ڈرٹ چیپ" تھے۔ مگر میں اس ڈوان ژوان کا کیا کرتا جواب مکمل طور پر مجھ پر حاوی ہو چکا تھا اور جو دنیا و مافیہا سے بے خبر صرف اس کی ناک کے سُکڑنے کا منتظر رہتا تھا۔ درجن بھر ہوٹلوں کے نام گنوانے کے بعد شاید اس نے میرے چہرے سے ہی میرے دل کا مضمون بھانپ لیا اور وصل کا رجسٹر بند کر کے بولی "آپ کے رُک سیک پر خیمہ بندھا ہُوا ہے۔ کیمپنگ میونسپل میں تشریف لے جائیے۔۔۔۔ تین پسینے۔۔۔۔۔" اور اس نے مزید گفت و شنید کے مواقع "خدا حافظ" کی مُہر لگا کر مسدود کر دیتے۔ مَیں نے ایک نظر اُس بھاری پتھر پر ڈالی جسے چُوم کر میں رکھ نہ دیتا اور پھر رُک سیک کے بھاری پتھر کو اُٹھا اور اُسے کاندھے پر ڈال کر باہر آ گیا۔

کیمپنگ میونسپل قرطبہ شہر سے دو میل کے فاصلے پر زیتون کے ایک باغ میں واقع ہے۔ دیگر سہولتوں کے علاوہ یہاں ایک نہایت شاندار نہانے کا تالاب بھی ہے۔ غسلِ جمانی کو جی چاہے تو تالاب میں ڈُبکی لگا لیجئے اور اگر صرف غسلِ آفتابی کے شوقین ہیں تو کنارے پر ایستادہ گھاس پھونس کی مخروطی جھونپڑیوں کے باہر لیٹ کر جسم سنولا لیجئے۔ غسلِ آفتابی قابلِ فہم طور پر میرے جیسے سانولے حضرات کے لیے کچھ اتنا مفید ثابت نہیں ہوتا۔ میں ایک کونے میں خیمہ نصب کرنے کے بعد ابھی اپنے اس عارضی گھر کی نوک پلک درست کر رہا تھا کہ اس کا پردہ سرکا اور ایک گھنگریالے بالوں والی گندمی رنگ کی چھوٹی سی بچی نے اندر جھانک کر "السلام علیکم" اُس کے پتلے دُبلے جسم میں سے مجھے "ع" کی اتنی کھنکتی ہوئی ادائیگی کی اُمید نہ تھی۔

"وعلیکم السلام" میں نے بھی کسی دیہاتی مولوی کی طرح زبردستی "ع" حلق میں سے ادا کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس نے ہنستے ہوئے کافی کا ایک پیالہ اور بسکٹوں کی ایک پلیٹ میرے سامنے رکھی اور پھر پردہ گرا دیا۔ مَیں سوچنے لگا، یا اللہ یہ اپنے عرب نیانی تو نہ

ہوئیں اِس اُجڑے دیار سے کوچ کر گئے۔ یہ عربی بولنے والا ننھا فرشتہ کہاں سے ٹپک پڑا مزید تحقیق کے لیے میں پیالا اور پلیٹ اُٹھا کر باہر آ گیا۔ میرے خیمے سے چند گز کے فاصلے پر وہ بچی گھاس پر آلتی پالتی مارے آئس کریم کھانے میں مشغول تھی۔ مجھے دیکھتے ہی پھر کھکھلا کر ہنس دی اور ایک نزدیکی خیمے کے اندر بھاگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد خیمے کا پردہ اُٹھا اور اُسی ننھے فرشتے سے مُشابہ مغربی افریقی خدوخال کا حامل ایک نوجوان باہر آ گیا۔

"السلام علیکم مستنصر" اُس نے نہایت گرمجوشی سے ہاتھ آگے کر دیا۔ میں نے حیرت زدہ ہو کر پلیٹ زمین پر رکھی اور ہاتھ ملایا۔

"میرا نام حسن ہے اور مَیں مراکشی ہوں۔ میری بچی زبیدہ کو کیمپنگ میں داخلے کے رجسٹر کے مطالعے کا بہت شوق ہے۔ ہم شام کی کافی پی رہے تھے کہ وہ دوڑی دوڑی آئی اور کہنے لگی۔ آبا جان مستنصر نامی ایک پاکستانی ابھی ابھی کیمپنگ میں آیا ہے، مَیں اُسے دیکھ آؤں؛ اور پھر خود ہی کافی تیار کر کے آپ کے پاس لے گئی۔ آئیے خیمے کے اندر چلتے ہیں"

خیمے کے اندر حسن کی سادہ مگر خوش شکل بیوی اور سات بچے سلسلہ وار ایک قالین پر بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی پُورا خاندان اُٹھ کھڑا ہُوا اور حسن نے باری باری سب سے میرا تعارف کروایا۔ ہر ایک کے حلق میں سے وہی خصوصی "ع" والی السلام علیکم برآمد ہوئی۔ کافی سے فارغ ہو کر ہم دونوں ایک کونے میں جا بیٹھے اور حسن ملی جُلی انگریزی اور عربی میں مجھے اپنے بارے میں بتانے لگا "میرا پیشہ وکالت ہے۔ ہم ہر سال گرمیوں کی چھٹیاں جنوبی فرانس میں گذارتے ہیں۔ واپسی پر قرطبہ میں ضرور ٹھہرتا ہوں تاکہ میرے بچوں کو معلوم ہو کہ ہم ہمیشہ سے ایسے نہ تھے۔ یونانی فلسفہ، موسیقی، علمِ حساب، علمِ بدن اور دیگر بیشمار علوم ہمیں نے یورپ کو عطا کیے اور پھر ہیں سال میں ایک مرتبہ جمعہ کی نماز مسجد قرطبہ میں ضرور ادا کرتا ہوں"

"مجھے تو بتایا گیا تھا کہ مسجد میں نماز ادا کرنے کی اجازت نہیں"

"قانونی طور پر شاید نہ ہو مگر مجھے تو پچھلے دس برس سے کسی نے نہیں روکا۔ اور پھر ہسپانوی حکومت بھی تو اِسے مزکیتا کیتھڈرل یعنی مسجد کلیسا کا نام دیتی ہے۔ اگر کلیسا میں عبادت

ہوسکتی ہے تو مسجد میں نماز پڑھنے پر کیسے پابندی عاید کی جاسکتی ہے۔"
"کتنی عجیب بات ہے کہ جس ملک پر عربوں نے پونے آٹھ سو برس حکومت کی آج وہاں۔"
"نہیں...... تم بھولتے ہو مستنصر" حسن نے سنجیدگی سے کہا "تمھیں تو اُن متعصب مُلّاؤں کی طرح بات نہیں کرنی چاہیے جو منبر پر چڑھ کر بڑی رعونت سے اعلان کرتے ہیں کہ ہم نے اتنے سو برس اُندلس پر حکومت کی اور اُندلس ہماری جاگیر تھا...... نہیں ایسا ہرگز نہیں تھا، ہم نے یہاں کبھی بھی حکومت نہیں کی اس لیے کہ ہم تو خود یہاں کے رہنے والے تھے۔ یہ ملک ہمارا تھا۔ بھلا اپنے آپ پر بھی کوئی حکومت کرتا ہے؟ عربوں کی آمد کے ایک سو برس کے اندر اندر باہمی میل جول اور شادیوں کے نتیجے میں پورے ہسپانیہ میں ایک ایسی نسل وجود میں آئی جن کی رگوں میں یورپی، عرب اور افریقی خون دوڑ رہا تھا اور یہ سب کے سب مسلمان تھے ــــ اُندلسی مسلمان ــــ اسی مخلوط نسل نے اُندلس پر حکومت کی۔ ایک دور تو ایسا آیا کہ بیشتر خلیفوں کے بال اور داڑھیاں سنہری رنگ کے تھے اور عرب دکھائی دینے کے شوق میں انھیں خضاب سے سیاہ کرتے تھے۔ خلیفہ الناصر نے ایک مرتبہ جب شجرۂ نسب دیکھ کر اپنے جسم میں آباؤاجداد کے خون کا تناسب جاننا چاہا تو معلوم ہوا کہ اُس کی رگوں میں صرف ایک فیصد عرب خون کی آمیزش ہے اور بقیہ ننانوے فیصد مخلوط ہے۔ چنانچہ جب شمال کے عیسائیوں نے مسلمان اُندلس کا پہلا شہر فتح کیا تو اُن کی اُمیدوں کے برعکس مسلمان اُندلسی عرب یا بربر نژاد نہ تھے بلکہ مسجدوں میں نماز ادا کرنے والوں کی صفوں میں اُنھی جیسے سرخ و سفید سنہری بالوں والے یورپی کھڑے تھے۔"

حسن اگرچہ پیشے کے لحاظ سے وکیل تھا مگر اُندلس کے بارے میں اُس کی تاریخی معلومات حیرت انگیز تھیں اور پھر اُس عہد کا مسلمان معاشرہ آج کے بے جا تعصب سے یکسر عاری تھا۔ حسن کہہ رہا تھا "مسلمان ہسپانیہ مذہبی رواداری اور ترقی پسند ثقافتی قدروں کا ایک ایسا روشن باب تھا جس کے بارے میں ہم لوگ بہت کم جانتے ہیں۔ یہ ایک متعصب اور تنگ نظر عہد نہ تھا بلکہ ایک ایسا روشن خیال اور وسیع النظر معاشرہ تھا، جس میں عورت کو مرد کے برابر حقوق حاصل تھے۔ پردے کا رواج نہ تھا۔ ہزاروں

عورتیں کتابت اور غزل گوئی کے فن سے آشنا تھیں۔ اُندلس کی سب سے بڑی شاعرہ ولیدہ کو ہسپانیہ کی صوفو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ فنِ موسیقی پر عبور رکھنے والے کو ایک عالم گردانا جاتا تھا۔ فلسفے کی ترویج میں مذہب آڑے نہیں آتا تھا کہ ابنِ رُشد کے بقول افلاطون بھی درست کہتا ہے اور قرآن کے الفاظ بھی آخری سچائی ہیں۔ مذہبی رواداری کا عالم یہ تھا کہ یہودی اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ اُندلس کی عظمت کے کئی ستون یہودی عالم اور مفکّر تھے۔

حسن کی بیوی اگرچہ انگریزی زبان سے ناواقف تھی مگر وہ نہایت محویت سے ہماری گفتگو سن رہی تھی۔ نیمتا فرشتہ سو چکا تھا اور دوسرے بچے قالین پر لیٹے اُونگھ رہے تھے۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا "اب مجھے اجازت دیجئے۔"

"اتنی جلدی بھی کیا ہے۔" حسن نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "شام کا کھانا ہمارے ساتھ تناول فرمائیے۔"

"دراصل میں چاہتا ہوں کہ فوراً شہر جا کر مسجد قرطبہ دیکھ لوں۔"

"مسجد تو اس وقت بند ہو چکی ہو گی۔" حسن نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بتایا۔ "نو بج رہے ہیں، کل دیکھ لیجئے گا۔"

"کل شاید نہ آئے۔" مَیں نے ہنس کر کہا۔

"مَیں آپ کی بے قراری سمجھ سکتا ہوں۔" حسن مُسکرا کر بولا۔ "لیکن میرا تجربہ ہے کہ کل ہمیشہ آ جاتی ہے............ اگر آپ یہاں بیٹھے بیٹھے اُکتا گئے ہیں، تو آئیے سومنگ پول کی جانب چلتے ہیں۔ بچّوں کو سُلانے کے بعد زبیدہ کھانا وہیں لے آئے گی۔"

کیمپنگ کے شاہانہ تالاب میں ایک باوقار اور لمبے سیاہ بالوں والی عورت بے حد متانت اور سنجیدگی سے تیر رہی تھی۔ اُس کے بازو اتنی آہستگی سے پانی کو چھُوتے کہ تالاب میں ایک خفیف سی لہر بھی نہ اُبھرتی۔ ذرّہ بھر ارتعاش پیدا نہ ہوتا۔ پھُونس کی جھونپڑی کے باہر ایک عمر رسیدہ خادمہ بازو پر ایک چوغہ لٹکائے اُس کی جانب انتہائی شفقت کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ عورت تالاب سے باہر آ گئی اور اپنے سنہری بدن کو چوغے میں لپیٹ کر تولیے سے بال سُکھاتی دوسری جانب چلی گئی۔ بوڑھی

خادمہ جس کے ہاتھ میں ایک چرمی تھیلا تھا، اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ اُس کی خوفزدہ آنکھیں یوں گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھیں جیسے وہ کسی پُرخطر جنگل میں تنہا ہو اور اس کے قدم اتنی احتیاط سے اُٹھ رہے تھے جیسے گھاس میں سانپ رینگ رہے ہوں۔ میں نے سوالیہ نظروں سے حسن کی جانب دیکھا۔ اُس کے سانولے چہرے پر گہری سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔

قرطبہ - دُور افتادہ اور تنہا!

جن دنوں غرناطہ کی فضا میں موسیقار فالہ کی دلنواز دھنوں سے گونجتی تھیں ایک نوجوان شاعر ان دوستوں کی محفلوں میں اپنی ابتدائی نظمیں سُنایا کرتا تھا۔ فریڈریکا گارسیا لورکا نے ویگا کی مانند ہسپانوی لوک گیتوں کو جدید شعری سانچوں میں انتہائی خوبصورتی سے ڈھالا۔ ۱۹۲۰ء کے پُرآشوب ہسپانیہ میں پر دلنار با کے گیت گانے کے باوجود وہ عوام کے ہر طبقے میں یکساں طور پر مقبول تھا کہ لارکا کے لئے ایک خانہ بدوش۔ ایک خنجر اور ایک گھڑسوار میں بھی اُتنا ہی شعری رومان پنہاں تھا جتنا اُسے گارڈیا سول کی قہرانگیز طاقت میں دکھائی دیتا تھا۔ لورکا کی نظمیں اگرچہ نرم مزاج کی حامل ہیں لیکن یہ جذبات اس کے تن بدن میں سے یُوں چھوٹتے ہیں جیسے اُس کے خانہ بدوش کردار انتونیو کے جسم سے تیز دھار کے پانچ فوارے۔ مصوّر اور موسیقار ہونے کے ناطے سے اس کی شاعری میں شورریست طرز کی بوچھاڑیں ہیں۔ ہمیں اُس کی بیشتر نظموں میں قسمت اور موت کے احساسات اُجاگر نظر آتے ہیں جس کی واضح مثال قرطبہ کی اُداس چاہت میں لکھی گئی نظم ہے۔

قرطبہ
دور افتادہ اور تنہا!
میں ایک کالے خچر پہ سوار ہوں
میرے تھیلے میں چند زیتون ہیں
اور آسمان پر پُورا چاند!

اگرچہ یہ راستے میرے جانے پہچانے ہیں مگر....
میں کبھی بھی قرطبہ نہیں پہنچ پاؤں گا!
میدانوں میں سے، ہواؤں کو چیرتا
کالا خچر۔ سُرخ چاند!
موت مجھ پہ نظریں جمائے دیکھ رہی ہے
قرطبہ کے میناروں سے۔
آہ! یہ طویل راستے۔
آہ! میرا بہادر خچّر
آہ! انجام یہ کہ موت میری منتظر ہو
اس سے پیشتر کہ میں قرطبہ پہنچوں!
قرطبہ
دُور افتادہ اور تنہا!

لورکا کی المناک پیش گوئی پُوری ہوئی۔ وُہ قرطبہ نہ پہنچ سکا۔ موت اُس پر نظریں جمائے دیکھ رہی تھی مگر قرطبہ کے میناروں سے نہیں غرناطہ کے بُرجوں سے، جہاں صرف اڑتیس سال کی عمر میں ہی اسے فاشسٹوں نے ہلاک کر ڈالا۔ سوگواروں نے کہا "لورکا مر گیا۔ غرناطہ اب بغیر دل کے ہے"۔ قرطبہ لورکا کے لئے دُور اُفتادہ اور تنہا ہی رہا مگر میں آج میدانوں میں سے، ہواؤں کو چیرتا قرطبہ پہنچ گیا تھا۔

میں قرطبہ کے مرکزی چوک پلازا دے خوسے اَنتونیو کے دائیں کونے میں ایک بُلند محرابی دروازے آرکو دیل پورتلو کے تلے ایک ایسی بے نام سرحد پہ کھڑا تھا جہاں میرے پیچھے جدید عمارتوں، بھڑکیلے نیون سائنوں اور کشادہ شاہراہوں کا ایک ایسا پُرہجوم شہر آباد تھا جس سے میری شناسائی نہ تھی اور میرے سامنے ایک تنگ پتھریلی گلی ماضی کی عظمتوں میں خوابیدہ ایک ایسے شہر میں اُترتی تھی جو میرے لئے ان دیکھا ہونے کے باوجود جانا پہچانا تھا۔ مجھے وہاں کسی راہبر کی ضرورت نہ تھی۔ میرے اندر کا قدیم انسان میری راہنمائی کے لئے جاگ اُٹھا تھا۔ محراب پر

ایک سفید تختی آویزاں تھی۔ "مزکیتیا۔ اس جانب"۔ میں نے سر جھکا کر پہلا قدم اٹھایا اور ٹائم مشین میں بیٹھے کسی ذی روح کی مانند صدیوں کے فاصلے آنکھ جھپکتے میں طے کر لئے۔ میں ماضی میں تھا۔

لورکا کے دل کا سب سے نازک گوشہ قرطبہ کے لئے ہی مخصوص تھا جسے اُس نے ایک ایسی اُداس اور حسین عورت سے تشبیہہ دی جس کے حُزن کا سبب کوئی نہیں جانتا۔ مجادو نے اسے "خاموش۔ مُوروں کا قرطبہ" کہا۔ میں نے جو قرطبہ دیکھا وُہ خوشبوؤں کا شہر تھا، شوخ رنگوں کی تصویر تھا۔ ایک روشن منظر تھا۔ میں اسے "خوشبو، رنگ اور روشنی کا قرطبہ" کہتا ہوں۔ در و دیوار سے گھُلتی ہوئی نیازبو۔ گلاب اور چنبیلی کی بیلوں میں سے مائل بہ سفر خوشبو، کھڑکیوں میں لگے پُرپیچ آہنی سلاخوں کے آگے رکھے سرخ گملوں میں کھلے جرنیم اور کارنیشن کے بے شمار پھُول۔ دُور سے دیکھیں تو دیواروں کی چندھیا دینے والی سفیدی کے پس منظر پر شوخ رنگوں کے دھبوں کی صُورت نظر آتے ہیں اور روشنی قلعی کئے ہوئے ان تمام مکانوں کی جن پر نظر نہیں ٹھہرتی۔ عربوں کی تعمیر کردہ گلیوں کے ناہموار فرش جن میں پیوستہ گول گول پتھر یُوں قدموں تلے آتے ہیں جیسے آپ کسی سُوکھی ہوئی ندی کی تہہ پر بچھے کنکروں پر چل رہے ہوں۔ زرد دیواروں کی دراڑوں میں سے جھانکتی خودرو گھاس۔ کچے مکانوں کی چھتوں پر پل گئے ننھا پھُول۔ انہی گلیوں میں سینکڑوں پاتیو چھپے ہوئے ہیں۔ پاتیو! مُوروں کے صحنی باغ جنہوں نے اپنے حسین باطن اور سادہ ظاہر کے درمیان جالی دار دروازوں کے آہنی نقاب حائل کر رکھے ہیں۔ گلیوں میں چلتے جائیے اور آپ کے ہر سُو پوشیدہ حسن کی جھلکیاں پاؤں کی زنجیر بنتی چلی جاتی ہیں۔ بلندی سے قدیم قرطبہ ایسے نظر آتا ہے جیسے پہلے ایک وسیع باغ تھا، پھُولوں، بیلوں کے جھُنڈ اور لاتعداد اُبلتے فوارے اور پھر ان کے گرد سفید در و دیوار کچھ یُوں اٹھے کہ اسے سینکڑوں چھوٹے چھوٹے خوش رنگ قطعات میں منتشر کر دیا۔

آج صبح شہر آنے سے پیشتر جب میں نے حسن سے مسجد کا راستہ دریافت کیا تو وُہ اپنے سفید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہنے لگا "تم تو پچھلی شب کہتے تھے کہ اس مسجد کی محرابوں نے تمہیں ایک ڈوری میں باندھ رکھا ہے۔ بس اسی ڈور کے ساتھ ساتھ چلتے جاؤ خود بخود پہنچ جاؤ گے"۔ چنانچہ اب میں سمت کا تعین کئے بغیر ایک ایسی مچھلی کی مانند خاموشی سے تیرتا چلا جا رہا تھا جسے معلوم تھا کہ وُہ جان بُوجھ کر شکار ہو چکی ہے اور شکاری دھیرے دھیرے دُور سے

اُسے کنارے کی جانب کھینچ رہا ہے۔

فصیلِ قرطبہ کے بائیں باغ میں باب المدُور کے سامنے مشہور رُومی ڈرامہ نگار اور فلسفی سینیکا کا سفید مجسمہ ایستادہ تھا۔ قدموں میں ایک وسیع تالاب میں بے شمار سرخ مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ سینیکا جلتے ہوئے روم کا تماشہ دیکھنے والے شہنشاہ نیرو کا اُستاد تھا۔ "آگ سونے کو کُندن بناتی ہے اور بدنصیبی انسان کو" نیرو کے حکم پر خودکشی کرنے سے پیشتر سینیکا کے آخری الفاظ۔ باب المدور میں داخل ہوتے ہی المنظر اور ابنِ رُشد کے پُرانے محلے ہیں جہاں عربوں کے عہد میں یہودی رہائش پذیر تھے۔ صلاح الدین ایّوبی کے ذاتی معالج یہودی ابنِ میمون کا مجسمہ اُس کے گھر کے سامنے نصب ہے۔ یہودی آج بھی اس بات پر کامل یقین رکھتے ہیں کہ لاعلاج مریض اگر قاہرہ میں واقع ابنِ میمون کے عبادت خانے میں ایک شب بسر کرے تو اُسے مکمل شفا ہو جاتی ہے۔ ابنِ میمون کا انتقال قاہرہ میں ہوا جہاں وصیت کے مطابق اس کی لاش کو ہاتھوں پر اُٹھا کر اُس راستے پر لے جایا گیا جہاں سے کبھی حضرت موسیٰ بنو اسرائیل کو لے کر گذرے تھے۔ بقول القفطی ماہرِ طب ابنِ میمون آخری عُمر میں مُسلمان ہو گیا تھا۔ ایونیوالیو سے روس یا ابنِ رشد سٹریٹ اُن دنوں کی یاد دلاتی ہے جب عظیم فلسفی ابنِ رُشد ان گلیوں میں سر جُھکائے قرآن اور ارسطو کے فلسفے میں باہمی ربط کی تلاش میں سوچ بچار کیا کرتا تھا۔ جس نے المنصور کے دربار میں اشبیلیہ پر قرطبہ کی علمی فضیلت کے بارے میں ایک بحث کے دوران ابنِ ظہر سے کہا تھا "مجھے معلوم نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں مگر مجھے یہ ضرور معلوم ہے کہ جب قرطبہ میں کوئی موسیقار مرتا ہے تو اس کے ساز اشبیلیہ بھیجے جاتے ہیں جہاں وہ بک جاتے ہیں، لیکن جب ایک عالم اشبیلیہ میں فوت ہوتا ہے اور حکومت اس کی کتابیں فروخت کرنا چاہتی ہے تو وہ قرطبہ بھیج دی جاتی ہیں"۔ دانتے نے " افلاطون میرا اُستاد ہے اور ابنِ رشد اُس کا بیٹا ." کے الفاظ میں ابنِ رشد کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ اہلِ قرطبہ ابنِ رشد کو مسلمان ہونے کے باوجود آج بھی اپنا عظیم ترین فرزند سمجھتے ہیں۔ اُن کے اس فخر کی علامت سنگِ مرمر کا وہ خوبصورت مجسمہ ہے جو القصر کی دیوار کے سامنے ہیں نصب ہے۔ ابنِ رشد عرب لبادے میں ملبوس، سر پر ایک تہہ دار پگڑی اور پاؤں میں نوک دار جُوتی۔ فلسفے کی تنہائیوں میں کھویا ہوا۔ ایونیوالیوسے

دن کے قریب قرطبہ کا میونسپل ہسپتال ہے اور یہاں ایک مرتبہ پھر آپ کو اس شہر پر عرب تہذیب کے ہمہ گیر اثرات کا ایک اور پہلو علم بدن کے ماہر الفافقی کے مجسمے کی صورت میں ملتا ہے۔ اس مجسمے کو پہلی بار میں نے ایک اندھیری شب میں دیکھا جب قرطبہ کی گلیاں سنسان ہو چکی تھیں اور میں کیمپنگ واپس جا رہا تھا۔ مجھے واہمہ سا ہوا کہ ایک تاریک گلی کے آخر میں کوئی عرب ساکت کھڑا مجھے گھور رہا ہے۔ میں خوفزدہ ہو گیا مگر قریب جانے پر معلوم ہوا کہ ایک سفید مجسمہ ہے۔ دیا سلائی جلا کر کندہ عبارت پڑھی "الفافقی"۔ اُس وقت میں اس ماہر طب کے نام سے ناواقف تھا بہرحال یادداشت کے طور پر اپنی ڈائری میں نوٹ لکھا "آج شب ایک تاریک گلی میں الفافقی نام کے کسی عرب کا مجسمہ دیکھا۔ جانے کون ہے جس پر آج بھی قرطبہ کو ناز ہے۔" عربوں کا سب سے بڑا سرجن الظاہروی بھی قرطبہ میں پیدا ہوا۔ بقول فلپ ہِتّی جدید یورپی سرجری کی بنیاد الظاہروی کی وہ کتاب ہے جو اُس نے علم بدن پر تحریر کی۔ میں نے باب اشبیلیہ کے باہر ایک ندی کے کنارے ابن حزم کا مجسمہ بھی دیکھا جو شہرۂ آفاق شعری مجموعے "طوق الحمامہ" کے علاوہ چار سو کتب کا مصنف تھا۔ ابن حزم مذہبی تقابل کے میدان میں دنیا کا اولین مفکر تھا۔ قرطبہ کی خاک سے جنم لینے والوں اور یہاں کے خاک نشینوں میں سے کس کس کا نام لوں ...... ابن زیدون۔ ابن فارادی۔ ابن داؤد۔ ابن عبدالرابی۔ ابن قفحانی۔ البقری۔ المجریطی۔ ال کرمانی غرضیکہ نابغۂ روزگار شخصیتوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جس کی تفصیل بیان کرنے کے لیے اک عمر درکار ہے۔ عام خیال کے برعکس شہر کے گلی کوچوں میں القصر اور قدیم فصیل کے سائے میں ایستادہ مجسمے ماضی کی عظمتوں کے وہ نشان ہیں جو اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ اہل قرطبہ عرب ماضی کو اپناتے ہیں۔ تسلیم کرتے ہیں۔ اُنہیں اس پر فخر ہے۔

قدیم قرطبہ میں وہ کونسی ایسی کشش تھی جس کا طلسم آج بھی ان گلیوں میں خاموشی سے رواں ہے! فلپ ہِتّی نے اسے بغداد اور قسطنطنیہ کے ہمراہ دنیا کے تین روشن ترین شہروں میں شمار کیا۔ دس لاکھ سے زائد آبادی کے اس شہر میں ایک لاکھ تیرہ ہزار مکان، ۱۰ حویلیاں تین سو عالی شان حمام اور ستر سرکاری لائبریریاں تھیں جہاں تین ہزار خوانین قلمی نسخوں کی

کتابت پر مامور تھیں۔ میل ہا میل تک پختہ سڑکوں کا ایک سلسلہ تھا اور ہر مکان کے دروازے پر ایک لالٹین نصب تھی جب کہ اس عہد کے سات سو برس بعد تک بھی لنڈن کے گلی کوچوں کو ایک بھی روشنی میسّر نہ تھی اور پیرس میں بارش کے بعد جو کوئی بھی گھر سے باہر قدم رکھتا گھٹنوں تک کیچڑ میں دھنس جاتا۔ شدید گرمی میں تمام شاہراہوں پر سائبان تان دیئے جاتے چنانچہ جو مسافر باب المدرر سے شہر میں داخل ہوتا وہ وادی الکبیر کے پل تک ان کی چھاؤں میں سفر کرتا۔ اس روائت کی پیروی محدود پیمانے پر اب بھی جاری ہے۔ میں باب المدرر میں سے آنے والی سڑک کوندے گوندے مار کے ایک قہوہ خانے میں دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا کہ کارپوریشن کے عملے نے لمبے بانسوں کی مدد سے پوری شاہراہ پر سائبان کھول دیئے اور کوندے گوندے مار قدیم زمانوں کی طرح سورج کی تپش سے محفوظ ایک سایہ دار راہگذر بن گئی۔ اندلس اور بقیہ یورپ کے درمیان تہذیب و تمدن کی اتنی وسیع خلیج حائل تھی کہ ترلیدو کے منصف سعید کو یورپی باشندوں کے بارے میں کہنا پڑا" ان کی آب و ہوا سرد اور فضا ابر آلود ہے چنانچہ سورج کی کرنیں اُن کے دماغ تک نہیں پہنچ پاتیں۔ اِس لئے اُن کے مزاج سرد ہیں اور ان کے مزاج میں بھکڑپن ہے۔ ان کے سفید جسم پھولے ہوئے ہیں اور بال بے تحاشا بڑھے ہوئے ہیں۔ وہ حاضر جوابی سے ناواقف ہیں اور ان کی عقل میں کچھ بھی نہیں آتا جب کہ حماقت اور بدتمیزی ان میں عام ہیں" احساس برتری کا یہ جذبہ شاید اتنا بے جا بھی نہ تھا کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جن دنوں آکسفورڈ کے معلّم غسل کو ایک عظیم گناہ قرار دیتے تھے قرطبہ کے سائنسدان اور فلسفی شاندار حماموں میں بیٹھے علمی بحثوں میں محو تھے۔ ڈوزی کہتا ہے کہ اُس عہد میں اندلس کا ہر فرد تعلیم یافتہ تھا جبکہ یورپ میں پادری بھی کورے ان پڑھ تھے۔ ہمسایہ عیسائی حکمرانوں کو اگر تعمیر، لباس تراشی اور طِب کے میدان میں کسی ماہر کی ضرورت پیش آتی تو وہ قرطبہ کی جانب رجوع کرتے۔ اِدھر اگر مسجد قرطبہ کی بین الاقوامی درسگاہ میں ایک پوپ زیر تعلیم تھا تو اُدھر پیرس کی ساربون یونیورسٹی ایک ایسی عمارت میں واقع تھی جس کی بالائی منزل پر تو درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہتا اور زیریں حصے میں رنڈیاں پیشہ کرتیں۔ قرطبہ میں چمڑے، کاغذ اور کپڑے کی صنعتیں بھی مورش دستکاروں نے قائم کیں۔ آج بھی دیوارِ مسجد کے مقابل بازار میں چمڑے کی ایسی مصنوعات فروخت ہوتی

ہیں جن پر کندہ نقش و نگار اور زینہ ان حاسِس مُورش ہیں۔ زیر زمین نالیوں کے نظام کے علاوہ قرطبہ یورپ کا پہلا شہر تھا جہاں سرکاری طور پر ہر گھر میں آب رسانی کا انتظام تھا۔ ایک قرطبن نے مجھے بتایا کہ اس کے پائیو کے فوارے میں اُبلتا پانی اب تک اُسی نالیے کے پائپ ہیں سے گذر کر آتا ہے جو صدیوں پیشتر مُورش کارگیروں نے زیر زمین بچھایا تھا۔ قرطبہ کا زریں مُورش عہد پانچ سو برس پر محیط ہے اور اس کے خاتمے پر جیمز مشنر کے بقول عیسائیوں نے آخری جنگ تو جیت لی مگر شاعری، فلسفے، طرزِ تعمیر اور زراعت کی جنگ ہار گئے۔

آج کا قرطبہ خاموش اور اُداس تو ہے مگر میں اُن سیاحوں سے اتفاق نہیں کرتا جو اسے ایک پُرانی تہذیب کا مُردہ کھنڈر کہتے ہیں۔ ایسے سیاح تاریخ کے صفحوں میں گم قرطبہ آتے ہیں۔ وہ ایک زندہ شہر اور اس کے زندہ دل لوگوں کے درمیان ماضی کے کمرے میں بند چلتے ہیں اور دبیز کتابوں کی اوٹ میں یہاں سے چلے جاتے ہیں۔ قرطبہ کے اکثر مکانوں کی کھڑکیاں منقش آہنی جالیوں سے مزین ہیں جن میں آراستہ نیلے گملوں میں سے خوش رنگ پھول باہر جھانکتے ہیں۔ یہ خوش رنگ پھول شاندار ماضی ہیں جنہیں دیدۂ بینا وقت کی اُس دیوار کے پار دیکھ لیتی ہے جو پُر پیچ جالیوں کی صورت میں درمیان میں حائل ہے۔ سو ہم پچھلے زمانوں میں بھی جیتے ہیں حال کے رنگوں۔ روشنیوں اور خوشبوؤں میں سانس لیتے ہوئے بجائے اس کے کہ ہم ہمہ وقت ایک ایسی عینک لگا کر اشیا کا مشاہدہ کرتے رہیں جس کے شیشوں پر تاریخ کی روشنائی مل دی گئی ہو۔ یورپ میں کونسا ایسا حُسن پرست شہر ہے جہاں موسم بہار میں "فی استادسے پاتیو کردویس" ایسا میلہ منعقد ہوتا ہے۔ چار دیواریوں میں گھرے مختصر باغوں یا پاتیو کو سجانے کا سالانہ جشن۔ رات کے پچھلے پہر اس کی گلیوں میں کانتے ہوندو کی قدیم عرب موسیقی گونجتی ہے۔ صحرانشینوں کے تعمیر کردہ خوش وضع فوآرے اب بھی چوکوں اور پاتیوز میں رواں ہیں۔ چشمِ غزال اگرچہ کم کم ہے مگر دلنشینی بدستور قائم ہے۔ بازار خوسے انتونیو کے گھڑیال کی موسیقیت سے لبریز آواز جب نصف شب شہر کے بام و در پہ گونجتی ہے تو بدن میں ایک خوشگوار سنسنی پھیلنے لگتی ہے۔ کیا یہ ایک مُردہ شہر کی نشانیاں ہیں؟

"ذرکو" کے عرب محلے میں سے گذرتے ہوئے مجھے ایک منقش پھاٹک نظر آیا جس کے پُرپیچ نقاب کے پیچھے شاید قرطبہ کا حسین ترین پاتیو چھپا ہوا تھا۔ میں تصویر بنانے کے لئے

اس آہنی چلمن کے سوراخوں میں سے تاک جھانک کر رہا تھا کہ ایک مُعمر خاتون نے پچھلے سے پھاٹک کھول دیا۔

"یوں چوروں کی طرح کیوں جھانک رہے ہو۔ اندر آکر دیکھ لو۔"

چنانچہ اندر جاکر دیکھا۔ پائیں کی چار دیواری مارشل نیل قسم کے گلاب اور عشق پیچاں کی تہ دار بیلوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ ان میں کہیں کہیں مُسلم نیلے رنگ کے گملے بے ترتیبی سے ٹنگے ہوئے تھے۔ ان گملوں میں پھولدار پودے اور جنگلی گھاس کی مختلف اقسام اُگی ہوئی تھیں۔ صحن گول سنگریزوں سے ترتیب دیا ہوا تھا۔ بیچ میں ایک ٹھگنا سا کائی آلود فوارہ تھا جس کا پانی پیالے کے کناروں سے بہ کر سنگریزوں پر پھیل رہا تھا۔ خوشگوار ٹھنڈک اور سکون کی ایک ایسی نشاۃ ایک مرتبہ لاہور کی تپتی دوپہر میں میں نے مبارک حویلی موچی دروازے کے اندر ایک کچی کوٹھڑی میں لیٹے ہوئے محسوس کی تھی۔ پائیں کے عقب میں گملوں کے درمیان گچ کی بنی ہوئی تین مُورش طرز کی انتہائی خوبصورت محرابیں کھڑی تھیں جو خطِ کوفی میں لکھے گئے کلمہ شریف سے مزین تھیں۔ قدامت کے باوجود یُوں لگتا تھا جیسے ابھی پچھلے ہفتے ہی انہیں تعمیر کیا گیا ہو۔ عرب صناعی کے دیدہ زیب شاہکار۔ ایک کونے میں سُرخ ٹائلوں سے ڈھکا ہوا ایک قدیم کنواں تھا۔ قریب میں پُرانی وضع کی دو صراحیاں اور مٹکے دھرے تھے۔ دیواروں کو گملوں کے علاوہ پیتل کے چمکتے ظروف سے بھی سجایا گیا تھا۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ آخر اتنی بلندی پر ٹنگے گملوں کی آبیاری کیونکر کی جاتی ہے۔ میں نے بوڑھی مالکن سے دریافت کیا تو وہ سفید بالوں کا جُوڑا درست کرتی ہوئی بولی "بہت آسان ہے" اور کونے میں رکھا ایک طویل بانس اٹھا لائی جس کے سرے پر ایک ٹین کا ڈبہ ترچھے رُخ بندھا تھا۔ اُس نے یہ خود ساختہ آبی پیمانہ کنوئیں کی تہ میں اُتارا اور بھر پینگیں لوٹنے کے انداز میں اسے سیدھا کھڑا کر کے ایک گملے پر جھکا دیا۔ لبالب گملے میں اُگی گھاس سیراب ہو چکی تھی تھوڑی دیر بعد گملے کے نچلے سوراخ میں سے پانی ٹپکنے لگا۔ میں نے اس مظاہرے کا شکریہ ادا کیا اور پائیں کی تعریف کرنے کے بعد باہر جانے کو تھا کہ اس نے میرا بازو تھام کر پُوچھا۔

"میری مُورش محرابیں نہیں دیکھیں۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی بنوائی ہیں۔"

"پچھلے ہفتے؟" میں نے اچنبھے سے پوچھا۔

"ہاں! ٹورسٹ پسند کرتے ہیں جب پاٹیو میں محراب نہ ہو اُسے دیکھنے نہیں جاتے۔"

قرطبہ کی گلیوں میں دن کے وقت سیّاحوں کے علاوہ صرف چھوٹے بچّے ملتے ہیں۔ مرد عموماً کام پر چلے جاتے ہیں۔ عورتیں اگر جوان ہوں تو گھر کے کام کاج میں مصروف ہو جاتی ہیں اور اگر اُدھیڑ عمر ہوں تو انہیں دروازوں کے باہر سیّاحوں کو اپنا پاٹیو دکھانے کے لئے بٹھا دیا جاتا ہے۔ اگر ایک سیّاح بھی ان کے پاٹیو کی دل کھول کر تعریف کر دے تو انہیں سارے دن کی بیٹھک کا صلہ مل جاتا ہے۔ رات کو دادی اماں پورے خاندان کے سامنے رپورٹ دیتی ہیں اور بڑے فخر سے اعلان کرتی ہیں کہ آج ہمارے پاٹیو کو اتنے درجن سیّاحوں نے دیکھا۔ "ذوکو" کے محلے میں چند ایسے مکان بھی ہیں جو عربوں کے زمانے میں مسلمان امرا کی حویلیاں تھے۔ تاریخ میں ان کے بڑے عجیب و غریب نام درج ہیں۔ "پھولوں والی"۔ "پیار کی شدت"۔ "خوشبوں کا گھر" وغیرہ۔ میں یونہی پاٹیوز میں جھانکتا، تنگ گلیوں میں آفتاب کی تمازت سے بچنے کی خاطر دیواروں کے سائے میں چلتا پلازا دے پورٹز تک پہنچ گیا۔ میں نے کھلے آسمان پر نگاہ ڈالی۔ نیلا سٹ سپاٹ اور بیکراں تھی۔ اس کی وسعتوں میں مجھے کہیں بھی مسجد قرطبہ کا مینار بلند ہوتا نظر نہ آیا۔ چوک کے درمیان میں ایک پرانی طرز کے فوارے کے پیالے میں چند قرطبی بچے نیکریں پہنے نہانے میں مصروف تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ان میں سے ایک چھلانگ لگا کر نیچے اترا اور فٹ پاتھ پر پڑا پلاسٹک کا لفافہ اُٹھا کر میرے پاس آ گیا۔

"ایس اسنڈ مورو؟"

"سی"۔ میں نے خوش دلی سے جواب دیا۔ شاید مُوروں کی بات ہوئی تھی۔

"پوسٹ کارڈ۔ مزکیتا!" اُس نے لفافے میں سے مسجد کا ایک تصویری پوسٹ کارڈ نکال کر آگے کر دیا" فائو پسیتہ۔"

میں نے پانچ پسیتے کا سکہ اُس کی گیلی ہتھیلی پر رکھ کر کارڈ لے لیا اور وہ پھر فوارے کے پیالے میں گھس کر نہانے میں مشغول ہو گیا۔

ہجومِ تخیل

کالے کومیداس کے پہلو میں سے ایک تنگ گلی نکلتی ہے، کالے لاس فلارس یعنی پھولوں کی گلی۔ بالکل اسم بامسمیٰ۔ سجاوٹ میں اتنی نفاست کہ گمان ہوتا ہے کہ کسی جاپانی گیشا گرل نے پھولوں اور شاخوں کو ترتیب دیا ہے۔

لاس فلورس کے پھولوں میں مجھے مسجد قرطبہ کے زرد مینار کی پہلی جھلک دکھائی دی۔ ایک چوکور حجم قرطبہ کے نیلے آسمان کی وسعتوں کو چھو رہا تھا۔ مینار کی چوٹی پر تین بڑے گھڑیال یوں لٹکے ہوئے تھے جیسے کسی نے تین سیاہ کنول الٹا کر رکھ دیئے ہوں۔ مجھے تو چوٹی کے اوپر سرپرست قرطبہ کے حفاظتی سینٹ رافیل کا مجسمہ ہاتھ پھیلائے شہر کی عمارتوں پر سایہ فگن دکھائی دیا۔ میں اقبال کی چشم بینا کہاں سے لاتا جسے یہ مینارِ بلند جلوہ گہِ جبریل نظر آیا۔ میں نے کچی اینٹوں کی ایک محراب میں پیوست بند پھاٹک کا زنگ آلود کنڈا سرکایا اور میں مسجد قرطبہ کے مینار کے قدموں میں کھڑا تھا۔

ہشام کے تعمیر کردہ اس شامی طرز کے چوکور مینار کے پہلو میں سے نکلتی ہوئی ایک فصیل نما زرد دیوار نے جامع قرطبہ کے صحن اور ڈھکے ہوئے حصے کو اپنے شکستہ بازوؤں میں سمیٹا ہوا تھا۔

بابِ توبہ کھلا تھا۔ بابِ توبہ مینار کے نیچے صحنِ مسجد میں داخل ہونے کا واحد راستہ ہے۔ آہنی کواڑوں پر پیوستہ سینکڑوں چھوٹی چھوٹی پتریاں خطِ کوفی میں کندہ کلمہ شریف کا ورد کرتی تھیں۔ مسجد کی تعمیر کے اولین سالوں میں یہ بلند محراب نما پھاٹک پورا کا پورا سونے کے کام سے مزین تھا۔ قرطبہ کی دھوپ میں بابِ توبہ کی سنہری چمک "ذوکوہ" کی نیم تاریک گلیوں کو بھی روشن کر دیتی۔ مسلمانوں کے اخراج کے بعد اس صدر دروازے کو بھی بقیہ عمارت کی طرح حضرت مریم اور عیسیٰ کی شبیہوں سے بپتسمہ دے دیا گیا۔ میں زرد مینار کے قدموں میں بابِ توبہ کے سامنے دیر تک

کھڑا رہا۔ یکدم اندر جانے کو جی نہ چاہتا تھا مگر پھر صحن میں دکھائی دینے والے نارنگی اور کھجور کے درخت ہوا سے یُوں حرکت میں آئے جیسے مجھے اپنی جانب بلاتے ہوں۔ شکاری نے بھی ڈور اس شدّت سے کھینچی کہ قدم خود بخود اٹھنے لگے اور میں مسجد قرطبہ کے صحن نارنجستان میں داخل ہو گیا۔ قرطبی شاعر رکارڈو نے اسے "چمکتی دھوپ اور سایوں کا صحن" کہا ہے۔ سپید نارنگی کے درختوں میں سے بلند ہوکر ان آدھ کھجور کے چیرواں پتے مینار کی دوسری منزل تک پہنچ رہے تھے اور ان کے سائے ہوا کے چلنے سے ایک توازن کے ساتھ پھیلنے اور پھر سمٹتے چلے جاتے۔ گزشتہ حسن کی متحرک پرچھائیوں کی طرح۔ بائیں جانب زیتون کے ایک صدیوں پرانے درخت کے سائے میں وضو کا تالاب تھا جس کے چاروں کونوں میں ایستادہ فواروں کا پانی ایک ابدی تسلسل کے ساتھ حوض میں گر رہا تھا۔ حاکم کا تعمیر کردہ یہ تالاب زیتون کی قربت کی مناسبت سے "زیتون کا فوارہ" کہلاتا ہے۔ حاکم کے عہد سے پیشتر پانی سے بھرے ہوئے مشکیزے خچروں پر لاد کر صحن میں لائے جاتے اور یُوں روزانہ تالاب کو بھرا جاتا۔ حاکم نے سرا موریناکی بلندیوں پر نئے حوض تعمیر کروائے اور پھر تانبے کے نلوں کے ذریعے ان کا پانی مسجد کے تالابوں تک پہنچا کر مسلسل آب رسانی کا انتظام کیا۔ "زیتون کے فوارے" میں اب تک حاکم کے بچھائے ہوئے نلوں کے ذریعے ہی پانی آتا ہے۔ نارنگیوں کے پتوں سے مہکتے اسی صحن میں بیٹھ کر المنصور نے اندلس کی وزارت عظمیٰ کا خواب دیکھا اور پھر اس مسجد کی بیرونی دیواریں شاہد ہیں کہ المنصور سینٹ جیمز کا ناقابل تسخیر اور مغرور شہر سانتی ایگو فتح کر کے لوٹ رہا ہے اور اس کی فوج کے آگے آگے ہزاروں شاہی قیدی سانتی ایگو کے کلیسائے اعظم کا وزنی گھڑیال اور صدر دروازہ کندھوں پر اٹھائے چلے آ رہے ہیں۔ گھڑیال اور آہنی دروازے کو پگھلا کر مسجد کے لئے دو سو آتشی فانوس ڈھالے گئے۔

میرے عقب میں باب توبہ تھا۔ دائیں اور بائیں نارنگیوں کے درختوں کی قطاریں اُن طویل برآمدوں تک پہنچتی تھیں جو دیوار کے ساتھ ساتھ چلے آتے ہیں۔ کلیسا میں صبح کی عبادت کو آنے والے انہی برآمدوں میں کھلتے ہوئے دو دروازوں میں سے صحن کے اندر داخل ہوتے ہیں اور میرے سامنے بظاہر یہ طاف سے بند ایک غیر مؤثر مستطیل عمارت کھڑی تھی جس کی سُرخ

ٹائلوں کی چھت میں سے جا بجا نکونے آتش دان نما بُرج اُٹھے ہوئے تھے۔ طرزِ تعمیر سے مسجد کی بجائے کسی قدیم حویلی کا گمان ہوتا تھا۔ سامنے کی پوری دیوار میں محراب نما دروازوں کی ایک قطار تھی جو کسی زمانے میں صحن پر کھلتے تھے۔ مگر پھر ایسے عبادت گذار آئے جن کے لئے معبد میں روشنی کا تصور نا قابلِ برداشت تھا۔ مسجد نے کلیسا کا رُوپ دھارا تو ایک کے سوا تمام کے تمام محرابی دروازے بھوری اینٹوں سے چُن دیئے گئے۔ اینٹوں سے پُر یہ محرابی دروازے اُس اندھے کی طرح بے بس اور لاچار کھڑے ہیں جو صدیوں روشنی سے آشنا ہونے کے بعد اپنے آگے تاریکیوں کی ایک دیوار کھڑی دیکھ کر ٹھٹک کر رہ جاتا ہے۔ ایک بُلند محرابی دروازہ جسے اینٹوں کی بجائے لکڑی کے تختوں سے بند کیا گیا تھا مسجد میں داخلے کی واحد صُورت نظر آتا تھا۔ محراب کے اُوپر ایک نو تعمیر کردہ چوکھٹے پر مریم کا بُت نصب تھا اور لاطینی زبان میں مذہبی دعائیں درج تھیں۔ بائیں ہاتھ پر دروازے کے پہلو میں نیلی وردی پہنے ایک موٹا ہسپانوی لکڑی کی ایک کیبن کے ساتھ ٹیک لگائے اخبار پڑھ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے انتہائی عجلت میں اخبار سمیٹا اور بغل میں دابی ٹوپی سر پر جما کر جلدی سے کیبن میں گھس گیا۔

"موسیو نورسنا!" اُس نے کیبن کے سوراخ میں سے ہاتھ نکال کر کاؤنٹر بجایا۔

"بیس پسیتے"۔

مسجد میں داخلے کا پروانہ یا لاشش ڈی وزتا سبز رنگ کا تھا اور اس پر "کلیسائے قرطبہ کی زیارت کے لئے۔ بیس پسیتے۔ نمبر ۰۰۵۸۹۹" کے الفاظ درج تھے۔ بیس پسیتے صندوقچی میں گرا کر مسجد کا موٹا محافظ پھر کیبن سے باہر نکل آیا اور بڑے اہتمام سے چلتا ہوا دروازے میں جُڑے تختوں کے قریب جا کھڑا ہوا۔

"موسیو نورسنا!" اُس نے انگلی میں خم دے کر مجھے اپنی جانب آنے کا اشارہ کیا۔ میرے قریب پہنچنے پر اس نے اپنے ہی جاری کئے ہوئے ٹکٹ کو نہایت غور سے جانچا اور پھر ایک کونہ علیحدہ کر کے مجھے واپس کر دیا۔

"صبح بخیر! آپ آج صبح کلیسا کی زیارت کے لئے آنے والے پہلے سیاح ہیں"۔ اُس نے

ٹوپی اُتار کر بغل میں داب لی اور مُسکرا کر کہا۔
"صبح بخیر" میں نے ٹکٹ کا بقیہ حصہ نہائت احترام کے ساتھ اپنی جیب میں محفوظ کرتے ہوئے جواب دیا "میں آج صبح مسجد۔ ۔ ۔ کی زیارت کے لئے آنے والا پہلا سیاح ہوں"۔
محافظ کے چہرے سے مُسکراہٹ فوری طور پر غائب ہو گئی۔ اس نے مزید گفتگو کی بجائے اپنی ٹوپی پھر سر پر جما کر اُسے غصّے سے تھپکا اور لکڑی کی دیوار میں نصب ایک چھوٹے سے پھاٹک کی چٹخنی کھول کر مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے جونہی تاریکی کے اس مستطیل ٹکڑے کے اندر قدم رکھا میرے پیچھے پھاٹک بند ہو گیا۔ کھٹاک! کھٹاک! چٹخنی چڑھانے کی آواز وسیع خلاؤں میں گُونج گئی۔ باہر کی دنیا سے میرا رابطہ کٹ چکا تھا۔
میں خنک اندھیروں کی بے کراں خلاؤں میں تنہا کھڑا تھا۔ میں تنہا اور دُور افتادہ مگر کھچاؤ سے آزاد اور پُر سکون۔ پھر گُھپ اندھیرا تاریکی میں بدلنے لگا۔ میرے گرد آپس میں گڈمڈ ہوتی ہوئی نامعلوم شبیہیں تھیں۔ بے جہت ہیولے حرکت میں تھے۔ تاریکی سے نیم تاریکی تک کے سفر میں مدتیں بیت گئیں۔ خلاؤں میں اب غیر واضح نقوش بکھرنے لگے۔ پھر بکھرتے ہوئے نقوش یکجا ہو کر ساکت ہو گئے۔ ایک سنسان اور گھنا جنگل۔ میں آنکھیں جھپکے بغیر اپنے دونوں ہاتھ فقیروں کی طرح سامنے پھیلائے آگے بڑھا۔ سہارے کی متلاشی اُنگلیاں کسی سرد مرمریں شے سے چھُو گئیں۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اسے ٹٹولا۔ شفاف سطح پر انگلیاں پھسلیں اور پھر چند اُبھرے ہوئے الفاظ پر اٹک گئیں۔ میں نے اُبھری ہوئی عبارت پر آہستہ آہستہ اپنے پپوٹے دبائے آنکھوں سے محروم ایک شخص کی طرح جو خط بریل کو اپنی اُنگلیوں کے لمس سے پڑھنے کی پہلی کوشش میں مصروف ہو۔ پپوٹوں کی ٹٹولتی آنکھوں نے خبر کی۔ پہلے "لا" ہے۔ اس کے بعد "الہ" آتا ہے۔ اور۔ ۔ ۔ اور پھر تن بار سے گننے کے بعد میرے کانوں میں اُترنے والی پہلی آواز گونجی۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ اندھیرے چھٹنے لگے۔ میرے گرد کا خلا بنفشی۔ ارغوانی سنگِ مرمر کے نازک ستونوں کے ایک جنگل میں بدلنے لگا۔ شام کے صحراؤں میں اک ہجوم نخیل۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سبز نیم تاریکی میں ہزاروں بنفشی۔ ارغوانی۔ سیاہ اور زرد کنول ایک غیر فانی شب کے خنک سکوت میں مرجھا رہے ہوں۔ ماند پڑتے جا رہے ہوں مگر ان کا رنگ پھیکا پڑنے کی

بجائے مزید شرخ ہو رہا ہے۔ کنول کے اس کملاتے ہوئے جنگل میں حسن بیمار کی سی دلکشی تھی۔ جیسے یہ تپ رہی ہے۔ ایک خاموش اور ٹھنڈی آگ، سنگ مرمر کی آگ میں جل رہی ہے۔ سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ مر چکا ہے، سرد ہو چکا ہے مگر جل رہا ہے۔ اس میں حدت ہے حسنِ رفتہ کی۔ ستونوں کے اوپر کسی گھنے برگد کی طرح سرخ اور سفید دوہری محرابیں نیم دائروں کی صورت میں تاحدِ نظر پھیلتی جا رہی تھیں۔ نولنک نے کہا تھا۔

میں ایک بید کے درخت کی مانند ہوں۔
ہوا تھم جائے تو
میں بھی ساکت کھڑا رہتا ہوں۔
اور اگر ہوا چلے
تو میں حرکت میں آ جاتا ہوں۔

یہ ستون بید کے درختوں کی طرح ہوا کی غیر موجودگی میں پُرسکون اور ساکت کھڑے تھے لیکن یوں لگتا تھا جیسے ہوا کے ہولے سے چلنے سے ہی یہ سیمسن کے معبد کی طرح منہدم ہونے لگیں گے صحراؤں میں بادِ نسیم کے پہلے جھونکے سے ہی ہجومِ نخیل زمیں بوس ہو جائے گا۔

مسجدِ قرطبہ کو اپنی مرمریں ہتھیلیوں سے سہارا دینے والے یہ اجسام خصوصی طور پر اس عمارت کے لئے نہیں تراشے گئے تھے بلکہ مسجد کا نقشہ ان قدیم ستونوں کی ساخت اور بلندی کو مدِ نظر رکھ کر بنایا گیا تھا۔ انہیں تخلیق کرنے والے فنکاروں کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ ان کے تراشیدہ شاہکار صدیوں تک افریقہ کے رُومی معبدوں اور کارتھیج ایسے شہروں کے کھنڈروں میں دفن رہیں گے اور پھر امیر عبدالرحمٰن کے حکم پر انہیں کھود کر قرطبہ لے جایا جائے گا جہاں ان کے کندھوں پر کسی معبد یا قصر شاہی کی بجائے ایک ایسی عمارت کی محرابیں اٹھیں گی جسے دُنیا کی سب سے بڑی مُسقف مسجد ہونے کا امتیاز حاصل ہو گا۔ بادشاہی مسجد لاہور کے ۱۰۰ x ۲۱۵ کے مقابلے میں مسجدِ قرطبہ کا مُسقف رقبہ ۶۲۰ x ۴۴۰ فٹ ہے۔ مسجدِ قرطبہ میں پھیلے کل ستونوں کی تعداد ۱۰۹۳ ہے اور ان میں سے ہر ایک کا رنگ، سنگِ مرمر کی قسم اور نقش و نگار بالکل مختلف ہیں۔ گولائی یکساں ہے۔ بلندی بارہ فٹ رکھی گئی ہے۔ چونکہ ان ستونوں کی اوسط بلندی مسجد کی

مجوزہ چھت کی بلندی سے کہیں کم تھی اس لئے ان پر دوہری محرابیں تعمیر ہوئیں اور اُن پر قوسوں کے گنبذ نما بنا کر چھت تک لے جایا گیا۔ تمام ستونوں کے زیریں حصے واضح طور پر بے حد چمکیلے اور ملائم ہیں۔ گئے زمانے کے لاکھوں عقیدت مندوں کے کندھوں اور ہاتھوں کے پُرتقدس مس کا ثبوت!

میں ایک بھٹکے ہوئے آہو کی طرح حیران کھڑا تھا۔ سوئے حرم تو کیا میں خود حرم میں تھا۔ کس سمت قدم بڑھاؤں تو منزل سامنے آئے گی؟ شاید یہی منزل تھی اسی لئے وہ کنڈی جو میری رُوح میں پھانس کی طرح اٹکی مجھے لاہور سے اس حرمِ پاک تک کھینچ لائی تھی اب دھیرے دھیرے تحلیل ہو رہی تھی۔ یہ میری خوش بختی تھی کہ اس وقت سوائے میرے پوری مسجد میں اور کوئی سیاح موجود نہ تھا۔ کیا میں اس عمارت کو صرف اور صرف ایک سیاح کی نظر سے دیکھ رہا ہوں؟ میں جو کہ ایک گم گشتہ رُوح ہوں جسے علم کی روشنی نے راستہ دکھانے کی بجائے وسوسوں اور شکوک کی بھول بھلیوں میں گم کر دیا ہے۔ اگر مجھے دنیا کے تمام مذاہب میں سچائی کا پرتو نظر آتا ہے تو صرف اس عمارت کی کشش مجھے اتنی دور سے کیوں کھینچ لائی ہے۔ میں سینٹ پیٹرز رُوم یا نوترے ڈیم پیرس کی جانب کیوں نہ چلا گیا؟ میں نے آہستہ آہستہ اُن پتھر کی سلوں پر چلنا شروع کر دیا جن پر صدیوں پہلے خلیفۂ وقت بھی ننگے پاؤں چلتا تھا۔ لیکن میں نے اپنے دبیز بوٹ اس خیال سے نہیں اتارے تھے کہ اگر دوسرے سیاحوں نے دیکھ لیا تو کیا کہیں گے۔ اس روشن دماغ جدید انسان کا دماغ چل گیا ہے۔ ایک پرانی روایت کہ کھنڈر پر ننگے پاؤں چلنے سے اس کے پاؤں نہ چھل جائیں گے؟ زخموں سے خون نہ رسے گا؟

کملائے ہوئے کنول کا یہ گھنا جنگل ہمیشہ سے نیم تاریکی میں نہیں ڈوبا رہا۔ صحن کی جانب اکیس محراب دار دروازے کھلتے تھے۔ یوں جہاں یہ تمام ستون ختم ہوتے وہیں سے ایک ہندسی توازن کے ساتھ کھجور کے درخت شروع ہو جاتے۔ ستونوں کی بجائے سیدھے تنے اور محرابوں کی جگہ کھجور کے لمبے پتے۔ عمارت کا باطن صحن کے ظاہر سے ہم آہنگ ہو جاتا اور مسجد میں بیٹھے عبادت گزاروں، مفکروں اور طالب علموں کی نظریں ستونوں کے جنگل سے پرے کھجور کے درختوں کی قطاروں تک ایک خوش نظم تسلسل میں چلی جاتیں۔ مخالف سمت میں دریا

کی جانب بھی کئی محرابیں کھلتی تھیں - وادی الکبیر کے رواں پانیوں میں متحرک پن چکیاں اور رومی پُل یہاں سے صاف نظر آتے - دائیں جانب القصر کی طرف متعدد دروازے تھے - چند دروازے بائیں جانب سڑک پر بھی کھُلتے تھے - لامحدود ستونوں کی حامل ایک ایسی بصری تصویر جو مینار مسجد، صحن، ستونوں کے جنگل - بازار اور القصر کے علاوہ وادی الکبیر کے پانیوں پر بھی محیط تھی - مسجد کلیسا میں بدلی تو یہ وسعتیں سمٹ گئیں - چاروں جانب کھلے دروازوں اور محرابوں کی آنکھیں اینٹوں سے پُر کر دی گئیں اور ان میں چھوٹے چھوٹے کریہہ المنظر چیپل بنا کر اِن کے اندر صلیبیں اور پیروں فقیروں کے مجسمے رکھ دیئے گئے - دن کے وقت تو قرطبہ کے روشن سورج کی کرنیں جن کے آگے دیواریں حائل نہیں مسجد کے گوشے گوشے کو منور کرتیں اور جونہی وادیٔ الکبیر کے پانی شفق سے سرخ ہونے لگتے دوسواتی فانوسوں میں آویزاں دس ہزار سے زائد شمعیں روشن کر دی جاتیں - فرش پر بیش قیمت قالین بچھے تھے اور چھت صحرائے قرطبہ کی منقش لکڑی سے آراستہ تھی - ان دنوں اصل چھت کی نشانیاں کہیں کہیں ملتی ہیں - بقیہ لکڑی ادھیڑ کر سازوں کی ساخت کے لئے استعمال ہوئی - عیسائیوں میں روایت تھی کہ اس دیدہ زیب لکڑی سے بنی ہوئی گٹار میں ہمیشہ ایک حزن آمیز سُریلا پن ہوتا ہے - دوسرے روز جب میں مسجد کے برآمدوں میں گھوم رہا تھا تو چھت کا ایک منقش ٹکڑا فرش پر پڑا ملا - پُشت پر لگے کسی خاص مصالحے کی وجہ سے ابھی تک بالکل درست حالت میں گھُن سے پاک تھا۔

میکسیکو کے گھنے جنگلوں میں پوشیدہ کسی انکا اہرام کے کھنڈر کی طرح مسجد کے قلب میں تعمیر کردہ کلیسا جو میرے تخیل میں بُری پنہاں تھا - پہلے پہل مجھے اِس کی موجودگی کا احساس تک نہ ہوا - میرے ساتھ ساتھ چلتے ستون یوں منجمد ہوتے جیسے بنو اسرائیل کو راستہ دینے کے لئے نیل کے پانی سانس روک کر ایک دیوار کی صورت میں ساکت ہو گئے تھے - یہاں ستونوں کے اس دریا کے بیچ موسےٰ کے عصا کی بجائے عیسےٰ کا کلیسا پھینک دیا تھا لیکن سنگ مرمر کے یہ پانی پیچھے ہٹنے کی بجائے کلیسا کے پہلوؤں میں سے بہہ نکلنے کے بعد دوسری جانب پھر رواں دواں تھے - میں بھی اس دیوار سے پہلو بچا کر المنصور کے حصے کی جانب

چلا گیا۔ مسجد کے اندھے دروازوں میں تعمیر کردہ ایک چیپل کی سلاخوں کو تھامے ایک پادری نے اس ویران حصے میں میرے قدموں کی آواز سُن کر سر اٹھایا اور پھر سینے پر صلیب کا نشان کھینچ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"کلیسا میں صبح کی سروس تو تمام ہو چکی میرے بیٹے۔ تم دیر سے پہنچے ہو۔" اس نے انگلی کے اشارے سے ایک صلیب مجھ پر بھی لاد دی۔

"مقدس باپ! میں تو سیاح ہوں۔ مسجد کی زیارت کے لئے آیا ہوں۔" میں نے صلیب کے بوجھ تلے دبتے ہوئے کہا۔

"پھر تم بہت پہلے آ گئے ہو۔ ہم اس مسجد کی ... اس کلیسا کی برقی روشنیاں تب تک نہیں جلاتے جب تک سیاحوں کی ایک معقول تعداد اندر نہ آ جائے۔" اُس نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور پھر گلے میں لٹکی وزنی صلیب کو مٹھی میں بھینچ کر آہستہ سے بولا "تم مؤرخ ہو؟"

وارث شاہ نے سرگوشی کی "اساں ذات صفات تے حبس کیا؟" ادھر لِن یُو تانگ بھی مجھے مؤرخ بنانے کی کوشش میں مصروف تھا "سیاحت کا حقیقی مقصد اپنی ذات، پیشے، وطن اور مذہب کو فراموش کر کے ایک عام انسان بن جانا ہے۔" میں وارث اور یُو تانگ کا کہنا ماننے ہی والا تھا کہ شاہ حسین فقیر نمانے نے فریاد کی "رانجھن سانوں کُنڈیاں پائیاں دل وچ لگیاں رہ مچھی وانگوں ہیں پئی تڑفاں تا در دے ہتھ ڈور ہے" اور میں نے اقرار کر لیا۔

"ہاں میں مؤرخ ہوں۔"

"افریقہ سے آئے ہو؟" اُس نے صلیب کو مٹھی سے آزاد کر کے ہاتھ چغے کی جیبوں میں رکھ دیئے۔

"پاکستان..."

"ہوں! مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہاں بھی مؤرخ ہوتے ہیں..." اُس نے سر ہلا کر مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ "آؤ میں تمہیں اس عمارت کا خوبصورت ترین حصہ دکھاؤں۔"

میں ایک فرمانبردار طالب علم کی طرح سر جھکائے اس کے پیچھے ہو لیا اور ہم دونوں ستونوں کے بیچوں بیچ چلتے ہوئے مسجد کے ایک ایسے حصے میں آ گئے جس کی چھت لکڑی کی بجائے

سفید پلستر کے شہتیروں سے بنی ہوئی تھی۔ ستونوں سے اوپر گُتھی ہوئی محرابوں کا ایک سلسلہ تھا جن پر دیدہ زیب پھول بوٹے نقش تھے۔ ستونوں کے درمیان میں سے نیم تاریکی کے باوجود الحکم کی تعمیر کردہ محراب چمکتے پارے کی طرح یوں روشن نظر آرہی تھی جیسے پوری عمارت کی ناکافی روشنی کھینچ کر اس میں جذب ہو رہی ہو۔ اگر مجھے دنیا کی خوبصورت ترین مسجدوں کے درمیان مجموعی طور پر موازنہ کرنا پڑے تو شاید مجھے مسجد قرطبہ کو سلطان احمد استنبول مسجد جامع ہرات اور مسجد گوہر شاد مشہد کے مقابلے میں ترجیح دینے پر قدرے تامل ہو مگر مسجد قرطبہ کی محراب الحکم میرے نزدیک دنیا کی تمام عمارتوں کے کسی بھی انفرادی حصے پر صناعی اور خوبصورتی کے لحاظ سے حاوی ہے۔ سفید سنگ مرمر کے مستطیل منقش مُصلّے صورت فرش بچھے ہوئے تھے۔ میرے راہبر پادری نے مُصلّے کے قریب رکھی ایک ادھ جلی موم بتی اٹھا کر روشن کی اور محراب کے اندر داخل ہو کر اسے بلند کر دیا۔ آیات قرآنی اور خوشنما نقش و نگار جو اس سے پیشتر ایک ٹھوس اور جامد صورت میں دکھائی دے رہے تھے لاکھوں چھوٹے چھوٹے چمکتے دمکتے مختلف رنگوں کے پتھروں میں منتشر ہونے لگے۔ خطاطی میں تحریر آیات قرآنی کا ایک ایک نقطہ وال کے دانے جتنے سینکڑوں چھوٹے چھوٹے پتھروں کے جوڑنے سے ظاہر ہوا تھا۔ پُرپیچ پھول اور مرصع حاشیے بھی انہی رنگا رنگ ٹکڑیوں کے باہم ربط سے وجود میں آئے تھے۔ موم بتی کی جھلملاتی روشنی میں ان کا سنہرا رنگ سینکڑوں برس گذرنے کے باوجود آنکھوں کو خیرہ کئے دیتا تھا۔ چھت سے وہ خالی رسّی لٹک رہی تھی جس کے سرے پر مسجد کا سب سے بڑا فانوس بندھا ہوتا تھا۔ یہیں پر ماہ رمضان کے شروع میں وہ بھاری بھرکم موم بتی روشن کی جاتی جس کا حجم اتنا نپا تلا ہوا کرتا تھا کہ عین آخری روزے کے افطار کے وقت خود بخود بجھ جاتی تھی۔

پادری نے موم بتی کو ایک دائرے کی صورت میں حرکت دی۔ محراب میں سے شرارے پھوٹ پھوٹ کر بکھرتے اور پھر اسی لمحہ سمٹ کر خطاطی اور نقش و نگار میں جذب ہونے لگتے "پچی کاری کا یہ کام اس لحاظ سے دنیا بھر میں منفرد ہے کہ اس سے زیادہ چھوٹے پتھر کسی عمارت کی تزئین کے لئے استعمال نہیں ہوئے۔"

"کیا یہ مؤرّرں کے کمالِ فن کا معجزہ نہیں کہ بارہ سو برس پیشتر تعمیر کردہ اِس محراب میں ابھی تک پچی کاری کا ایک ٹکڑا بھی نہیں اکھڑا . . . ."

"اکھڑتے رہتے ہیں . . . ." اُس نے موم بتی بُجھا کر فرش پر رکھ دی "لیکن ہمارے آثار کے ماہر انہیں دوبارہ اُسی ترتیب سے جوڑ دیتے ہیں۔ یُوں بھی پچی کاری کا یہ شاہکار دُ کاریگروں کے کمالِ فن کا معجزہ ہے۔ شاہِ قسطنطنیہ نے خصوصی طور پر اس محراب ارائش کے لئے پینتیس ٹن وزنی موزیک پتھر کے ٹکڑے الحاکم کو بطورِ تحفہ روانہ کئے تھے۔ ذ کے ہمراہ ایسے کاریگر بھی آئے جو پچی کاری کی بازنطینی روائت کے ماہر تھے۔ اِسی لیئے ونگاریں واضح طور پر بازنطینی رنگ جھلکتا ہے . . . ."

"آپ درست ہی فرماتے ہوں گے" میں نے خطِ کُوفی کے الفاظ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے متانت پُوچھا "لیکن کیا عیسائی کاریگروں نے یہ آیاتِ قرآنی بھی . . . ."

پادری نے مجھے اپنی بوڑھی آنکھوں سے یُوں گھُورا جیسے کہہ رہا ہو ایک تو میں تمہیں مُفت مسجد کی سیر کروا رہا ہوں اور اُوپر سے جرح کرتے ہو ؟

"اُن دنوں عربی صرف مُسلمانوں کی زبان ہی نہیں تھی" وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دھیمے میں بولا "ہسپانوی عیسائیوں کی بھی مادری زبان تھی . . . . ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ نقش ونگار ازنطینی عیسائیوں نے تخلیق کئے ہوں اور ہمارے قرآن کی عبارت مؤرّوں نے خود لکھی ہو۔ یسے ں مسجد میں جو کچھ بھی تم دیکھ رہے ہو اس کا صرف بیس فیصد حصّہ اصل حالت میں ہے۔ یہ ساری عمارت حکومتِ ہسپانیہ کی عنائت سے قائم ہے ورنہ کبھی کی کھنڈر ہو چکی ہوتی۔ خاص طور پر فرش، چھتیں۔ باہر کے دروازے اور محرابیں ماہرِ تعمیر ولاسکز باسکو نے عمر بھر محنت کر کے ازسرِ نو تعمیر کروائی تھیں"۔

اپنے ناکافی علم کی بنا پر میں نے لاٹ پادری سے بحث میں اُلجھنا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے اُس کی وُہ رٹی رٹائی تقریر سننے لگا جو شاید پچھلے پچاس برسوں سے وُہ مسجد میں ہر آنے والے سیّاح کے سامنے اِس انداز سے کرتا تھا جیسے ابھی ابھی اُس کے ذہن میں یہ تمام حقائق وارد ہو رہے ہوں۔

"عربوں کے زمانے میں مسجد اور شاہی القصر کے درمیان ایک زیرِ زمین گذرگاہ تھی جس کے راستے خلیفۂ وقت یہاں نماز کے لیے آتا تھا۔ اسی محراب کے دائیں ہاتھ کا مُصلّٰی خلیفہ کے لیے مخصوص تھا۔ بائیں جانب وزیرِاعظم بیٹھتا اور ان دونوں کے درمیان امام مسجد کے لیے جگہ ہوتی۔ وہ لوگ علمِ ہندسہ کے ماہر تھے۔ محراب کی چھت میں قوسیں، کماندار ابھرے ہوئے خطوط اور گہرائیاں اِس ہندسی ترتیب سے تعمیر کی گئی تھیں کہ خلیفۂ وقت جب مؤذنوں کے مقدّس دن جمعہ کا خطبہ پڑھتا تو اُس کی آواز اِن قوسوں سے ٹکرا کر گہرائیوں میں اُترتی، دوچند ہو کر کماندار خطوط سے چھوتی اور پھر محراب میں متعدد بار گردش کرنے کے بعد کئی سو گنا بلند ہو کر باہر نکلتی اور پوری عمارت میں پھیل جاتی۔ مسجد میں موجود تیس ہزار سے زائد عبادت گزار چاہے وہ المنصور کے حصے میں ہی کیوں نہ بیٹھے ہوں اس گونجتی ہوئی آواز کو بخوبی سُن لیتے۔۔۔۔ اگر تم پسند کرو تو بے شک محراب کے اندر کھڑے ہو کر مؤذنوں کی طرح اذان دے کر تجربہ کرلو۔۔"

میں یکدم چونک گیا۔

ایک چھ سالہ بچہ ننھے منے ہاتھ سینے پر باندھے مسجد تاجے شاہ کی بچھی ہوئی چٹائی پر کھڑا بہ آوازِ بلند نماز دُہرا رہا ہے۔ زیر زبر کا فرق آیا، زبان اٹکی، جھکنے میں تاخیر ہوئی اور امام مسجد کا لچکیلا بید اُس کی پُشت پر بُری طرح برسنے لگا۔ شدید اذیت اور جلتے ہوئے درد کے باوجود حکم نماز ہے۔ نیت توڑنا کفر ہے۔ وُہ ہچکیاں لیتا ہوا بھرائی ہوئی آواز میں نماز جاری رکھتا ہے لبریز آنکھوں سے ٹپ ٹپ بہتے آنسو سینے پر بندھے ہاتھوں پر متواتر گر رہے ہیں۔ اس متشدد ابتدائی تعلیم نے اُسے ہمیشہ کے لیے مذہب سے خوفزدہ کر دیا۔ ذی شعوری کی عمر کو پہنچ کر بھی کسی مذہبی شخصیت کی موجودگی اُسے دہشت زدہ کرکے پھر سے چھ سالہ بچہ بنا دیتی۔ لاشعوری طور پر جسم کے مسام چٹکنے اور بید کی ضربوں کے تکلیف دہ نشان یکلخت اُبھر آتے۔۔۔۔ اور اب یہ پادری اُسے اُس مُصلّے پر کھڑے ہو کر اذان دینے کے لیے کہہ رہا تھا جہاں یحییٰ بن یحییٰ الحکم کو مواعظہ حسنہ کیا کرتا تھا۔ ابنِ رُشد۔ ابن زیدون۔ ابن حزم۔ ابنِ عمار ایسے کمالِ فن رموزِ عالم پر موشگافیاں کیا کرتے تھے اور اذان تو کیا اُس کی یادداشت عید کی نماز کی دو رکعت پڑھتے وقت بھی ساتھ چھوڑ دیتی تھی۔ اس کا بدن ہمیشہ ایک شوئکتے ہوئے بید کی آمد کا منتظر

تنہا۔ کہیں وُہ امام مسجد میرے پیچھے پیچھے تو نہیں چلا آیا تھا؟ میں نے پہلے اردگرد دیکھ کر
اطمینان کر لیا کہ میں مسجد قرطبہ میں ہی کھڑا ہوں، آج سے چوبیس برس پیشتر مسجد نا جے ثناہ
تو نہیں ہوں اور پھر آہستہ سے جواب دیا "سوری . . . مجھے اذان یاد نہیں۔"
"اور تم مُور ہو . . ." پادری کا پوپلا مُنہ حیرت سے لٹکا اور کسی کھنڈری کے جبڑے کی طرح
کھل گیا۔ میں نے سر جھکا لیا۔ "نو سنئو" اُس نے صلیب کو چوما اور پھر ہونٹوں کے گرد ہتھیلیوں
کا ہالہ بنا کر انتہائی عقیدت سے بلند آواز میں پکارنے لگا . . . آ . . . آ . . . آواز محراب کے
مدر پتھر میں کھدے نیم دائروں سے ٹکرائی . . . قوسوں نے اس آ . . . آ . . . کو دو چند کر کے
نذار خطوط پر پھیلا دیا۔ پادری کا مُنہ پوری طرح کھل گیا . . . وے . . . رے . . . ماریا!
. . . کی پیالہ نما گہرائیوں میں ڈوب کر "آوے ماریا" کے الفاظ نیچے اُترے اور محراب میں سے
کر مسجد کے ایک ہزار نرانوے ستونوں کے گرد منڈلاتے ہوئے پوری عمارت میں گونجنے
. . . . آوے ماریا! آوے ماریا!

جب بنو اُمیہ کا آخری تاجدار مروان مصر کے ایک گاؤں میں تن تنہا مُنہ میں اپنی
ریش دبائے عباسی سپاہیوں کی تلواروں کو اپنے عمر رسیدہ بدن پہ روک رہا تھا تو اُس
بیس سالہ پوتا عبدالرحمٰن دریائے فرات اور کوہ اطلس کے درمیان ایک مفرور ملزم
امد عباسیوں کے سیاہ پرچموں کے سائے اور اُن کے پُرشوق خنجروں سے ہراساں کسی
سی پناہ گاہ کی تلاش میں سرگرداں تھا جہاں وُہ اِس خونی طوفان کے تھم جانے تک روپوش
ہ سکے۔ پانچ سال کی صحرا نوردی کے بعد آبلہ پا عبدالرحمٰن افریقہ پہنچا جہاں اُس کی ماں کے رشتہ دا
بر قبیلے نے اُسے اپنی امان میں لے لیا۔ عبدالرحمٰن کی عقابی نظروں نے دیکھ لیا کہ سمندر پار کا
اُس اُس کے لیے بنو اُمیہ کی کھوئی ہوئی سلطنت کا نعم البدل ثابت ہو سکتا ہے۔ وُہ چند بربر
اتھیوں اور اپنے غلام بدر کے ہمراہ اُندلس کے ساحل پر اُترا اور فرمانروائے اندلس یوسف
ہری کو ایسی شکست فاش دی کہ اِس کے بعد ہسپانیہ کے جس حصے میں بھی نیزے پر بندھا
بدالرحمٰن کا سبز عمامہ پرچم کی صورت میں افق پر اُبھرتا وہاں کے تاجدار قریش کے اس عقاب
جھپٹنے سے پیشتر ہی میدان چھوڑ کر فرار ہو جاتے۔ دراز قد۔ اکہرے بدن کا مالک عبدالرحمٰن

جس کے ماتھے پر ہمیشہ سُرخ بالوں کی دو لٹیں کھیلتی رہتی تھیں پُورے ہسپانیہ کو زیر کر کے فنون لطیفہ کی طرف متوجہ ہوا۔ اُس کی حسین ترین یاد دمشق میں واقع شاہی باغ رصافہ تھا جہاں وُہ بچپن میں اپنے دادا ہشام کے کندھوں پر سوار ہو کر سیر کیا کرتا تھا۔ نئے اموی دارالسلطنت کے مضافات میں اسی نمونے پر رصافۂ قرطبہ کی تعمیر ہوئی۔ یہیں پر عبدالرحمٰن نے اپنے ہاتھوں سے اندلس میں پہلا کھجور کا درخت لگایا۔ اپنے کھوئے ہوئے دمشق کی علامت اس صحرائی درخت کو دیکھ کر اُس نے وطن سے دُوری کی کسک کو جن اشعار میں ڈھالا وُہ آج بھی زبان زدِ عام ہیں۔

رصافہ کی تعمیر سے بھی قرطبہ دمشق کے ہم پلّہ نہ ہو سکا کہ دُنیا کے اُس قدیم ترین شہر میں ایسی عمارت کھڑی تھی جس کے میناروں اور گنبدوں کی محبّت امیر عبدالرحمٰن الداخل کے اُموی خون میں دوڑ رہی تھی۔ اُس کے اسلاف کی یادگار مسجد اُمیّہ۔ . . . قرطبہ شہر کے درمیان وادی الکبیر کے کنارے ایک قطعۂ زمین تھا جس کے سینے پر زمانے نے ہمیشہ ایسے در و دیوار بلند دیکھے۔ انسان نے ان دیکھی قوتوں کی عبادت کے لیے وقف کیا۔ سب سے پہلے قوطی مندر تعمیر ہوا ہسپانیہ پر رُومیوں کا غلبہ ہوا تو یہاں رُومی معبد بنا دیا گیا۔ عیسائیت کی آمد پر اس کی جگہ کلیسا ونسنٹ کی عمارت کھڑی کر دی گئی۔ عبدالرحمٰن نے ایک لاکھ درہم کے عوض یہ قطعۂ زمین عیسائیوں سے حاصل کیا اور مسجد اُمیّہ دمشق کے مطابق نقشہ بنوا کر ۷۸۶ء میں خود اپنے ہاتھوں سے قرطبہ کی بنیاد رکھی۔ تعمیر کی ذاتی دیکھ بھال کی غرض سے وُہ رصافہ کے کھجوروں کے درختوں جُدا ہو کر قریبی القصر میں آٹھہرا اور روزانہ دو گھنٹے عام مزدوروں کی طرح مسجد کی تعمیر کے اینٹیں اور گارا اپنی پُشت پر ڈھوتا۔ اگرچہ مسجد ابھی مکمل نہ ہوئی تھی، ہر طرف ملبے کے ڈھیر تھے پلستر گیلا تھا۔ نقش و نگار میں رنگ آمیزی باقی تھی کہ عبدالرحمٰن کے دل میں اس خیال کی جڑیں لگیں کہ اُس کا رشتۂ حیات منقطع ہونے کو ہے۔ چنانچہ حکمِ افتتاح جاری ہوا۔ ملبہ کے ڈھیر کو پردوں سے چھپا دیا گیا۔ نامکمل فرش پر قالین بچھائے گئے۔ سفید نفکان۔ سفید عبا اور سفید عمامہ میں ملبوس سُرخ بالوں والے عبدالرحمٰن نے اسی محراب میں کھڑے ہو کر خطبۂ و نماز کی ادائ کر کے مسجدِ قرطبہ کے باقاعدہ افتتاح کی سعادت حاصل کی۔ افتتاح کے چند روز بعد ماردہ شہر میں عبدالرحمٰن وفات پا گیا۔ مسجدِ قرطبہ میں اس کی غائبانہ نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ مسجد کی

توسیع مختلف ادوار میں ہوئی۔ ہشام اول نے مینار تعمیر کروایا۔ عبدالرحمٰن دوم نے محرابوں کی قطاروں کو دو چند کروایا۔ الحکم نے پینتیس ہزار درہم کی لاگت سے منبر و مقصورہ تیار کروایا۔ آخر میں سب سے بڑا اضافہ المنصور کے زمانے میں ہوا جبکہ مسجد کی وسعت چار گنا کر دی گئی۔

پونے پانچ سو برس تک اس محراب سے اللہ اکبر کی آواز اس بے مثال حرم پاک میں گونجتی رہی جہاں اس وقت میرے سامنے ایک پادری منہ گھوسے "آوے ماریا" کی صدائیں بلند کر رہا تھا۔ اسی متبرک مقام پر وہ خون آلود قرآن مجید رکھا ہوا تھا جس کی تلاوت کے دوران حضرت عثمانؓ شہید ہوئے۔ یہیں پر کھڑے ہو کر قاضی المنذر نے امیر اندلس کو محض اس غفلت پر کہ اس نے نماز جمعہ مسجد قرطبہ کی بجائے اپنے محل میں ادا کی تھی سب کے سامنے خطبہ عام میں اتنی سخت تنبیہہ کی کہ امیر اندلس کا چہرہ شرم و ندامت سے سرخ ہو گیا۔ تاریخ دان المقری نے مسجد قرطبہ کے طرزِ تعمیر اور حسن کے بارے میں پوری کتاب تصنیف کی۔

"آوے ماریا.... آوے ماریا!" پادری کی رقت آمیز آواز محراب میں ایک بوڑھے گدھ کی طرح پھڑ پھڑا رہی تھی۔

زمانے کے راہٹ کی ماہل ہمیشہ حرکت میں رہتی ہے۔ اس پر بندھے خالی آبخورے عمیق کنویں کے تازہ پانی سے لبالب بھر کر روشنی کی جانب مائلِ سفر ہوتے ہیں اور پھر خود بخود ماہل کی کی حرکت سے بے اختیار ہو کر جھکتے جھکتے اپنا اثاثہ کھو کر پھر خالی ہو جاتے ہیں۔ ۱۲۳۶ء میں مسلمانوں کی عظمت کا رواں پانی آبخوروں سے خالی ہو گیا۔ قرطبہ عیسائیوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ مسجد کے چند ستون اکھاڑ کر بیچ میں حضرت مریمؑ کا مجسمہ نصب کر دیا گیا۔ یہ صورتِ حال ۱۵۲۰ء تک قائم رہی اور مسجد کسی حد تک اصلی حالت میں موجود رہی۔ پھر قرطبہ کے چند پادریوں نے کارلوس پنجم کو قائل کر لیا کہ کیتھولک ہسپانیہ کے وسط میں مسلمانوں کا ایک معبد عیسائیت کی توہین ہے اس لئے اسے مسمار کر کے یہاں ایک عظیم الشان کلیسا تعمیر کیا جائے۔ کارلوس نے جسے مسجدِ قرطبہ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اجازت دے دی۔ چنانچہ مسجد کے قلب کو پھوڑا گیا۔ سینکڑوں ستون اکھاڑ دیئے گئے۔ چھت کو اُدھیڑ دیا گیا۔ مسجد کا صرف وہی حصہ محفوظ رہا جو کلیسا کے نقشے میں شامل نہ تھا۔ خوبصورتی کی اس لاش پر انہوں نے اپنے کلیسا کی دیواریں

اُٹھائیں۔ ایک کرخت اور واجبی عمارت نے گرد پھیلے ہوئے ہجوم نخیل کو بادِ سموم کی طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کنول کا جنگل مُرجھا گیا۔ کارلوس جب اپنے معماروں کا عظیم کارنامہ دیکھنے کے لئے اندر داخل ہوا تو مسجد کے نازک ستونوں کے درمیان دیو زاد بھدا کلیسا دیکھ کر انتہائی پشیمان ہوا۔ اُس نے رسم افتتاح ادا کرنے سے انکار کرتے ہوئے پادریوں سے کہا "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم کیا کرنے والے ہو تو تم یہ کبھی نہ کر پاتے کیونکہ جو کچھ تم نے یہاں بنایا ہے وہ کہیں بھی تعمیر کیا جا سکتا تھا اور جو کچھ تم نے تباہ کر دیا ہے وہ روئے زمین پر کہیں بھی نہیں دیکھا جا سکتا۔" جیمز مشنر اس کلیسا کو "عظیم بدصورتی" کہنے پر مجبور ہو گیا۔ ہٹن اسے ایک ناقابلِ تلافی جرم قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے "یہ گندا کلیسا ایک ناقابلِ یقین پاگل پن کا مظہر ہے۔ خود نمائی۔ دکھاوٹ اور بازاری پن کا مظاہرہ۔ ایک ایسی ظالمانہ قربانی جو پادریوں نے اپنی مذہبی ہوس کی بھینٹ چڑھا دی۔ یہ عمارت کلیسا سے زیادہ ایک قحبہ خانہ لگتی ہے۔"

"آوے ماریا۔۔۔ آوے ماریا۔۔۔ اوّل و آخر فنا۔۔۔ اوّل و آخر فنا۔۔۔ ماریا۔۔۔ فنا۔۔۔ فنا۔۔۔ فنا!" صدا محراب میں یوں پھڑپھڑا رہی تھی جیسے کسی تُندخو عقاب کے گھونسلے میں ایک حیرت زدہ چڑیا داخل ہو جائے۔

سلطان محمد فاتح بازنطینیوں کو شکست دے کر عیسائیت کے سب سے بڑے معبد سانتا صوفیہ کو مسجد میں بدل دیتا ہے اور آوے ماریا کی بجائے اس کے گنبد سے اللہ اکبر کی صدا ٹکراتی ہے۔ مسلمان دمشق میں داخل ہو کر کلیسائے اعظم کے نصف حصے کو مسجد قرار دے دیتے ہیں۔ کچھ اسی طرح مسجدِ قرطبہ میں اب اللہ اکبر کی بجائے آوے ماریا کی صدائیں۔ تاریخ کے عروج و زوال کا ایک ایسا لازمی حصہ ہیں جس پر انسانی جذبات کو کوئی اختیار نہیں۔ آبخورے ہمیشہ پانی سے بھرے نہیں رہتے۔ ایک مرتبہ ماہل کا چکر مکمل ہو جائے تو انہیں تہی دامن ہونا ہی پڑتا ہے۔۔۔ اوّل۔۔۔ اللہ اکبر۔۔۔ و آخر۔۔۔ آوے ماریا۔۔۔ فنا!

محراب کے ملگجے اندھیرے میں خوابیدہ پچی کاری کے پتھر یکدم ستاروں کی طرح چمکے۔ چھت اور محرابوں کے دامن میں مخفی برقی قمقمے ایک ایک کر کے یوں روشن ہونے لگے جیسے گھنے جنگلوں میں سورج کی پہلی کرن تیرتی چلی جاتی ہے۔ لکڑی کا پھاٹک کھلا اور سیاحوں کا پہلا ریلا کیمروں اور

سیاحتی کتب سے لدا پھندا مسجد کے اندر داخل ہو گیا۔ بھیڑوں کے اس گلّے کا چرواہا گائیڈ ایک ستون پر ہاتھ رکھ کر بے دھیانی سے "تاریخی" تفاصیل بیان کرنے لگا جیسے چوتھی جماعت کا بچہ بلا سوچے سمجھے لہک لہک کر کوئی پہاڑہ سُناتا چلا جاتا ہے۔ پادری نے خاموش ہو کر پیچھے دیکھا اور اس کے ماتھے پہ ناگواری لکیروں کی صورت میں بچھ گئی۔ ان سیاحوں کی آمد سے تقدس کا وُہ بندھن ٹوٹ گیا جس نے ہم دونوں کو مختلف مذاہب سے متعلق ہونے کے باوجود اس عمارت سے یکساں جذباتی شدت کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ اس نے میرے گُم سُم چہرے پر شکایت آمیز نظریں بچھائیں اور حسب عادت میرے سینے پر صلیب لا کر آہستہ آہستہ چلتا مسجد سے باہر نکل گیا۔

مُووی کیمروں کی گراریاں ایک جھنجلائی ہوئی جھنجھناہٹ کے ساتھ گھوم رہی تھیں۔ کلک، کلک ... مسجد کے ستونوں کو مقید کرنے کے لئے کیمروں کے بٹن دب رہے تھے۔ ذنقوں کے بعد فلیش کی ننگی روشنی محرابوں اور ستونوں کو عُریاں کر کے ان کا تقدس چھین لیتی۔ نضا میں ہاتھ لہراتا ہوا گائیڈ مسجد کی خود ساختہ تاریخ کے ساتھ ساتھ اپنے گاہکوں کی تفریح طبع کا سامان بھی پیدا کر رہا تھا" اور اس قدیم پتھر پر کندہ عربی عبارت میں اللہ کی پرستش کرنے والوں کو جنت میں ایسی درجنوں عورتیں دینے کا وعدہ کیا گیا ہے جن میں سے ہر ایک برجی باردو اور صوفیہ لارین سے ہزار گنا خوبصورت اور متناسب جسم کی مالک ہو گی۔"

"میں اسی وقت مسلمان ہو جاتا ہوں"۔ ایک ٹھگنے قد کے سیاح نے اپنی نیکر اُڑستے ہوئے انتہائی سنجیدگی سے اعلان کیا" بس مجھے مُوروں کا خدا یہیں اسی جہاں میں برجی باردو عطا کر دے"۔

"آمین" بقیہ ٹولی نے بمشکل ہنسی ضبط کرتے ہوئے نعرہ لگایا۔

" المنصور نے ٹیکس بڑھا دیئے اور مسجد بھی بڑھا دی"۔

اس مرتبہ ایک امریکی نے اپنے اُوپر مصنوعی بے ہوشی طاری کر لی اور زیرلب بڑبڑایا" اوہ مائی گاڈ! کیا اُن دنوں بھی سٹیٹ ٹیکس ڈیپارٹمنٹ ہوا کرتا تھا۔"

" اور یہ ہے وہ جگہ جہاں کھڑے ہو کر مُوروں کا پادری اپنے اللہ کو آوازیں دیا کرتا تھا۔" یہ کہہ کر گائیڈ ایک کان پر ہتھیلی جما کر مصنوعی سنجیدگی سے "اللہ اللہ" چیخنے لگا۔ بھیڑیں اس تماشے

سے بے حد محظوظ ہوئیں اور منمنانے لگیں۔ اِن میں سے چند محراب کے اندر داخل ہو کر گائڈ کی رفاقت میں "آلا۔ آلا" کا کورس الاپنے لگیں۔

"اور جناب ...." گائڈ نے اپنا دلچسپ مشغلہ منقطع کرتے ہوئے میرے قریب آکر کہا "کیا آپ ہماری پُرلطف سیر میں شامل ہونا پسند کریں گے۔ صرف نیس پسینے!"

میں نے صرف اُسے نظر بھر کے دیکھا۔ آنکھوں کی سُرخی سے اُس نے میرا جواب پایا اور واپس چلا گیا۔

مسجد کا پھاٹک متواتر کھُلتا اور بند ہو رہا تھا۔ سیّاحوں کی متعدد ٹولیاں اندر آ رہی تھیں۔ ہر سُو بے فکرے اور جذبات سے عاری چہرے تھے جو چار دیواری سے متصل شراب خانوں سے اُٹھ کر صرف اپنی گائڈ بک پر مسجدِ قرطبہ کے آگے "دیکھ لی" کے الفاظ لکھنے کے لئے ادھر چلے آئے تھے اس کملائے ہوئے کنول کے جنگل میں۔ ستونوں کے جھنڈ میں۔ سجدوں کے جنگل میں اب جھینگروں کی حکمرانی تھی۔ کلِک۔ کلِک۔ فلیش فلیش!

میں مسجد سے باہر جانے کے لئے پھاٹک کے پاس پہنچا تو کواڑ کھُلا اور وہ دراز قد عورت اندر داخل ہو گئی جو پچھلی شب کیمپنگ کے سومنگ پُول میں ایک رُوح کی طرح خاموشی سے تیر رہی تھی۔ وہ مراکو کے روایتی لباس لمبے سفید چوغے میں ملبوس تھی۔ اُس نے سر اور چہرے کو ایک رُومال سے اس طرح ڈھانپ رکھا تھا کہ گندمی رنگ کے کینوس پر صرف دو چمکدار اور خوبصورت آنکھیں حرکت کرتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ ایسی سیاہ تتلیوں کی مانند جو انجانے میں شہد کی نہر پر بیٹھ جائیں اور پھر پاؤں چپٹ جانے سے بس پھڑپھڑاتی رہیں۔ مجھے یوں مقابل پا کر وہ لمحہ بھر کے لئے رُکی۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی وحشت جھلک رہی تھی۔ اپس کے کسی بلند اور دُور افتادہ گاؤں کی طرح جو حسنِ فطرت کا شاہکار ہونے کے باوجود اپنی ویرانی اور سناٹے سے دل میں ایک سرد خوف بھر دیتا ہے۔ بوڑھی خادمہ حسبِ معمول چمڑے کا تھیلا دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑے اُس کے پہلو میں کھڑی تھی۔ اُس نے جھُک کر عورت سے کچھ کہا اور وہ دونوں معدوم ہوتی ہوئی گونج کی طرح مسجد کے ستونوں میں گُم ہو گئیں۔

صحنِ مسجد میں اب خوب رونق تھی۔ نارنگیوں اور سرو کے درختوں تلے مسجد کے نواحی علاقوں میں کام کرنے والے مزدور دوپہر کے کھانے کی پڑلیاں پھیلائے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ فوارۂ زیتون کی دھار کے نیچے ایک مٹکا دھرا تھا اور منڈیر پر بیٹھی ایک بڑھیا تالاب میں ڈبکیاں لگاتے منند بچوں کو چھینٹے اڑانے پر سرزنش کر رہی تھی۔ ٹکٹوں کی کیبن کے گرد سیاحوں کا ہجوم تھا۔ محافظ کا ہاتھ رقم دبوچ دبوچ کر ٹکٹ جاری کر رہا تھا۔ مسجد کی زیارت سے فارغ ہو جانے والے سیاح اِدھر اُدھر بنچوں پر براجمان تصویری پوسٹ کارڈوں پر اپنے تاثرات قلمبند کر رہے تھے۔ صحن کے طویل برآمدوں میں ایک ہسپانوی جوڑا بہت دیر سے چھت کے نقش و نگار سراہنے کے بہانے کسی ایسے کونے کی تلاش میں تھا جہاں وہ مخل ہوئے بغیر عبادتِ عشق کے ابتدائی مکالمے سکون سے ادا کر سکے۔ بڑھیا کا مٹکا بھر چکا تو میں نے فوارۂ زیتون کی ٹھنڈی دھار سے اپنے تمتماتے چہرے کو تر و تازہ کیا اور پھر باب التوبہ سے باہر آ گیا۔

صحن کے برعکس چار دیواری کے گرد بیٹی سڑک سنسان پڑی تھی۔ باب التوبہ کے پہلو میں عبدالرحمن سوئم کی یاد میں ہسپانیوں کے تعمیر کردہ پتھریلے چبوترے پر ایک چیل بیٹھی ہوئی تھی۔ قریب پہنچنے پر اس نے پر پھیلائے اور ایک ہی اڑان میں مینارِ مسجد کی چوٹی پر سینٹ رافیل کے سر پر جا براجمان ہوئی۔ یادگار سے پرے دیوار کی گود میں پھولوں والی کنواری مریمؑ کا چیپل دکھائی دے رہا تھا۔ بی بی مریم کے پاؤں میں سوکھے ہوئے پھولوں کا ایک ڈھیر تھا۔ میں نے پوری عمارت کی وسعت کا اندازہ لگانے کے لئے دیوار کے ساتھ فٹ پاتھ پر چلنا شروع کر دیا۔ بائیں ہاتھ پر دستی مصنوعات کی دکانیں تھیں جن میں سے بیشتر کے دروازوں پر "قیلولے کے لئے بند ہے" کی تختیاں لٹک رہی تھیں۔ ان سے پرے مُورش طرزِ تعمیر کی حویلیوں کی چھتوں پر شاہی القصر کے سنگلاخ در و دیوار کے سائے تھے۔ میں دیوار کے جس حصے کے قریب چل رہا تھا اس میں جا بجا وہ بند دروازے دکھائی دے رہے تھے جو پہلے القصر کی جانب کھلتے تھے۔ مسجد کے اندر چونکہ ان دروازوں کے آگے چیپل تعمیر کر دیئے گئے ہیں اس لئے ان کی بناوٹ کا اندازہ صرف باہر سے ہی ہو سکتا ہے۔ ان میں سے ایک آدھ کے سوا باقی تمام دروازے ابتدائی نقشے کو سامنے رکھ کر از سرِ نو تعمیر کئے گئے ہیں۔ پورتا او کسنیڈل کی زیبائش تو بالکل حال ہی میں ہوئی ہے۔ البتہ پورتا استیبان اس لحاظ سے منفرد ہے کہ یہ دروازہ ابھی تک ابتدائی

حالت میں قائم ہے۔ سُرخ و سفید نعل نما محراب کے دونوں طرف جالیاں ہیں۔ کہیں کہیں پیچیدہ نقش و نگار کی حامل پتھر کی سلیں ہاتھ لگانے سے یوں لرزتی ہیں جیسے قدامت کا یہ بوجھ اب اُن سے زیادہ دیر نہ اُٹھے گا۔ پلستر اُکھڑ چکا ہے اور سلوں کے درمیان منہ کھولے شگافوں میں سے خودرو گھاس جھانک رہی ہے۔ ہر سال بارش کا پانی ان شگافوں کو مزید گہرا کر دیتا ہے اور اس عمارت میں استعمال ہونے والی سُرخ مٹی گھُل گھُل کر وادی الکبیر کے پانیوں میں جا ملتی ہے۔ ایک اور دروازہ پورتا او زنیل اس سے بھی شکستہ حالت میں ہے۔ پلستر کی غیر موجودگی میں سُرخ اینٹیں ایک ڈھانچے کی ہڈیوں کی طرح عمارت کے جسم میں سے اُبھری ہوئی ہیں۔ میں نے ایک دراڑ کی مٹی کریدی تو دو تین اینٹیں بھربھرے پلستر کی بارہ سو سالہ رفاقت سے جُدا ہو کر میرے قدموں میں گر گئیں۔ مجھے خیال آیا شاید انہی تین اینٹوں کو امیر عبدالرحمٰن نے خود دیوار پر جمایا ہو؟ ان کے درمیان اس سُرخ مصالحے کی تہہ اپنے ہاتھوں سے ہموار کی ہو۔ میں نے جیب میں سے رومال نکال کر پوروں سے چمٹے سُرخ ذرے یوں صاف کئے جیسے ارتکابِ جُرم کے بعد شواہد مٹائے جاتے ہیں۔ رنگ اتنا شوخ تھا کہ سفید رومال لہولہان ہو گیا۔ مسجد کا جو حصّہ وادی الکبیر کی جانب ہے اُس کی دیوار بقیہ چار دیواری سے تین گنا اونچی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے جس طرح بادشاہی مسجد لاہور کی شمالی دیوار اس لئے زیادہ گہری رکھی گئی تھی کہ اس کے پہلو میں دریائے راوی بہتا تھا، اسی طرح مسجد قرطبہ کی اس بلند دیوار کے ساتھ اُن دنوں وادی الکبیر کے پانی رواں تھے۔

انسانی جسم کی ضروریات اگر متوازن طریق سے پوری ہوتی رہیں تو وُہ ایک بے دام غلام کی طرح آپ کی خواہشوں کا ساتھ دیتا ہے مگر آج صبح سے روحانی غذا کا پلڑا کچھ یوں جھُکا رہا کہ جسمانی غذا کی ضرورت ذہن سے تو اُتر گئی لیکن ٹانگوں نے اس کی فراہمی کے بغیر نقوشِ کہنہ کا مزید طواف کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ "گوریدا" کی چھت سے ہسپانیہ کے دیگر قہوہ خانوں کی مانند گرم مسالوں سے محفوظ شدہ سوروں کی تھوتھنیاں اور گرانڈیل رانیں لٹک رہی تھیں۔ ڈاک کے ٹکٹوں کی طرح بل فائٹنگ کے پرانے پوسٹر بھی نوادرات میں شمار ہوتے ہیں۔ یہاں مٹیالی دیواروں پر چسپاں پوسٹر خانہ جنگی سے پہلے کی بُل فائٹوں کا اعلان کر رہے تھے۔ کاؤنٹر کی سطح پر ورنشک سے قہوہ خانے کا مالک ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ وہ چند کرسیاں جوڑ کر ان پر بحالتِ قیلولہ میں دراز تھا۔ نیند کے مزوں میں اچانک مداخلت

پر اُس کے چہرے پر جو ناگواری ظاہر ہوئی وہ ایک گاہک کا چہرہ دیکھ کر فی الفور باطن میں جذب ہوگئی اور اُس نے حسبِ منشا مجھے گازپاچو سُوپ کا پیالہ اور ایک لمبی ڈبل روٹی مہیا کر دی کھانے سے فارغ ہو کر میں نے ڈائری کے اوراق پر اپنے تاثرات آتارنے کا عمل شروع کیا مگر قہوہ خانے کی سکون آمیز نیم تاریک فضا مجھ پر غالب آئی اور میں وہیں چپکے ہوئے صوفے پر ٹانگیں پھیلا کر اونگھنے لگا۔ جب آنکھ کھلی تو چھت سے لٹکے جالوں سگریٹ کے دھوئیں میں ڈوبے نظر آئے۔ انگلستان کے دیہات کی کہر آلود صبح میں ٹھٹھرتے مویشیوں کے کسی گلّے کی طرح۔ قہوہ خانہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ میں نے کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر گرم گرم کافی کے چند گھونٹ بھرے اور بل ادا کر کے باہر آ گیا۔

سُورج ڈھل چکا تھا۔ باب التوبہ بند ہو چکا تھا۔ ایک پادری پھُولوں والی مریم کے آگے جھکا موم بتیاں روشن کر رہا تھا۔ دیوارِ مسجد کے سائے میں آراستہ پیراستہ بگھیوں کی ایک قطار تھی۔ بگھی بان جو بُل فائٹروں کے بھڑکیلے لباس میں جکڑے ہوئے تھے گھوڑوں کی باگیں تھامے قریب سے گذرتے ہر سیّاح کو قرطبہ کی خوبصورت ترین بگھی میں سوار ہو کر عرب محلے کی سیر کی دعوت دے رہے تھے۔ دستی مصنوعات کی دکانیں بھی کھُل چکی تھیں۔ عربوں کے عہد میں قرطبہ نے چمڑے کی صنعت میں اتنا عروج حاصل کیا کہ چمڑے کو صرف "قرطبن" کے نام سے پُکارا جانے لگا۔ یہ لفظ آج بھی مستعمل ہے۔ مسجد کے سامنے ان دکانوں میں زیادہ تر "قرطبین" سے بنی ہوئی مصنوعات فروخت ہوتی ہیں۔ میں دیوارِ مسجد کے سائے میں دریائے وادی الکبیر کی جانب اُترنے لگا۔ پورٹا اورنتیل میں سے اُکھڑی ہوئی وُہ سرخ اینٹیں ابھی تک فٹ پاتھ پر پڑی تھیں جنہیں آج دوپہر میرے لمس نے اُن کے قدیم مسکن سے جُدا کر دیا تھا۔

مسجد کی شمالی دیوار کے قریب پورٹا دل پوئینتے کی بُلند مگر بدصُورت رُومی محراب وگرے پانیوں کے دریا" وادی الکبیر کے کنارے کھڑی ہے۔ یہ محراب اُس رُومی پُل کے نکتۂ آغاز پر واقع ہے جسے ہشام نے ناربون (فرانس) کی فتح کے بعد مالِ غنیمت سے ازسرِ نو تعمیر کیا تھا۔ پُل کی رسمِ افتتاح کے موقع پر ایک فقیہہ نے الزام لگایا کہ چونکہ اس سے پیشتر ہشام کو شکار کے لئے شہر سے باہر نکلنے کے لئے ایک دُور دراز جانا پڑتا تھا اس لئے اس نے المنصر کے سامنے یہ پُل رعایا کی بہبود کی بجائے صرف اپنے ذاتی فائدے کی خاطر بنوایا ہے۔ ہشام نے فقیہہ کے الزام کا جواب یُوں

دیا کہ پوری زندگی اِس پُل پر قدم نہ رکھا۔ ۔ ۔ ۔ بہرحال مَیں نے اس پُل پر قدم رکھا۔ پُل کی دیوار پر ایستادہ سینٹ رانیل کے مجسمے تلے جلتی موم بتیوں کی روشنی میں چلتا۔ وادی الکبیر کی پنہائیوں میں جھانکتا دوسرے سرے پر پہنچا جہاں "قلعہ ہورا" نام کا ایک حفاظتی برج کھڑا ہے۔ عرب عہد کے اس خوشنما برج میں ان دنوں کوئی الا بلا قسم کا عجائب گھر قائم ہے۔ میں قلعہ ہورا سے گذر کر دریا کے کنارے کنارے ایک نیم پختہ ویران سڑک پر ہو گیا جس کے دائیں جانب اُجاڑ ٹیلوں پر گھاس پھونس اور خاردار جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور بائیں طرف دریا کا حفاظتی بند تھا۔ تھوڑی دُور چلنے کے بعد میں دریا کی سطح تک جاتی سیڑھیوں سے نیچے اُترا اور ریتلے کنارے پر بیٹھ کر سگریٹ سلگا لیا۔ شام کے دھندلکے میں قرطبہ کے بام و در ازمنۂ وسطیٰ کے کسی شہر کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ اِس کی قدیم عمارتوں پر شفق ایک سرخ بادل کی طرح اُمڈ کر ٹھہری ہوئی تھی۔ بارہ سو برس پیشتر اگر کوئی کاروان سرِ شام شہر کے قریب پہنچا ہو گا تو دھندلکے میں مدھم مدھم روشن قرطبہ اِسی طور ایک ساکت تصویر کی صورت دکھائی دیتا ہو گا۔ دریا میں پانی کی کمی کی وجہ سے سطح پر چھوٹے چھوٹے جزیرے اور ٹاپو اُبھرے ہوئے تھے جن پر جنگلی جھاڑیوں کے پہلو بہ پہلو رعنا اور رنگ کے پھول بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ایک جزیرے پر چند عورتیں دن بھر کے دھوئے ہوئے کپڑوں کو اکٹھا کرنے میں مصروف تھیں۔ ایک بچہ پانی میں ہاتھ ڈالے نہ سے سنگریزے تلاش کر رہا تھا۔ جب منشا کوئی گول پتھر ہاتھ آتا تو وہ اسے بڑے اہتمام کے ساتھ اپنی ماں کے ہاتھ میں تھما دیتا جو اُسی لمحے اُس کی نظر بچا کر واپس پانی میں پھینک دیتی۔ جزیروں کے درمیان رواں پانیوں میں کبھی کبھار کوئی مچھلی اُچھلتی۔ شفق کی زد میں آتے ہی سُرخ ہو جاتی اور پھر فضا میں تیرتی ہوئی شڑاپ سے نیچے گر جاتی جا بجا اُبھرے جزیروں کو چھوتا ہوا دریا کا آہستہ رو پانی شام کے سکوت میں ایک متواتر سُر کو جنم دے رہا تھا۔ ایک مدھم سرسراہٹ جو زریاب کے نغموں کی طرح فضا میں پھیل رہی تھی۔

ہارون الرشید کی ایک محفل میں جب نوجوان زریاب نے سُر کی دیوی کو یُوں زیر کیا کہ اُستاد اسحاق موصلی کو بھی پیچھے چھوڑ گیا تو اسحاق کے قہر سے بچنے کی خاطر اس نے بغداد کو چھوڑ نے میں ہی عافیت جانی۔ عبدالرحمٰن سوئم بذاتِ خود فصیلِ قرطبہ کے باہر اُس کے استقبال کو آیا۔ شاہی محل کی چابیاں دس روز کے لئے زریاب کے حوالے کر دی گئیں تاکہ وہ اتنے طویل سفر کے بعد

مکمل آرام کرے اور تازہ دم ہو کر دربار میں اپنے فن کا مظاہرہ کرے۔ زریاب نے فنِ موسیقی کے علاوہ اندلسی رہن سہن کے آداب کو بھی نئی قدروں سے روشناس کیا۔ اُس نے کپڑے کی بجائے چمڑے سے تراشیدہ دسترخوان اور دھات کی بجائے چینی کے ظروف کو فروغ دیا۔ اُسے اپنے زمانے کا فیشن ڈیزائنر کریسچن ڈیور بھی کہہ لیجیے جو موسمِ بہار اور موسمِ سرما کے اوائل میں آئندہ چھ ماہ کے لئے بالوں کے نئے سٹائل اور لباس کی جدید وضع قطع کا اعلان کرتا جو پورے اندلس میں رواج پا جاتے۔ زریاب کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ اُسے دس ہزار سے زائد غزلیں زبانی یاد تھیں۔ اس کی دو لونڈیوں غزالاں اور ہُنیدا نے صرف اس لئے شہرت پائی کہ وہ ان شعروں کو لکھنے پر مامور تھیں جو حالتِ خواب میں زریاب پر وارد ہوتے تھے۔

جزیروں اور ٹاپوؤں کے درمیان تین آسیب زدہ پن چکیاں یوں براجمان تھیں جیسے چند دیوزاد پرندے سستانے کی خاطر پانی پر اُترے اور پھر ان کے پاؤں ریت میں دھنس گئے۔ ان بوسیدہ پن چکیوں میں سے صرف ایک کی چرخی قائم ہے مگر آبخوروں سے خالی جیسے انگور کے خوشے سے دانے اُتر جائیں تو وہ بے نام ہو جاتا ہے۔ مُدتوں ان پن چکیوں نے وادی الکبیر کے پانیوں سے قرطبہ کے باغوں اور باغوں کو سیراب کیا۔ پھر چرخیاں ختم گئیں۔ تاریخ کی چال رُک گئی۔ آبخورے پانی سے خالی ہو گئے۔ ان میں سے ایک کو جو غالباً القصر کے سامنے ہے قاضی ولی محمد نے رواں حالت میں دیکھا تھا۔ مقامی باشندے ان پن چکیوں کو ماہینوز کے نام سے پکارتے ہیں۔

میری بلائنڈ ڈیٹ۔ قرطبہ۔ نے مجھے مایوس نہیں کیا تھا۔ دریا کے پار اس بزرگ شہر کے افقی خطوط کے حسن کی اوس دھیرے دھیرے پیاس کے بھانبڑ کو سرد کر رہی تھی۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر لبِ دریا ایک مورش پن چکی کی شکستہ عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ تجسس نے میرے قدموں کو ٹھوکا دیا اور میں ایک ایسی پتھریلی پگڈنڈی پر ہو لیا جس کے اختتام پر پن چکی کے پیٹ میں نصب ایک اُدھ کھلا کواڑ نظر آ رہا تھا۔ یہ راستہ پن چکی سے پانچ چھ گز ادھر ہی ختم ہو گیا۔ درمیان میں زمین کے ایک مختصر ٹکڑے پر پانی رواں تھا۔ میں نے اپنے بوٹ اُتار کر بغل میں دابے۔ پتلون گھٹنوں تک اُوپر چڑھائی اور وادی الکبیر کی اس شاخ کو عبور کر کے منزلِ مقصود تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ کرم خوردہ کواڑ ہاتھ لگاتے ہی کھل گیا۔ میں نے اندر جھانکا۔ آبخوروں سے خالی

ایک طویل ہال کسی مُردہ اژدہے کی مانند ایک دیو ہیکل چرخی پر لٹکی ہوئی تھی۔ خستہ سیڑھیاں سرکتی ہوئی نیچے گہرائی تک جا رہی تھیں۔ پہلے خیال آیا کہ اے برادر! ایک تو ادھر مسجدِ قرطبہ کی دیوار کا ایک حصّہ ڈھا کر چلے آئے ہو اور اب اگر اس سیڑھی پر قدم رنجہ فرماؤ گے تو شاید اس عہدِ رفتہ کی یادگار پن چکی کو بھی لے ڈوبو گے۔ پھر ڈھارس بندھی کہ اگر یہ عمارت سینکڑوں برس سے یونہی قائم ہے تو اب اس ناچیز کے گناہوں کے بوجھ تلے تو مسمار ہونے سے رہی۔ میں نے اندر قدم رکھا اور بے حد احتیاط سے سیڑھیاں اُترنے لگا۔ پن چکی کی نچلی منزل میں سے شاید رُومی پل کی جانب کوئی کھڑکی کھلتی تھی کیونکہ زیریں حصّے میں ابھی تک سُرخی مائل روشنی کا ایک ٹکڑا پناہ گزین تھا۔ ایک انتہائی ٹوٹی پھوٹی سیڑھی پر قدم رکھنے سے پیشتر میں نے دیوار کا سہارا لیا تو میری ہتھیلی کے بوجھ سے پلستر کی ایک تہہ اکھڑی اور پھر اس کے پیچھے ایک سر سراتا ہوا چوکور پتھر کھسک کر نیچے گر گیا۔ اس کے ساتھ ہی گہرائی میں سے ایک ایسی دلدوز نسوانی چیخ برآمد ہوئی کہ میرا تو کلیجہ دہل گیا۔ اگر سیڑھیوں کی شکستگی کا خیال نہ ہوتا تو میں بلا شبہ قلانچیں بھرتا ہوا پن چکی سے باہر نکل جاتا۔ میں کچھ دیر حواس باختہ اُسی حالت میں بُت بنا کھڑا رہا اور پھر ہمت کر کے نیچے جھانکا۔ پن چکی کی تہہ میں وادی الکبیر کی سطح کے متوازی ایک کھڑکی کے قریب جہازی سائز کے سرخ میکسکن ہیٹ کو ہاتھوں میں تھامے ایک لڑکی انتہائی سراسیمگی کی حالت میں اُوپر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہیٹ پر رکھی انگلیاں دہشت سے لرز رہی تھیں اور اُس کا چہرہ شفق کی سُرخ روشنی میں بھی زرد نظر آ رہا تھا۔ دیوار میں سے کھسکا ہوا بلکہ کھسکایا ہوا بھاری پتھر اُس کے بالکل قریب پڑا تھا۔ یعنی میں سنگساری کا مرتکب ہوتے ہوتے بچا تھا۔

"سوری" میں نے ہاتھ ہلا کر افسوس کا اظہار کیا اور کسی غیر مناسب جواب کا انتظار کئے بغیر ایک مفرور مجرم کی طرح چپکے سے باہر نکل آیا۔

کیمپنگ میونسپل جانے والی بس میں زیادہ تر قرطبن سرائنیں جن کی قربت میں مجھے یُوں محسوس ہوا جیسے اپنے آبائی گاؤں جوکالیاں کی کسی شادی میں شرکت کر رہا ہوں۔ نذرا میراثی جنبیلی کے تیز عطر کا "تونیا" مٹھی میں دبائے چوہدریوں کے کھدر کے کُرتوں کو عطر بیز کر کے لاگ وصول کر رہا ہے۔ بھاگ لگتے رہن .... میرے کُرتے پر بھی تونیے کا وار ہوتا جس کے نتیجے میں اگلے کئی روز

تک میں زکام میں مبتلا رہتا ۔ قرطبہ کی بس میں مجھے جو کالیاں یوں یاد آیا کر اُن خواتین نے نہایت فراخدلی سے اُسی قسم کا جنگلی چنبیلی کا تیز عطر اپنے فراخ جسموں پہ چھڑک رکھا تھا چنبیلی کی تیز خوشبو اور آنکھوں کے گرد نیلے میک اپ کا استعمال ہسپانوی نازنینوں کا پسندیدہ سنگھار ہے ۔ مجھے رہ رہ کر اُس میکسیکن ہیٹ کا خیال آرہا تھا ۔ وہ لڑکی کیمپنگ والی عورت کی مانند پُراسرار تو نہ تھی مگر شام ڈھلے وادی الکبیر کے کنارے ایک کھنڈر کی تہہ میں یوں اعتکاف میں بیٹھنا میری سمجھ سے باہر تھا ۔

جُستجو کا اسفنج جو آج صبح پرندے کے پَر سے بھی ہلکا تھا، تمام دن کھوج کے پانیوں میں ڈوبا رہنے کے باعث اب اٹھائے نہیں اٹھتا تھا چنانچہ کیمپنگ پہنچتے ہی میں نے تازہ دم ہونے کے لئے تالاب کا رُخ کیا ۔ راستے میں مراکشی حسن کا خیمہ پڑتا تھا جو اپنے پورے خاندان سمیت ایک قالین پر براجمان کافی پینے میں مشغول تھا ۔ ظاہر ہے مجھے بھی بٹھا لیا گیا ۔ کافی اور سینڈوچوں سے فارغ ہو کر حسن بھی میرے ساتھ ہو لیا ۔ تالاب کے قریب حسبِ معمول پھوس کی جھونپڑی میں بوڑھی خادمہ سر جھکائے بیٹھی تھی ۔ اس کی مالکہ بھُورے سنگِ مرمر سے تراشیدہ کسی زندہ مجسمے کی طرح پُرسکون پانی میں تیر رہی تھی ۔ حسن کے لئے بڑھیا کے لبوں پر ایک خفیف سی مُسکراہٹ ابھری جو مجھے ہمراہ دیکھتے ہی ڈوب گئی ۔ میں نے اپنا تولیہ حسن کے حوالے کیا اور تالاب میں چھلانگ لگا دی ۔ پانی کی ہلچل بھُورے سنگِ مرمر تک پہنچی تو اُس کی سیاہ آنکھیں لہروں کے تلاطم کا پیچھا کرتیں مجھ تک آگئیں ۔ اُس کی آنکھوں میں وہی بھوک کی وحشی چمک تھی ۔ گردن تک تہہِ آب ہونے کے باوجود میرے جسم کے پوروں سے پسینے کے قطرے پھوٹنے لگے ۔ مجھ میں اس عورت سے آنکھیں ملانے کی تاب نہ تھی ۔ اس اثنا میں کسی نامعلوم اشارے کے تابع بڑھیا جھونپڑی میں سے نکل کر تالاب کے کنارے آچکی تھی اور اُس نے سفید لبادہ اس انداز سے آگے پھیلا رکھا تھا کہ تالاب سے نکلتے وقت میں اُس عورت کا جسم بالکل نہ دیکھ پایا ۔ لبادہ اوڑھ کر اُس نے بالوں کو جھٹکا اور خادمہ کے ہمراہ اپنے خیمے کی جانب چلی گئی ۔

نہانے سے فارغ ہو کر حسن اپنے خیمے میں سے مراکو میں کشید کردہ ریڈ وائن کی ایک بوتل اٹھا لایا ۔ بقول اُس کے یہ چونکہ بے حد ہلکی ہونے کی وجہ سے مخمور نہیں کرتی اس لئے اس پر مذہبی پابندی لاگو نہیں ہو سکتا تھا ۔

کیمپنگ کے پہلو میں سے جاتی ہوئی سڑک پر وقفوں سے گذرنے والی ٹریفک بھی ختم ہو گئی۔ تھوڑی دیر پہلے سیرا موریناکی بلندیوں پر ٹراتے ہوئے جھینگروں کا شور بمشکل سنائی دیتا تھا۔ جُوں جُوں رات گہری ہوتی گئی یہ شور قریب آتا گیا یہاں تک کہ ہمارے گرد پھیلے ہوئے زیتون کے درختوں میں گونجنے لگا۔ ہم گئی رات تک تالاب کے کنارے بیٹھے دنیا جہان کے مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے رہے مگر میرے ذہن پر وُہ سفید لبادے والی عورت ایک آسیب کی طرح مسلط تھی۔ بالآخر مجھ سے نہ رہا گیا اور مَیں نے حسن سے پُوچھا۔

"حسن تم تو کئی روز سے اس کیمپنگ میں مقیم ہو۔۔۔۔ یہ عورت اور اُس کی بوڑھی خادمہ۔۔۔۔ کیمپنگ میں اُن کی موجودگی سے مجھے تو اپنے خیمے میں بھی سوتے ہوئے خوف آتا ہے۔"

حسن کا شگفتہ چہرہ یکدم سنجیدہ ہو گیا "مجھے معلوم تھا کہ تمہیں بھی اُن کے بارے میں تجسس ہو گا۔ میں بھی شروع شروع میں تمہاری طرح اُس کی آنکھوں سے اُس کے پُراسرار وجود سے خوفزدہ ہو گیا تھا" وہ تالاب کے پانی میں ہاتھ ڈال کر کہنے لگا "لیکن صرف آج صبح مجھے اصلیت کا علم ہوا ہے۔ آج صبح میرے بیوی بچے مدینۃ الزہرا کے کھنڈرات دیکھنے کے لئے گئے ہوئے تھے میں ناسازیٔ طبع کی بنا پر اپنے خیمے میں اکیلا بیٹھا ہوا تھا کہ یہ بڑھیا اندر آئی اور عربی زبان میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی 'میری مالکہ ہمیشہ ناشتے میں دودھ کے ساتھ کھجوریں استعمال کرتی ہے۔ بدقسمتی سے آج ہمارا ذخیرہ ختم ہو گیا ہے اور آپ چونکہ عرب ہیں اس لئے شاید۔۔۔۔ کھجوریں تو میرے پاس نہ تھیں البتہ میں نے اُسے قرطبہ کی ایک ایسی دکان کا پتہ بتا دیا جہاں سے یہ بآسانی دستیاب ہو جاتی ہیں۔ وُہ شکریہ ادا کر کے باہر جانے لگی تو میں نے ڈرتے ڈرتے اس کی مالکن کے بارے میں استفسار کیا پہلے تو وُہ جھجکتی رہی مگر پھر میرے اصرار پہ ایک ہموطن عرب ہونے کے ناطے سے اُس نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔۔۔۔ تمہیں شاید معلوم ہو گا کہ چار سو سال پیشتر جب مسلمان اندلس سے مکمل طور پر نکالے گئے اُن میں چند اُمرا ایسے بھی تھے جو اپنی موروثی حویلیوں کی چابیاں اور املاک کے کاغذات ملکیت اس اُمید پر اپنے ساتھ لے گئے کہ اگر اللہ نے چاہا تو ایک روز وُہ ضرور اپنے آبائی وطن کو لوٹیں گے اور ان اُجڑی حویلیوں میں پھر سے بسیرا کریں گے۔ ویران باغوں کو دوبارہ آباد کریں گے۔ صدیاں گذر گئیں مگر اِن اُمرا کی آل اولاد ان کاغذات اور چابیوں کو سینے سے لگائے رہی۔ جب ان سے پوچھ

جانا کہ اگر تمہارا وطن تمہیں واپس مل بھی جائے تو کیسے اپنے گھر اور باغ تلاش کرو گے تو وہ کہتی: اللہ ہمیں بتائے گا.... یہ عورت الطاہر نامی بربر قبیلے کے ایک معروف سردار کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اُس کا نام ولادہ ہے اور خادمہ کے بقول اُس کا شجرۂ نسب اندلس کی مشہور شاعرہ ولادہ سے ملتا ہے۔ ہر سال وہ صحرا سے نکل کر قرطبہ اور غرناطہ میں آتی ہے۔ بوڑھی خادمہ کے تھیلے میں اُن حویلیوں کی قدیم چابیاں اور بوسیدہ کاغذات ہیں جو اِن بزرگ شہروں میں اُس کے آباؤ اجداد کی ملکیت ہوا کرتی تھیں۔ وہ پورے دو ماہ ان شہروں کے مورش گلی کوچوں میں اپنے قدیم مسکن تلاش کرتی ہے اور پھر ناکام واپس لوٹ جاتی ہے۔"

"لیکن حسن یہ تو پاگل پن ہے۔ اُن تمام عمارتوں کے کھنڈر بھی شاید اب زیرِ خاک ہوں گے۔ باغ اُجڑ کر صحرا ہو چکے اور اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ...."

"یہ تم مجھ سے کیوں پوچھتے ہو ولادہ سے پوچھو!"

کیمپنگ پرنسپل کے تالاب کے درمیان پچھلی شب کا چاند ماند پڑ چکا تھا۔ اُس کی عظمت اور روشنی ختم ہو چکی تھی مگر پھر بھی ہر سُو ایک بے نام سی ہلکی روشنی پچھلے زمانوں کی درخشندگی کا پتہ دے رہی تھی۔

واللہ! مستنصر باللہ!

مسجدِ قرطبہ کے چوکور مینار کے اندر گھٹا ٹوپ تاریکی تھی۔گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ باہر سفید دھوپ کا سیلاب پگھل رہا ہے۔آنکھیں گیلی ٹھنڈک محسوس کرتی ہیں اور سُرخ مٹی کی زنگ آلود خوشبو قدامت کا پیام دیتی ہے۔یہاں بادشاہی مسجد کے مینار کی طرح جا بجا مستطیل سوراخوں میں سے ناچتے ذرّوں کی مدھم روشنی کے شہتیر تاریکی میں نہیں اُترتے۔نیچے آتے لوگوں کی گفتگو کی گونج خاموشی کے تسلسل میں حائل نہیں ہوتی۔قیامِ قرطبہ کے دوران میں صبح شہر کے قدیم حصّوں کی آوارہ گردی میں گذرتی۔دوپہر کو سُورج کی تپش نوکو میں روپوش کسی قہوہ خانے میں پناہ لینے پر مجبور کر دیتی جہاں اِس کتاب کے لیے نوٹس تیار ہوتے۔پچھلے پہر جہاں کہیں بھی ہوتا قرطبہ کے کُھلے آسمان پر مینارِ مسجد کو تلاش کر کے اُس سمت چل کھڑا ہوتا۔درونِ مسجد جانے سے پیشتر باب التوبہ کے پہلو میں واقع ایک مختصر دروازے کو اس اُمید پر آہستہ سے دھکیلتا کہ شاید آج قسمت یاوری کرے، دروازہ کُھلا ہو اور میں سیڑھیاں طے کر کے مینار کی چوٹی تک جا سکوں اور پھر ہمیشہ اِسے اندر سے مقفّل پا کر صحن میں کسی کھجور کے درخت تلے اپنے کیمروں کا تھیلا سرہانے رکھ کر سو رہتا۔بیشتر شامیں حسن کی رفاقت میں کیمپنگ کے سرمنگ پڑاؤ کے کنارے بسر ہوتیں۔آج جب حسبِ معمول چوری چھپے دروازے کے قریب پہنچا تو دونوں کواڑ منتظر باہوں کی طرح کُھلے تھے.....پہلی منزل کی بالکونی سے صحنِ مسجد یوں نظر آتا ہے جیسے کسی بساط پر کھجور اور زیتون کے سرسبز مہرے رکھے ہوں۔تیسری منزل پر پہنچا تو میرے سر پر قدِ آدم گھڑیال لوہے کے کنڈل اوندھے جھول رہے تھے۔اِن کے اُوپر قرطبہ کا چوکیدار سینٹ رافیل تنہا کھڑا تھا۔اسی جگہ پر

الناصر نے سونے کے بنے ہوئے بڑے بڑے لٹو نصب کروائے تھے جو ہوا کے چلنے سے گردش
میں آجاتے تھے۔ مجھے یاد ہے جب ہمارے گاؤں کی کچی مسجد کو ازسرِ نو پختہ تعمیر کیا گیا تھا تو ایک مقامی
لوہار نے چاندی کے لٹو بنا کر میناروں پر نصب کیے تھے۔ کتنی عجیب بات ہے اُندلس کا خلیفہ الناصر
اور پاکستان کا ایک دیہاتی لوہار وقت اور فاصلے کی گہری خلیج کے باوجود اظہارِ عقیدت کے لیے
یہی طریقہ اپناتے ہیں۔ ایک طرف تو صحن مسجد تھا اور دوسری جانب میرے قدموں میں پرانے شہر
کی دلآویز سُرخ چھتیں دُھوپ میں چمک رہی تھیں۔ چھتوں کے اس سُرخ سمندر میں خوبصورت
صنوبر سبز جزیروں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ فصیلِ قرطبہ کے باہر شہرِ جدید کی ڈربہ نما عمارتیں
اور پھر اُن سے پرے پُورے شہر پر ایک آسیب کی طرح سایہ کیے ہوئے سیرا مُورینا
..مُوروں کے رنگ کا پہاڑ...... کالا پہاڑ! بائیں ہاتھ پر القصر تھا جس کی کھڑکیاں سیرا مورینا
کی جانب کھلتی ہیں۔ انہی میں سے ایک کھڑکی کے سامنے کھڑی معتمد کی ملکہ رمیکیہ کی حسین آنکھیں
اس کالے پہاڑ کی بدصُورتی پر بھر آئیں اور اُس نے کواڑ بند کرتے ہوئے کہا "معتمد!
موسمِ بہار میں قصرِ اشبیلیہ کی محرابوں میں سے مجھے سفید برف پوش وادیاں نظر آتی تھیں،
اور قرطبہ میں یہ بدصورت اور کالا پہاڑ میری نظروں کے سامنے آتا ہے۔"
معتمد نے پورے سلسلہ سیرا مورینا پر باداموں کے درخت لگوا دیئے اور اگلے موسمِ بہار یہ کالا پہاڑ بادام کے شگوفوں
سے ایسے ڈھک گیا جیسے ابھی ابھی برفباری ہوئی ہو۔ صنفِ نازک ہمیشہ سے اس پہاڑ کی
سیاہی سے خوفزدہ رہی ہے۔ الناصر نے اپنا بے مثال محل مدینۃ الزہرا اسی پہاڑ کے دامن
میں تعمیر کیا تھا۔ صدر دروازے کے باہر سنگِ مرمر سے تراشیدہ زاہرا کا مجسمہ نصب کیا گیا۔
زاہرا نے ایک نظر سفید مجسمے کے عقب میں پھیلے ہوئے سیاہ سلسلۂ کوہ پر ڈالی اور دُکھ سے کہا۔
"الناصر! تم دیکھ رہے ہو کہ ایک خوبصورت چہرے کو ایک حبشی نے آغوش میں لے رکھا ہے"
ایک بڑا میکسیکن ہیٹ اوڑھے۔ چُست جین اور آتشی سُرخ بلاؤز میں بمشکل لپٹی۔
بلاؤز کے اُوپر والے دو بٹن ارادتاً نہیں، قوتِ جسمانی سے مجبور اُکھلے۔ بقیہ کسی منہ زور گھوڑے
کے نتھنوں میں پھنسی باگوں کی طرح تنے ہوئے آمادۂ علیحدگی۔ ایک لڑکی گیلری کی دوسری
جانب سے آہستہ آہستہ لے دھیانی میں چلتی ہوئی آئی۔ اس نے ہیٹ کا زاویہ درست

گیا اور مینار کے قدموں میں بچھے شہر کی فلم بنانے میں محو ہو گئی۔ کیمرے کی آنکھ میں آنکھ ڈالے ایڑ کے بل بے حد احتیاط سے حرکت کرتی ہوئی، لینز کو قرطبہ کی چھتوں پر سے سرکاتی دیوارِ مسجد آئی۔ پھر صحنِ مسجد کو سمیٹا اور اس کے بعد لینز کا دہانہ مجھ پر کھل گیا۔ اس کی ایک آنکھ کے ساتھ ہی چپکی رہی مگر دوسری چپاک سے کھل گئی۔

"اوہ" اس نے گڑبڑا کر کیمرہ نیچے کر لیا۔

میکسیکو ہیٹ کے سائے میں کالی بھور آنکھیں حیرت زدہ کھلی ہوئیں۔ لب نیم وا ابھی "اوہ" کی حالت میں۔ رنگ بیشتر یورپی لڑکیوں کی طرح کچی لسّی ایسا کچا سفید نہیں بلکہ گاڑھے دودھ جیسا۔ اور عقب میں سیرا مورینا کی سیاہ چوٹیاں۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک خوبصورت چہرے کو ایک حبشی نے آغوش میں رکھا ہے۔"

"سوری" "لب" "اوہ" کی گولائیوں سے عاری ہو کر بھنچ گئے۔ اس نے ایک کلا... کے انداز میں گردن جھٹک کر چہرہ آگے کیا۔ آنکھیں میچ کر مجھے انتہائی غور سے دیکھا جیسے پہچا... کی کوشش کر رہی ہو اور پھر کیمرہ کیس میں اڑس کر سیڑھیوں سے نیچے اتر گئی۔ میں نے ا... کا ایک گہرا سانس لیا اور اپنے اوپر سایہ فگن سینٹ رافیل کے مجسّمے کی جانب نہایت عقید... نظروں سے دیکھا جس نے فی الحال مجھے رسوا ہونے سے بچا لیا تھا۔ یقیناً وہی نیم کریک... تھیں جو اس شب پن چکّی کی تہہ میں مراقبے میں بیٹھی ہوئی تھیں اور میرے ہاتھوں تر... ہونے سے بال بال بچی تھیں۔ میں نے شکرانے کے طور پر مہربان پیر رافیل کی ایک تصو... اور ایک محفوظ حفاظتی وقفے کے بعد نیچے اتر آیا۔

میں ایک سیاہ ستون کے ساتھ ٹیک لگائے مسجد کے اس حصے میں بیٹھا تھا جو المنصو... تعمیر کردہ ہے۔ آخرِ شب جنگلوں میں اترنے والی گہری دھند کی طرح سینکڑوں ستو... کے گرد تاریکی بال کھولے سو رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں استنبول کے زیرِ زمیں آ... میں کسی ساکت کشتی پر حُسن زدہ بیٹھا ہوں۔ صرف ستون پانی کی بجائے تاریکی میں ڈوبے ... ہیں اور ذخیرۂ آب پر چھت سے مسلسل ٹپکنے والے پانی کے جلترنگ کی بجائے کبھی کبھا...

کی آواز خاموشی کو توڑتی ہے۔ میرے قریب دو ہسپانوی مزدور جن کی آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو چکی تھیں کُدالوں کی مدد سے ایک ستون کے گرد کھدائی کر رہے تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وادیٔ الکبیر کی نمی ستونوں کی بنیادوں پر اثر انداز ہوتی رہتی ہے۔ اِس ستون کی بنیاد بھی آہستہ آہستہ بیٹھ رہی تھی۔ اس لئے اسے اُکھاڑ کر دوبارہ ایستادہ کیا جائے گا۔ المنصور کا تعمیر کردہ مسجد کا یہ گوشہ صدر دروازے سے دُوری کی بنا پر بے حد پُرسکون رہتا ہے۔ سیاح عبدالرحمٰن الداخل کے حصّے اور محراب کی تصاویر اُتار کر کلیسا کے پیٹ میں اُتر جانے اور یُوں کلیسا کے پچھواڑے میں المنصور کے ستون اُن کے بے ہنگم قہقہوں اور فلیش کی ننگی ہنڈوں کی بوچھاڑ سے محفوظ رہتے ہیں۔ اور اگر کوئی تجسس ظاہر بھی کرے تو گائیڈ اُسے یہ بتا دیتا ہے کہ المنصور کا حصّہ عیسائی غلاموں کے ہاتھوں تعمیر ہوا تھا جن کی رُوحیں ابھی تک اس کی تاریکیوں میں منڈلاتی ہیں۔

پچھلے سات روز کی مسلسل آوارہ گردی کے بعد اب قرطبہ کے گلی کُوچے میرے لیے ایک نقشہ تھے۔ باب المنصور میرے لئے موچی دروازہ تھا۔ پلازا ہوسے انتو بیو چوک نواب صاحب در کاسے فلورس ... کالے کا میڈ اس، المنصور۔ رومیرو، کو ریلا کو مُلّاں والی گلی۔ کوچہ جوگیاں، کُوچہ نقارچیاں، کوچہ چابک سواراں وغیرہ کہہ لیجیے۔ قرطبہ کی دو گلیاں تو ایسی ہیں جہاں کھڑے ہو کر آپ بجا طور پر "لہور، لہور اے!" نعرہ بلند کر سکتے ہیں یعنی پرانی انارکلی اور کوچہ... اقبال اور کالیہ لاہور! آمد کے پہلے روز جب گاڑی کی رفتار قرطبہ کے نواح میں پہنچ کر بتدریج کم ہونے لگی تو ایک جانب کھجوروں کا ایک وسیع جھنڈ نظر آیا۔ چاہت وطن کی باطنی حس کچھ یوں بیدار ہوئی کہ جیسے یہ تو مقبرۂ جہانگیر کے پہلو میں کھجوروں کا جھنڈ نظر آیا ہے۔ گاڑی بتدریج آہستہ ہو کر راوی کے پل پر سے گذرے گی۔ دریا میں رواں کشتیوں میں سے ہاتھ بلند ہوں گے اور پھر دس ماہ بعد لاہور سٹیشن کا شور مجھے گھر واپسی پر خوش آمدید کہے گا۔ شائد اسی نفسیاتی اطمینان کی بنا پر قرطبہ سے رختِ سفر باندھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ سفر تو مکمل ہو چکا ہے۔ میں گھر واپس آ گیا ہوں .... پھر مجھے اشبیلیہ اور غرناطہ کا خیال آیا۔ غرناطہ سے برِّاعظم افریقہ کتنا دُور ہو گا..... سو ڈیڑھ سو میل۔ اور ابھی مجھے یہ شہر دیکھ کر ہسپانیہ کے طویل مشرقی ساحل کے ساتھ ساتھ فرانس واپس جانا تھا۔ پھر

سوئٹزرلینڈ، آسٹریا، یوگوسلاویہ...... میں اس خیال سے یکدم دہشت زدہ ہو گیا کہ جس ستون کے ساتھ میں ٹیک لگائے اطمینان سے بیٹھا ہوں اس کے اور میرے گھر کے درمیان ابھی نصف دنیا کی اجنبیت حائل ہے جسے عبور کرنے سے ہی میرے کھجوروں کے جھنڈ نظر آئیں گے۔ اس وقت میں اُن سے بہت دُور ہوں۔ ایسے بے چین لمحے سیاح کے لئے ایک عذاب سے کم نہیں ہوتے وہ ان موقعوں پر بلندی پر تنے رسّے پر کرتب دکھانے والے کی طرح ہوتا ہے جو نہ چاہتے ہوئے بھی نظریں جھکا کر پیتیوں کی جانب دیکھتا ہے اور اس کے پاؤں ڈگمگانے لگتے ہیں۔ اس عذاب سے بچنے کی ایک ہی صورت ہوتی ہے۔ حرکت! چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ دوسرے روز سیرا مورینا کے دامن میں بکھرے مدینۃ الزہرا کے کھنڈرات دیکھ کر اسی شب اشبیلیہ کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔

تیز دودھیا روشنی کا ایک گولا سا چھوٹا اور سینکڑوں ستون تاریکی میں سے نکل کر ایک لمحے کے لیے ظاہر ہوئے اور فوراً دھندلا گئے۔ فلیش کی روشنی کے پیچھے میکسیکن ہیٹ کیمرے میں آنکھ جمائے بڑی تندہی سے تصویریں اُتار رہا تھا۔

"ہیلو!" میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے زور سے کہا۔

"ہیلو۔ ہیلو" پوری عمارت گونجنے لگی۔

کیمرہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آنکھ سے ہٹا اور اس نے انتہائی سراسیمگی کے عالم میں ادھر اُدھر دیکھا۔ تو یہ میکسیکن ہیٹ! میں نے اس کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اندھیرے میں ایک اور تیر پھینکا۔ اِس وار سے اس نے سمت کا تعین کر لیا اور ستونوں کو ٹٹولتی میرے پاس چلی آئی۔

"کون ہے؟" اُس نے آنکھیں میچ کر پوچھا۔

"میں کبھی لاجواب نہیں ہوا۔ مگر اس شخص کے سامنے جس نے مجھ سے پوچھا تو کون ہے؟"

"واللہ" اس نے خالص عربی لہجے میں کہا۔ حالانکہ مجھے اس کے انگریزی تلفظ سے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ امریکی ہے۔

"واللہ کیا؟"

"یہ تو خلیل جبران ہے" اس نے میرے پاس بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"نہیں میں تو...... میرا مطلب ہے کون خلیل جبران ہے؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"میں کبھی لاجواب نہیں ہوا۔ مگر......" اُس نے میرا پورا فقرہ دُہراتے ہوئے کہا "یہ خلیل ان نے ہی تو کہا تھا"

تجربے کی رُو سے اگر کوئی لڑکی رُوکھے سُوکھے ہیلو کے جواب میں مسکرا دے یا صرف جواب آں ہی دے دے تو شاخِ اُمید سرسبز ہونے کی قوی اُمید ہوتی ہے لیکن اگر ایک لڑکی ہیلو کے اب میں "واللہ" کہہ کر خلیل جبران کا تذکرہ چھیڑ دے تو کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ اِس کے بارے میں لاعلم تھا۔ ویسے تھوڑا بہت قصور میرا بھی تھا کہ خلیل جبران کی مکمل تخلیقات حال ہی نظر سے گذری تھیں۔ بہرحال بات چل نکلی تھی۔

"آپ امریکی ہیں؟" میں نے واللہ کی ادائیگی کے باوجود پُر اعتماد لہجے میں ایک ایسا سوال پوچھا جس کا جواب ماضی کے تجربے کی بناء پر بہرصورت "تمہیں معلوم ہو گیا؟" آنا چاہیئے تھا۔

"اوہ تمہیں کیسے معلوم ہو گیا؟"

"انگریز شائد؟"

"نہیں" اُس نے خاموشی سے سر جھٹکا۔

"تو پھر......" میں نے تنگ آ کر پوچھا۔

"لیبیاں" اس کی ہچکی ہنسی ستونوں سے ٹکرائی۔

"لِی...... ہاں!" یا وحشت یہ کون سا ملک ہے۔

"لیبیاں یعنی لبنان...... میں لبنانی ہوں"

"واللہ" میرا لہجہ اگرچہ اتنا عربی تو نہ تھا مگر والہانہ ضرور تھا۔

"واللہ؟" اس نے قریب ہو کر دریافت کیا اور پھر فوراً پیچھے ہٹ گئی "ایک شب میں وادی الکبیر کی ایک پن چکی کی کھڑکی میں بیٹھی رُومی پُل کا سکیچ بنا رہی تھی اور......"

میں نے بے چارگی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ سینٹ رافیل تو باہر مینار پہ دُھوپ سینک رہا ہے۔ اب کون بچائے گا۔

"مَیں بے حد شرمندہ ہوں" مَیں نے اُنگلی سے گردن کھُجاتے ہوئے انتہائی اِنکساری سے معذرت شروع کی "واللہ مجھے قطعی طور پر علم نہ تھا کہ آپ شام ڈھلے پن چکی کی تہ میں بیٹھی سکیچ وغیرہ بنا رہی ہیں اور نہ میں یہ جانتا تھا کہ دیوار اتنی مخدوش حالت میں ہے کہ ہاتھ لگاتے ہی اس میں سے پتھر کھسکنے لگیں گے اور پھر...... آپ ایک عرب ملک سے آئی ہیں اور مسلمان ہونے کے ناتے سے......"

"نہیں نہیں!" اس نے اپنا ہیٹ جھٹکتے ہوئے میرے جذباتِ اسلامیہ کا ستیاناس کر دیا "میں تو عیسائی ہوں...... کیتھولک عیسائی۔"

میری جگہ اگر خلیل جبران ہوتا تو وہ صرف "کون ہے؟" کے سوال پر ہی لاجواب نہ ہوتا مجھے اور کچھ نہ سُوجھا تو انگلیوں کو دبا کر پٹاخے بجانے شروع کر دیئے، اور کیا کرتا؟ تھوڑی دیر بعد یہ سلسلہ بھی منقطع کرنا پڑا۔ ایک تو آواز بہت گونجتی تھی اور دوسرے ہر "پٹاخ" پر میکسیکن ہیٹ یوں سرجھٹکتی جیسے میں نے طبلے پر تھاپ لگا دی ہو۔

"واللہ میں نے آج تک ایسا تماشہ نہیں دیکھا" اس نے بے حد محظوظ ہوتے ہوئے داد دی۔ اور پھر قریب کھسک کر بولی "بینار کی چوٹی پر بھی مجھے آپ کی شکل مانوس سی لگی تھی، مگر ٹھیک طرح سے پہچان نہ سکی...... دراصل آج اپنی علینک ہوٹل میں ہی بھول آئی ہوں، اس لئے......"

تو یہ سینٹ رافیل کا کارنامہ نہ تھا کوتاہ نظری کا کرشمہ تھا۔

"میں تہ دل سے معذرت خواہ ہوں......" میں نے بے دھیانی میں سگرٹ نکال کر سُلگا لیا۔

"واللہ" وہ دونوں ہتھیلیاں میرے آگے پھیلا کر بڑے رنج سے بولی "مسجد میں سگرٹ نہیں پیتے۔"

"سوری" مَیں نے فوراً جلتا ہُوا سگرٹ پیکٹ میں رکھ کر دم بخت کر دیا۔ مجھے خیال ہی نہ رہا تھا۔

"خیر کوئی بات نہیں...... لیکن آپ اس ویران گوشے میں بیٹھے کیا کر رہے ہیں؟... مسجد

خوبصورت ترین حصہ تو......"

میں نے ستون کے گرد کھدائی کرنے والے مزدوروں کی جانب دیکھا اور آہستہ سے بولا "یہ مسجد ہمارے آباؤاجداد نے بنوائی تھی۔ پھر آپ لوگوں نے چھین لی۔ اتفاقاً قرطبہ سے گذر ہوا تو سوچا ایک دھ ستون بطورِ نشانی ساتھ لیتا چلوں۔ ان مزدوروں کو اسی کام پر لگایا ہوا ہے۔"

"اوہ! کیسا عجیب خیال......" اس نے قریبی ستون کا سہارا لیتے ہوئے بناوٹی بے یقینی کے عالم آنکھیں میچ کر مزدوروں کی جانب دیکھا جو اب بنیادوں میں سے کھودی گئی مٹی کے ڈھیر پر بیٹھے سگرٹ کے کش لگا رہے تھے اور پھر چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی طاری کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بہرحال تم مقدس کام کی نگرانی کرو........ مجھے ابھی کلیسا کی تصاویر بھی اتارنا ہیں۔ خدا حافظ!" اس نے ہیٹ سر پر جما کر اسے منہ لپورتے بچے کو سلانے کے انداز میں آہستہ آہستہ تھپکا اور اونچی ایڑیوں کی جوتی کھٹکھٹاتی چل دی۔ لڑکی اکیلی ہے سیاح ہے اور سکیچ وغیرہ بھی بناتی ہے۔ رومانی ممکنات کی روشن نشانیاں دیں اُٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔

"ہیلو......دیکھئے مس......آپ نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔"

"نازلا سعد......" اس نے رکے بغیر جلدی سے کہا۔

"تو مس نازلا سعد......"

"ڈاکٹر نازلا سعد" اُس نے فوراً تصحیح کی۔

"ڈاکٹر......یعنی باقاعدہ...... لیڈی ڈاکٹر" مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ایسی تروتازہ اور خوش شکل قسم کی لڑکی کانوں میں سٹیتھوسکوپ اڑس کر کسی کلینک میں بیٹھتی ہو گی۔

"نہیں" وہ اپنے پسندیدہ لفظ کا استعمال جاری رکھتے ہوئے ہنس دی "میں نے بیالوجی میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے۔ ان دنوں فاناببا رٹر یز لبنان میں تحقیقاتی کام پر مامور ہوں۔"

اس علمی بوجھ تلے میرا منہ کتّا پھول کی طرح کھل گیا اور میں ہونقوں کی طرح خاموش کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔

"آپ شائد مجھ سے کچھ کہنا چاہتے تھے؟" قدرے توقف کے بعد اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"جی ہاں ڈاکٹر صاحبہ......" میں نے باقاعدہ مرعوب ہو کر جواب دیا "دراصل آپ کو

تصویریں اتارتے دیکھ کر خیال آگیا کہ ابھی تک درونِ مسجد میری اپنی کوئی تصویر نہیں اُتری۔....

"پھر؟"

"پھر اگر آپ لگے ہاتھوں میرے کیمرے سے میری دو چار تصاویر کھینچ دیں تو مَیں انتہائی شکر گذار رہوں گا۔" ماضی کے تجربے کی بنا پر یہ معصوم مگر دُور رس نتائج کی حامل ایسی درخواست تھی جس کا جواب انکار میں ممکن ہی نہ تھا۔

اس نے جواب میں صرف اپنے ہیٹ کو ایک بار تھپکا اور خاموش کھڑی رہی۔

"یقین کیجئے میں واقعی شکر گذار رہوں" میں نے کیمرہ گلے سے اُتار کر آگے کر دیا" اب مَیں اپنی تصاویر خود تو اُتارنے سے رہا۔"

"میں عینک کے بغیر بھی دیکھ سکتی ہوں کہ آپ کا کیمرہ اشاٹ میٹکس ہے اور اس میں خودکا بٹن موجود ہے اس لئے آپ بالکل اپنی تصاویر اُتار سکتے ہیں۔"

میں نے ہراساں ہوکر فوراً کیمرہ واپس کندھے پر لٹکا لیا۔

"یہ تصویر اتارنے کی درخواست تو محض میرے ساتھ فلرٹ کرنے کا بہانہ ہے۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ آپ میری رفاقت کے خواہش مند ہیں۔" اس نے کسی مڈل سکول استانی کی طرح مجھے جھاڑ پلائی۔" بھلا اِدھر اُدھر ہانکنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک بالغ انسان کو ان معاملوں میں صاف گو ہونا چاہیئے۔"

اِدھر اُدھر صرف ستون ہی ستون تھے کھمبے مفقود تھے ورنہ میں محاورے کی پیروی کرتے ہوئے انھیں ضرور نوچتا۔ ڈاکٹر صاحبہ کی تشخیص سو فیصد درست تھی۔ ایک طویل اور ناگوار وقفہ جو میں نے چھت کے منقش شہتیروں کو گھورنے میں گذارا۔ میں یوں پتھرایا ہوا کھڑا رہا کہ اُس بے حسی کے دوران اگر کوئی سیاح مسجد کے ستونوں کو شمار کرنے کا تردد کرتا تو کل تعداد میں ایک کا اضافہ اُسے یقیناً حیرت زدہ کر دیتا۔

"شائد میں نے آپ کو غلط سمجھا ہے۔" مَیں نے چھت سے نظریں ہٹا کر سامنے دیکھا میرے چہرے پر اپنے کلمۂ حق کا شدید اثر دیکھ کر شائد اُسے اپنے رویّے پر افسوس ہو رہا تھا" ہاں! یقیناً مَیں نے آپ کو غلط سمجھا ہے۔" وہ دھیمے لہجے میں کہہ رہی تھی۔" آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔"

خود کار طریقے سے واقعی تصویر کا زاویہ درست نہیں بنتا۔"

میں آج بھی جب نائرلا سعد کی کھینچی ہوئی اُن تصاویر کو دیکھتا ہوں تو مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میرے چہرے کی کھلی کتاب پر صرف ناگواری اور ندامت کے حروف لکھے ہیں۔ کہیں میں ستون سے ٹیک لگائے ایک رُوٹھے ہوئے بچے کی طرح کھڑا ہوں۔ کسی محراب کے سامنے مڈل سکول کی استانی سے ڈانٹ پڑنے کے بعد منہ بسورتا ہوا۔ چیپل کی سلاخوں کو ایسے تھامے جیسے عمر قید بھگتنے والا کوئی قیدی بال بچوں کے لیے جیل میں تصویر کھنچوا رہا ہے۔ البتہ تمام زاویے بالکل درست ہیں۔

"میں مسجد کے درمیان تعمیر کردہ کلیسا کی زیارت کے لئے جا رہی ہوں"۔ وہ تصویریں اتارنے کے بعد کیمرہ واپس کرتے ہوئے ہنس دی "پلیز میرے ساتھ آؤ" اِس صورتِ حال سے واپسی ناممکن تھی اس لیئے میں چپکے سے ساتھ ہو لیا۔

اگرچہ میں پچھلے چھ روز سے بلاناغہ مسجد میں آ رہا تھا۔ مگر جب کبھی ستونوں کے اس جنگل میں ایستادہ کلیسا کی دیوار میرے راستے میں حائل ہوتی میں کترا کر کسی اور حصے کی طرف چلا جاتا اور یُوں میں ابھی تک اس متنازعہ فیہ کلیسا کو اندر سے نہیں دیکھ سکا تھا۔ مسجد قرطبہ کے اندر قدم رکھتے ہی ایک غیر متوقع خوبصورتی کے جنگل میں کھو جانے کا احساس ہوتا ہے اور کلیسا کے اندر داخل ہوتے ہی اس کی بے پناہ وسعت، بُلندی اور پیچیدہ نقاشی آپ کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ مذہبی مجسموں اور تصاویر کی اتنی بہتات ہے کہ ان سے درجنوں چھوٹے موٹے کلیساؤں کو بخوبی سجایا جا سکتا ہے۔ محرابی چھت اور در و دیوار مکمل طور پر نقش و نگار سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ عیسائی معماروں نے مسجد کی بے پناہ خوبصورتی سے مرعوب ہو کر اس عظیم کلیسا کو ضرورت سے زیادہ ہی سجا دیا ہے اور یوں اس پر ایک شاہکار کلیسا کی بجائے ایک شاہکار سٹور کا گمان ہوتا ہے۔ اس کا کلی تاثر اس عورت سے مشابہ ہے جس کا قدرتی حسن بھی میک اپ کی دبیز تہوں تلے دب گیا ہے۔ نائرلا سعد کاٹر کی ایک کرسی پر بیٹھی اپنے میکسکن ہیٹ کو دونوں ہاتھوں سے تھامے آنکھیں بھینچ کر منقش چھت کا مطالعہ کر رہی تھی جو بلندی میں روم کے کلیسا سینٹ پیٹرز سے دُوسرے درجے پر ہے۔

"فنِ تعمیر کے نقطۂ نظر سے تمہارا اِس کلیسا کے بارے میں کیا خیال ہے؟" اُس نے

بے دھیانی سے مجھ سے سوال کیا۔

"اتنی خوبصورت مسجد کے درمیان یہ کلیسا....."

"یہ صرف مسلمانوں کا نقطۂ نظر ہے......" وہ انتہائی ترشی سے بولی۔

" رشنر مسلمان نہیں مگر وہ اِسے ایک عظیم بدصورتی کہتا ہے۔ ہٹن نے اِسے قحبہ....."

"یہ پروٹسٹنٹ ......" وہ ایک دم پھٹ پڑی اور دونوں ہاتھ ہوا میں لہرا کر تیزی سے کہنے لگی "یہ تمام پروٹسٹنٹ...... ہیں۔ یورپ کے پروٹسٹنٹ تاریخ دان مسلمانوں کے ہسپانوی دور کی بے جا تعریفیں صرف اور صرف کیتھولک ہسپانیہ کو بے عزت کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ یہ سراسر مذہبی رقابت ہے...... ہسپانویوں کی بے تحاشا خود پسندی اور بدنظمی کی جانب رجحان بھی تو مسلمانوں کا عطیہ ہے۔ جہاں چھ سات ہسپانوی اکٹھے ہوں گے قبائلی تعصّب کی ذہنیت اُبھر آئے گی اور وہ تین چار سیاسی جماعتیں بنا کر ایک دوسرے کو تباہ کرنے پر تُل جائیں گے۔ بے جا تکبّر۔ عورتوں کو گھروں میں قید رکھنا۔ سونے کی ہوس، یہ عادات انھوں نے مسلمانوں سے ہی مستعار لی ہیں......"

"کیا یہ نقطۂ نظر سراسر فنِ تعمیر سے متعلق تھا ؟" میں نے متانت سے پوچھا۔

"اوہ ....." وہ یوں جھٹکے سے رُکی جیسے کسی تیز رفتار گاڑی کی زنجیر کھینچ گئی ہو "مجھے افسوس ہے کہ میں جذبات کی رو میں بہت کچھ کہہ گئی...... میں خود عرب ہوں اور ہسپانیہ کا مُورش عہد میرے ثقافتی ورثے میں بھی شامل ہے...... شاید تم پاکستانی مسلمانوں سے کہیں زیادہ۔ اگرچہ جب رومان پسند ارونگ اور پروٹسٹنٹ تاریخ دان مذہبی رقابت کی بنیاد پر کیتھولک ہسپانیہ کو مطعون کرتے ہیں تو مجھے دُکھ ہوتا ہے...... میں جانتی ہوں کہ مسجد کے درمیان اس گرجا کا فنِ تعمیر غیر فطرتی نظر آتا ہے مگر اسے قحبہ خانہ کہہ دینا بھی تو پست ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ دو تہذیبوں کے فنِ تعمیر کے درمیان خوبصورت موازنہ ہے...... قرطبہ میں چار ہزار دو سو مساجد تھیں...... سب کی سب تباہ ہو چکیں۔ سوائے مسجد قرطبہ کے...... صرف اس لئے کہ اس کے درمیان ایک کلیسا کھڑا تھا...... دیکھا جائے تو اس مسجد کی سلامتی کلیسا کے وجود کی مرہونِ منّت ہے......"

میں نے اُسے یاد دلایا کہ کارلوس پنجم نے ہی پادریوں کو یہ کلیسا تعمیر کرنے کی اجازت دی تھی۔ وہ ہسپانوی تھا اور کٹّر کیتھولک بھی۔ کلیسا کو دیکھ کر جن الفاظ میں اس نے تاسف کا اظہار کیا تھا اسے وہ تاریخ میں
ہم کلیسا سے باہر آئے تو ستونوں کا خوابیدہ جنگل ہمارے قدموں کی چاپ سے گونج اُٹھتا۔ صدر دروازہ بند ہو چکا تھا اور ہم دونوں تاریک عمارت میں کھڑے تھے مسجد اور کلیسا کی طرح پہلو بہ پہلو مگر جذباتی اعتبار سے مخالف سمتوں میں۔۔۔ اس بے کراں خاموشی میں فرش سے پھوٹتے ہوئے سینکڑوں ستونوں کے نازک حسن نے مجھے دم بخود کر دیا۔ ناتژلاسعد کی بھڑکتی ہوئی جذباتیت بھی خنک سنگِ مرمر کی خوبصورتی سے بجھنے لگی اور وہ ایک ستون کی چمکدار سطح کو چھوتے ہوئے ہولے سے بولی "یہ مسجد یقیناً اس عظیم۔۔۔۔۔کلیسا سے بہتر ہے جہاں لاکھ چاہنے کے باوجود میں کوئی ایسا گوشہ تلاش نہیں کر پائی جسے دیکھ کر بے اختیار میرا جی چاہا ہو کہ میں اس کی تصویریں اُتار لوں۔۔۔۔۔اور یہاں ۔۔۔۔۔" اُس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اور "اوہ" کی حالت میں خمیدہ اپنے ہونٹوں پر ہتھیلی جما دی۔

میں نے مسجد کے بند پھاٹک پر ہولے سے دستک دی۔ قدرے توقف کے بعد آہنی کنڈے کے سرکنے کی آواز آئی اور محافظ نے اندر جھانکا۔ ہم دونوں کو وہاں اکیلا دیکھ کر اس کے لبوں پر "میں سب سمجھتا ہوں" کی مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے کواڑ کھول دیے۔ روشنی اور سایوں کے صحن میں بھی خاموشی تھی۔ باب التوبہ کھلا تھا۔ ہم باہر گلی میں آ گئے۔ میں نے ناتژلاسعد کو اُس کی مذہبی گفتگو کے حوالے سے پہچاننے کی کوشش کی تو اس کے میکسیکن ہیٹ نے بلند ہو کر مخروطی وضع اختیار کر لی۔ گلابی بلاؤز اور جین لٹک کر سیاہ چوغے میں بدل گئے۔ اِنکوزیشن کا ایک ایسا پادری جو بے جا تعصب سے ہی اپنے مذہب کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔

"مجھے آج رات قرطبہ چھوڑ جانا ہے" اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "میں نے ابھی تک القصر نہیں دیکھا۔"

اِنکوزیشن کے ایک پادری کے ساتھ مزید رفاقت میرے بس کی بات نہ تھی۔ میں نے

نمائشی مسکراہٹ کا سہارا لے کر اجازت چاہی "ڈاکٹر ناژلا سعد آپ کی رفاقت اور لیکچر کے لیے بے حد شکر گذار ہوں...... خدا حافظ!"

پادری کے ہونٹ "اوہ" کہنے کے لئے وا ہوئے اور پھڑپھڑا کر بند ہو گئے۔

"اے ہیلو!"

میں سپیدیس گلی میں مڑنے کو تھا کہ وہ میرے پیچھے پیچھے چلی آئی "تم نے اپنا تعارف تو کروایا ہی نہیں..... چونکہ میں ان معاملوں میں صاف گو ہوں' اس لئے تم سے یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ یلینبر مسجد کی دیوار کے ساتھ میری ایک تصویر اتار دو۔"

"اور کیا کہو گی؟"

"یہی کہ میں تمہاری رفاقت کی خواہشمند ہوں" اُس نے مسکرا کر میرا بازو تھام لیا اور اس لمس سے انکوزیشن کا پادری یک دم لبنان کے دیودار کے درختوں اور پہاڑی چشموں ایسی ایک لڑکی میں بدل گیا جو کہ ناژلا سعد تھی۔

القصر بند تھا مگر وہ کھڑکیاں ہنوز کھلی تھیں جن کے کواڑ گئے زمانوں میں رمیکیہ اور زہرا کے حسین چہروں کو تصویر بناتے تھے۔ الحکم اوّل کے عہد میں وادی الکبیر کے دوسرے کنارے پر واقع شققندہ کے باسیوں نے بغاوت کر دی اور مُسلّح ہو کر القصر کے سامنے میدان میں جمع ہو گئے۔ الحکم نے کھڑکی کھول کر حالات کا جائزہ لیا اور پھر آئینے کے سامنے بیٹھ کر نہایت اطمینان سے اپنے بالوں اور داڑھی پر عطر چھڑکنے میں مصروف ہو گیا۔ وزیر اعظم نے اس بے وقت سنگھار کا سبب پوچھا تو گرج کر بولا "بیوقوف شخص اگر باغیوں نے القصر میں گھس کر سب کو تہ تیغ کر دیا تو بعد میں لاشوں کے ڈھیر میں سے میری لاش کی شناخت کیسے ممکن ہو گی، ...... صرف میری عطر بیز داڑھی اور بالوں سے" بہر حال اس خوشبودار پوسٹ مارٹم کی نوبت نہ آئی۔ الحکم نے بغاوت پر قابو پا کر شققندہ کا پورا علاقہ جلا دیا اور تین سو باغیوں کو وادی الکبیر کے رُومی پل پر اُلٹا لٹکا کر مصلوب کر دیا۔

القصر کے قریب اُندلس کے عظیم شاعر اور وزیر اعظم ابنِ زیدون اور اس کی محبوبہ ولادہ کی خوبصورت یادگار ہے۔ ابنِ زیدون کے بارے میں کہاوت ہے کہ اس کے پاس دو وزارتیں تھیں۔ ایک قلم کی اور دوسری تلوار کی۔ خلیفہ المستکفی کی بیٹی ولادہ فنونِ لطیفہ کی

دلدادہ تھی اور اس کی شاہانہ حویلی میں ہمیشہ شاعروں اور موسیقاروں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ شامتِ اعمال ابن زیدون ولادہ کے عشق میں گرفتار رہا۔ اسی جرم میں سچ مچ گرفتار ہوا۔ جیل کاٹی۔ ملک بدر ہوا۔ بڑھاپے میں معتمد نے اپنے دربار میں جگہ دی۔ وہاں ابنِ عمار بھی موجود تھا۔ ایک دربار میں دو شاعر نہیں سما سکتے۔ ابنِ عمار کے حسد کی بنا پر پھر ملک بدر ہوا۔ یادگار ایک مکعب نما چار فٹ بلند چمکیلے پتھر کی شکل میں ہے۔ درمیان میں دو ہاتھ ایک دوسرے پر سایہ کیے ہوئے ہیں۔ پیشانی پر عربی میں مندرجہ ذیل عبارت کندہ ہے:۔

من مدنیہ قرطبہ والجامعات الاسلامیہ

ولادۃ - ابن زیدون

عرب ناڑلا کی موجودگی سُود مند ثابت ہوئی اور اُس نے فوراً ترجمہ کر دیا۔

"شہرِ قرطبہ اور اسلامی درسگاہوں کی جانب سے۔ ولادہ۔ ابن زیدون"

القصر کے سامنے اسلامی عہد کے کھنڈرات کی کھدائی ہو رہی تھی۔ میں نے مٹی کے ایک تودے پر کھڑے ہو کر نیچے جھانکا۔ کسی حمام کا کھنڈر تھا۔ چند مزدور بُرشوں کی مدد سے دیواروں سے مٹی پونچھ رہے تھے۔ ایک کونے میں چند شکستہ مٹکے دھرے تھے۔ قرطبہ کے حمام اپنے ہاں کے گرم حماموں سے قدرے مختلف ہُوا کرتے تھے۔ تانبے کے حوض۔ دیواروں پر چاندی کی ملمع کاری اور جانوروں کے مجسّمے۔ گارا، مہندی، صندل اور مسواک مفت!

"قصر الحمرا کے حمام ان سے بدرجہا دیدہ زیب اور کم گرد آلود ہیں" ناڑلا نے چہرے پر جمتی مٹّی کی تہ کو رُومال سے پونچھتے ہوئے بتایا۔

کھنڈروں کے قریب ایک گلی میں "کیفے آندلسیا" کا بورڈ لٹک رہا تھا۔ ہم کافی پینے کے لیے اندر چلے گئے۔ متعدد نیم تاریک راہداریوں میں سے گذر کر ایک پاتیو آیا۔ درمیان میں کھجور کا ایک درخت آکاس بیلوں میں لپٹا کھڑا تھا۔ دیواروں پر پھول دار گملے سجے تھے۔

"اور اب ہم کیا کریں!!!" اُس نے کیمرہ کیس میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ڈاکٹر ناڑلا سعد! میں بہت عرصے سے اپنے جسم کی ایک شدید ضرورت کے بارے میں کسی بیالوجسٹ سے فنّی مشورہ حاصل کرنا چاہتا تھا......"

"میں آؤٹ ڈور پریکٹس نہیں کرتی" وہ جھینپ کر بولی "اس کے لیے تمہیں لبنان آنا پڑیگا"

"اِن ڈور پریکٹس کے لیے کیا لبنان جانا ضروری ہے؟"

ناڑلا سعد نے منہ بنا کر بغور میری جانب دیکھا جیسے جاننا چاہتی ہو کہ یہ بیٹھے بٹھائے مجھے کیا ہو گیا ہے اور پھر میری نظروں کے زاویے کو چند بیالوجیکل خطوط پر مرکوز پا کر فوراً اپنے بلاؤز کے کھلے بٹن سانس سمیٹ کر بند کر لیے "واللہ" اس نے شکایت آمیز لہجے میں آہستہ سے کہا۔

میں نے موضوع بدلنے کے لیے اس کے تحقیقاتی کام کے بارے میں استفسار کیا۔

"مجھے فانالیبارٹری کی یاد مت دلاؤ......" وہ بیزار ہو کر بولی "میں سارا سال خوردبین پر جھکی خون کے جرثوموں کے عادات و خصائل کا مطالعہ کرتی رہتی ہوں اور بالآخر عینک کے باوجود یہ جرثومے دھندلانے لگتے ہیں۔ میری آنکھیں تھک جاتی ہیں، میرا جسم ٹوٹنے لگتا ہے، اور اپنے سفید کوٹ سے مجھے کفن کی بو آنے لگتی ہے۔ میں اُس دن کا انتظار کرنے لگتی ہوں جب مجھے سالانہ رخصت ملے گی اور میں اپنا مختصر رختِ سفر باندھ کر تین چار ہفتوں کے لئے ڈاکٹر کی بجائے صرف آوارہ گرد بن جاؤں گی۔ اس مرتبہ میں ہسپانیہ کی سیر پر نکلی تھی۔ بطورِ آوارہ گرد آج میری آخری شام ہے۔ کل شب میں ایک مرتبہ پھر اپنا سفید کوٹ پہن کر ڈاکٹر بن جاؤں گی کیونکہ کل دوپہر میں میڈرڈ سے واپس لبنان جا رہی ہوں......... میرا پیشہ اگرچہ بیالوجی ہے مگر میرا دل مصوری اور فنِ تعمیر کے خطوط میں اٹکا ہوا ہے......"

"یعنی یہ دل وغیرہ صرف مصوری اور فنِ تعمیر کے خطوط میں ہی اٹکا رہتا ہے۔ بس!"

"اوہ" اس نے حسبِ عادت مسکرا کر کہا اور پھر حسبِ مجبوری آنکھیں بھینچ کر بولی

"واللہ مستنصر باللہ تم عجیب و غریب شخصیت ہو!"

"مثلاً......" اب میں اپنی تعریف سننے کے خوشگوار فریضے سے سبکدوش ہو جانا چاہتا تھا۔

"مثلاً یہ کہ......تم ایک لڑکی کے ساتھ ایک مسجد میں بھی فلرٹ کرتے ہو اور دوسرے لمحے تمہارا چہرہ اس لیے لال بھبھوکا ہو جاتا ہے کہ وہ لڑکی مسلمانوں کے بارے میں چند ایسی باتیں کہہ دیتی ہے جو تمہیں بطورِ مسلمان ناگوار گذرتی ہیں۔"

"ڈاکٹر نازلا سعد"، میں نے سامنے کی کرسی پر دونوں پاؤں ٹکاتے ہوئے اطمینان سے وضاحت پیش کی" یاد رکھو کر تمہارے ہم مذہب اس مسجد کو کلیسا کہنے پر مُصر ہیں۔ یقین نہ آئے تو داخلے کے ٹکٹ پر پڑھ لو "مزکیتا کیتھڈرل۔ چنانچہ واللہ میں نے اگر کسی لڑکی کے ساتھ فلرٹ کیا ہے تو ایک کلیسا میں نہ کہ مسجد میں......"

"اس لحاظ سے میں گنہگار ٹھہرتی ہوں کہ میں نے کلیسا کے اندر ایک لڑکے سے راہ و رسم بڑھائی" وہ رنجیدہ ہو کر بولی۔

"تو پھر طے پا جائے کہ میں اُس وقت کلیسا میں تھا کہ تمہارے ہم مذہب یہی کہتے ہیں اور تم مسجد میں تھیں کہ ہم لوگوں کا یہی ایمان ہے۔ اس طرح ہم دونوں کے مذہبی عقیدے کو ٹھیس نہیں پہنچے گی"

"انسان اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے کیسے کیسے بہانے تراشتا ہے" نازلا نے اپنا کیمرہ کیس گلے میں ڈالا اور اُٹھ کھڑی ہوئی "اور ہاں مستنصر باللہ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ میں اس گرد آلود اور غیر نسوانی لباس میں رات گیارہ بجے تک تمہارا ساتھ دوں گی تو تم غلطی پر ہو"

"خیر اتنا غیر نسوانی لباس بھی نہیں "اُس کے بلاؤز کے بالائی بٹن بحالتِ شدید مجبوری پھر کھل چکے تھے۔

اُس کی اُنگلیاں تیزی کے ساتھ بلاؤز تک گئیں اور میرے بھٹکنے کا جواز پا کر فوراً مناسب سدِباب کر دیا " بہرحال اب میں ہوٹل جا کر شام کے لیے کوئی مناسب......لباس پہنوں گی اور پھر سامان پیک کر کے سٹیشن کے لگیج روم میں جمع کروانے کے بعد پورے ساڑھے سات بجے باب التوبہ کے سامنے پہنچ جاؤں گی......"

"یعنی کلیسا کے سامنے......"

"نہیں مسجد کے سامنے......"

اس نے میکسیکن ہیٹ کو تھپکا اور رپاتیو کے آہنی دروازے سے نکل کر باہر چلی گئی۔ میں بھی اپنا حلیہ قدرے بہتر بنانے کی غرض سے واپس کیمپنگ چلا گیا۔ تالاب میں ایک آدھ غوطہ

لگانے کے بعد کپڑے بدلے، حسن کے ہاں سے کافی پی اور شہر پہنچ کر پورے ساڑھے سات بجے باب التوبہ کے باہر پہرہ دینے لگا۔ سپیدس گلی کی سفید دیواروں پر نصب لیمپ ابھی روشن نہیں ہوئے تھے۔ باب التوبہ بند تھا۔ کوفی رسم الخط کی نقاشی کا حسن جوں کا توں قائم تھا مگر سینکڑوں برس بعد پیوند کی ہوئی فرشتوں کی شبیہیں ماند پڑ چکی تھیں۔ مغربی دیوار کے سامنے قرطبن مصنوعات کی دکانوں میں خوب رونق تھی۔ غیر ملکی سیّاح باہر نکلتے تو ان کے پاؤں میں قرطبن چمڑے کی سلیم شاہی جوتیاں ہوتیں۔ جیبوں میں مسجد کے شبیہہ دار بٹوے اور کندھوں پر شراب کے خالی مشکیزے۔

سپیدس کی خوشنما بالکونیوں کے سائے میں ایک لڑکی چلی آرہی تھی۔ ہسپانوی طرز کا بالوں کا جوڑا ایک فقیہہ کی دستار کی طرح پُر پیچ اور بلند مگر چہرہ اجتناب کی بجائے ترغیب کی تصویر۔ سبز لباس میں وہ یوں حرکت کرتی ہوئی آئی جیسے ہریاول کا ایک متناسب ٹکڑا کسی پانیوں سے کٹ کر میری جانب رواں ہو۔ چال دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ بیالوجی کی ڈاکٹریٹ اس نے نہیں اُس کے جسم نے کی ہے۔ میرے قریب پہنچ کر اُس نے ہینڈ بیگ میں سے عینک نکال کر پہن لی۔

"ٹھیک ہے" وہ بنظرِ غور میرا جائزہ لیتے ہُوئے بولی "بس یہ جاننا چاہتی تھی کہ تم کہیں صرف عینک کے بغیر ہی تو قبول صورت نہیں دکھائی دیتے؟"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ میرا یہ خدشہ درست ثابت ہُوا ہے۔" اس نے عینک اُتار کر بیگ میں رکھ لی۔

"ڈاکٹر نازلا سعدرات ابھی جوان ہے۔ واللہ تمھارے دیگر خدشات بھی درست ثابت ہوں گے۔"

"بُرائی مت سُنو" کانوں پر ہتھیلیاں پھیلا کر وہ ہنس دی۔

"مجھے افسوس ہے کہ تمھیں سامنے پا کر میں "بُرائی مت دیکھو" کے مقولے پر بھی عمل نہیں کر سکتا۔"

آج دوپہر بالاڈونکے دو بٹن بوفنت بیاو جیکل دیاؤ کُھل کر بینٹی دالو کا کام دے جاتے تھے مگر اس سبز لباس نے ناڑلا کو گردن تک ڈھانک رکھا تھا اور یوں اب اِن موقعوں پر اُس کے بند گلے کی ڈوری ایسے کھنچ جاتی جیسے لباس تلے دو آبی جانور کروٹیں بدل رہے ہوں۔ ناڑلا نے کندھوں پر ڈالی ہوئی سیاہ لیس کی چادر کا کونہ کھینچ کر ان کروٹوں پر پردہ ڈال دیا اور موضوع بدلنے کی خاطر لاتعلقی سے کہنے لگی "مجھے آئے ہوئے ایک عرصہ ہو چکا مگر تم نے ابھی تک میرے انتہائی خوشنما رنگ اور خوبصورت لباس کی تعریف انہی لفظوں میں نہیں کی۔"

"لباس تمہارے حسنِ حقیقی کو اپنے بوجھل پردوں میں چھپا کر نظروں سے اوجھل کر دیتا ہے۔"

"اوہ" ناڑلا کی اس "اوہ" میں ایک مشرقی لڑکی کی حیا کا پرتو تھا۔ "تم قدرے آزاد ہوئے جاتے ہو۔"

"لیکن یہ تو خلیل جبران ہے۔"

"واللہ" اس نے حیرت سے ہتھیلی منہ پر جما کر حلق کا پورا استعمال کیا "بالکل ہے۔"

ولائت کے مضافاتی قصبوں میں رواج ہے کہ ہفتے میں ایک شب "پب کرالنگ" یعنی شراب خانوں میں رینگنے کے کارِ خیر کے لیے مخصوص کر دی جاتی ہے۔ تر بہی دوست ہمراہ پسندیدہ خواتین کے مقامی اور گرد و نواح میں بکھرے شراب خانوں کا طواف کرتے ہیں۔ ناڑلا کے پاس "قرطبہ کے قدیم قہوہ خانے" نامی ایک سیاحتی کتابچہ تھا اور وہ آج شب ان قہوہ خانوں میں رینگنے کے موڈ میں تھی۔ وہ اپنا سامان پیک کر کے ریلوے سٹیشن پر چھوڑ آئی تھی اور اُسے بیڈرڈ جانے کے لیے بہرصورت دس بجے تک وہاں پہنچنا تھا۔ یوں دو تین گھنٹوں کے اندر اندر ہمیں قرطبہ کے درجن بھر قہوہ خانوں کو بھگتنا تھا۔

بسم اللہ "عبدالرحمٰن سوئم" سے ہوئی۔ اس قہوہ خانے میں گٹار بجانے والا ہسپانوی نوجوان ہمارے بیٹھتے ہی اپنی بلند کرسی سے اتر آیا اور آنکھوں کو نیم خوابیدہ بنا کر ناڑلا کی شان میں قصیدے لاپنے لگا۔ ناڑلا نے عینک لگا کر اُس کا معائنہ کیا اور فیصلہ دے دیا کہ وہ عینک کے ساتھ بھی خوش شکل دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ میں نے فوراً قہوہ خانے کی آرائش کے بارے میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور ہم باہر آ گئے۔ سامنے "بار آل کورڈوبا" تھی۔ لیس جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ شراب خانہ

قرطبہ کے مشہور زمانہ بل فائٹر ال کوردبس کے نام سے جانا جاتا ہے۔ در و دیوار پر ہر سو پریشان بالو والے اس نوجوان کا مغرور چہرہ بڑے بڑے پوسٹروں میں سے جھانکتا ہے۔ کاؤنٹر پر قرطبہ "ٹاپاس" یا مختصر خوراک کی ڈشیں سجی تھیں۔ وہیل مچھلی کے ٹکڑے۔ پرندوں کے اُبلے ہوئے بیرو بننے انڈے، کیکڑے کی ٹانگیں، جھینگے! ایک ڈش سرکے میں بھگوئے ہوئے سفید سفید تلوں پر مشتمل تھی۔

"یہ...... کیا چیز ہے؟" میں نے مالک سے استفسار کیا۔

اُس نے ہسپانوی میں جانے کیا الا بلا نام لیا۔

"سمندری مچھلی ہے" ناڑلا نے لقمہ دیا۔

میں نے ایک قتلا چکھا...... بے حد لذیذ سمندری مچھلی تھی چنانچہ پوری ڈش کا آرڈر دے بار میں آنے والے اکثر ہسپانوی اندر داخل ہوتے ہی "وینو خیریز" کی فرمائش کرتے یا نیلے گلاس کو سُرخ شراب سے لبریز کر کے کاؤنٹر پر رکھ دیتا اور پھر ہر مرتبہ ٹھنڈی سانس۔ کہتا "آہ! وہ دن جب عظیم ال کوردبس اسی طرح سامنے والے دروازے میں سے اندر داخل ہو ہی ہاتھ ہلا کر مجھے کہا کرتا تھا...... ارے او موٹے کچھوے وینو خیریز کا ایک گلاس"

شراب خانے میں بیٹھے ہسپانویوں کے سر فرط عقیدت سے یوں جھک جاتے جیسے کسی آسم صحیفے کے اُترنے کے انتظار میں ہوں۔ موٹا کچھوہ اُن شاموں کا ذکر کرتا جو اس وقت کا کمنا بل فائٹر اس شراب خانے میں گذارا کرتا تھا...... وہ اس کونے میں بیٹھتا تھا۔ اس کا گلاس کے شکیے پر بطور یادگار محفوظ ہے...... یہ داستانِ ال کوردبس یونہی جاری رہتی تاآنکہ دروا میں سے داخل ہونے والا کوئی اور ہسپانوی "وینو خیریز" کا نعرہ لگا دیتا۔

ناڑلا نے خیریز کے بارے میں ایک نہایت دلچسپ تاریخی حوالہ بیان کیا۔ کہتے ہیں: سے نقل مکانی کر کے ایک خاندان اُندلس میں آباد ہُوا۔ اور اپنے قصبے کا نام آبائی وطن کی یاد شیراز رکھا۔ اُن کا پیشہ انگوروں سے شراب کشید کرنا تھا۔ چنانچہ انھوں نے ایرانی انگوروں کی نئے شیراز میں کاشت کیں اور شیراز وائن کی کشید شروع کر دی۔ شیراز کا نام بگڑ کر خیریز ہو آج بھی یہ قصبہ ایرانی انگوروں کے باغات اور اُن سے کشید کردہ شراب کی نسبت سے ہسپانیہ۔

رہے۔

"سمندری مچھلی کا ذائقہ بالکل ابلے ہوئے انڈے کا سا تھا" اَل کردوبس سے باہر نکلتے ہوئے نے ناڑلا سے کہا۔

"آکٹوپس یقیناً بے حد لذیذ جانور ہے۔"

"آکٹو...... یعنی وہ اَن گنت ٹانگوں والا جانور...... میرے پیٹ میں یوں اُتھل پتھل ہو رہی تناول شدہ آکٹوپس کی ٹانگیں حرکت میں آ گئی ہوں۔

"ہاں وہی آکٹوپس......" ناڑلا نے لاپرواہی سے کہا اور پھر میری بسورتی ہوئی صورت دیکھ تحاشا ہنسنے لگی: "واللہ وہ بھی تو سمندری مچھلی کی ایک قسم ہوتی ہے نا...... وہ لطیفہ سنا ہے کہ ایک منے آکٹوپس نے اپنی ماں آکٹوپس سے پوچھا "اچھی امی آئندہ آپ کو تنگ نہیں کروں گا۔ میں تو ف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ان دو سو میں سے میری سو ٹانگیں کونسی ہیں اور بقیہ سو ہاتھ کونسے ہیں۔"

"چھوٹا سا لطیفہ......" میں ٹیڈی ٹونی کی یاد میں مسکرا دیا۔

"اگر یہ چھوٹا سا لطیفہ ہے نا...... تو پھر تم میں حسِ مزاح ہی مفقود ہے" ناڑلا تندرسے کر بولی۔

مسجد قرطبہ کے زیرِ سایہ خرابات "لاسزکیتا بار" یعنی شراب خانہ مسجد کے نام سے قائم ہے؟ پچھلے لے کی بنا پر میں نے یہاں سمندری خوراک سے مکمل پرہیز کیا گو ناڑلا صرف مجھے تنگ کرنے کی غرض سے ڈپس کے سفید قتلے تناول کرتی رہی اور میں منہ پر ہتھیلی جمائے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا مبادا پیٹ میں شدہ آکٹوپس کی ٹانگیں یا ہاتھ باہر نکلنے کا قصد کر بیٹھیں۔

کالیے آرساس کے اختتام پر ایک بلند محرابی دروازہ پلازا کوربدا میں کھلتا ہے۔ اس میدان نما وسیع چوک کے چاروں اطراف سہ منزلہ ن ہیں جن کی بوسیدگی میں غریب مزدور اور کسان مکین ہیں۔ دن کے وقت دھوپ میں سوکھتے ڑوں کی قطاریں دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے یہاں کے مکینوں نے سال بھر کے بعد آج پہلی مرتبہ ڑے دھوئے ہیں۔ پلازا چاروں طرف سے بند ہے۔ اندر داخل ہونے کے لیے صرف دو محرابی روازے ہیں۔ قدیم زمانوں میں جیب کتروں، اٹھائی گیروں اور بُل فائٹروں کا مسکن تھا۔ داخلے دروازے مقفل کر کے چوک میں بُل فائٹیں منعقد کی جاتیں اور تماشائیوں کی چلمنوں پر ہاتھ صاف

کئے جاتے۔ قہوہ خانوں میں داخل ہوتے ہی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم سروانتس کے زمانے کی کسی سرائے میں آنکلے ہوں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اب ان میں ڈان کوئکزاٹ ایسے کرداروں کی بجائے مقامی مزدور اور کسان ملتے ہیں جو ٹیلیویژن کے سامنے منہ کھولے ہسپانوی میں ترجمہ شدہ کاؤ بوائے فلمیں نہایت دلچسپی سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ ہم پلازا کو ریدا کے دوسرے دروازے سے باہر آئے تو دس بجنے کو تھے:

"اوہ" اس نے بیگ میں سے عینک نکال کر وقت دیکھا: "اب مجھے ہر صورت سٹیشن روانہ ہو جانا چاہیئے۔ میڈرڈ کی گاڑی پورے ساڑھے دس بجے نکل جاتی ہے۔"

دیوار میں نصب لیمپ کی ہلکی روشنی اس ساری گلی میں رینگتی تاریکی کو اپنے اندر سمونے میں ناکام نظر آرہی تھی۔ میں نے ایک آہنی دروازے کے پُرپیچ نقش و نگار میں سے اندر جھانکا۔ نیم تاریکی میں تیرتا پاتیو کا سرسبز جزیرہ۔ صرف فوارے کے پانیوں کی آواز تھی۔ مدھم مدھم۔ ناژلا دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

"اب اس میں میرا کیا قصور ہے کہ تم نے مجھ سے صرف اس روز بات کی ہے جس روز مجھے ہر صورت قرطبہ سے چلے جانا ہے...... بلکہ اس مختصر ملاقات کے تم ذمہ دار ہو...... اگر اُس شب پن چکی سے بزدلوں کی طرح بھاگ نہ جاتے تو ہم پچھلے چھ روز بھی اکٹھے گذار سکتے تھے۔"

میں بدستور گلیکے اندھیرے میں اُبھرتے گملوں اور بیلوں میں لپٹی محرابوں کو دیکھتا رہا۔

"میرے سامان کا کیا ہوگا جو ہر صورت ساڑھے دس بجے کی گاڑی کی بگج کوچ میں رکھ دیا جائے گا۔"؟

پاتیو کے آہنی دروازے میں ابھی تک سورج کی حدّت سنسنا رہی تھی۔

"والله مستنصر بالله" ناژلا نے میری خاموشی سے تنگ آکر انتہائی بے چارگی سے کہا "تم عجیب و غریب شخصیت ہو...... میں صبح کی گاڑی سے چلی جاؤں گی چاہے اُس وقت تک میرا سامان میڈرڈ کے کسی نیلام گھر میں ہی کیوں نہ فروخت ہو رہا ہو......"

شب کی ٹھنڈک میں خنک ہوتے اُن دودھیا شانوں پر میرے ہاتھ طویل اُڑان کے لئے کسی اوس سے بھیگے کھیت میں اُترنے والے کبوتروں کے جسم کی طرح گرم اور بے چین تھے

مزید پھڑپھڑانے سے ناژلا " واللہ" کہہ کر پیچھے ہٹ گئی۔
"مرد جب اپنا ہاتھ عورت کے ساتھ مس کرتا ہے تو وہ دونوں روحِ ابدیت کو چھو
ہیں ...... اور یہ تو خلیل جبران ہے"۔
"واللہ" اس نے حیرت سے کہا "بالکل ہے" اور پھر قریب آ کر آہستہ سے بولی "لیکن
جبران کے اس حوالے سے تو مجھے نہیں چھو سکتے"۔
"کیوں؟" میں نے سرگوشی کی۔
"واللہ" ناژلا نے جھنجھلا کر بلند آواز میں کہا اور پھر کچھ سوچ کر نہایت عالمانہ انداز میں
"ہاتھ مس کرنے کی بات ہوئی ہے اور صرف روحِ ابدیت کو چھونے کا ذکر ہے"۔
"ناژلا....." میں نے اُسے چھوٹے بچوں کی طرح سمجھاتے ہوئے کہا "یہ سب کچھ
ہے......"
"اگر خلیل جبران کو معلوم ہوتا کہ اس کی تحریروں کے حوالے دے کر ایک پاکستانی
کے ایک پاتیو کی اوٹ میں ایک لبنانی لڑکی کو یوں......"
"اگر اُسے معلوم ہوتا تو....."
"اوہ"

ناژلا کا جسم جو چند لمحے پیشتر خنک سنگِ مرمر کی مانند تھا۔ اب غروب آفتاب کے بعد
دل کے ریت کی طرح ہولے ہولے دہک رہا تھا۔ مجھے خلیل جبران پر بھی اعتبار آ گیا کہ
نے واقعی اُس کے حسنِ حقیقی کو اپنے بوجھل پردوں میں چھپا کر نظروں سے اوجھل کر دیا
پاتیو کے اندر بیلوں کی آغوش میں سوئے ہوئے فوارے کی سرسراہٹ مدھم تر ہوتی
اور پھر یکدم اُس کے پانی اُبل کر کناروں سے بہہ نکلے۔ جیسے انھوں نے بھی ابدیت کی
کو چھو لیا ہو۔

"کبا لیو رو خو" یا "سُرخ گھوڑا" غالباً قرطبہ کا قدیم ترین اور سب سے خوبصورت ریستوران
کا ہے ہر یرو کی ایک تنگ پاتیو نما گلی کے اندر چھپا ہوا ہے۔ درجنوں قہوہ خانوں
کے بعد ہم بے حد تھک چکے تھے اس لئے شب کا بقیہ حصہ سکون سے گذارنے کی خاطر

اِس خوشنما ریستوران کا انتخاب ہوا۔ اُندلسی ببول اور مالٹے کے درختوں میں سے گذر کر ہم صحن میں گئے جہاں متعدد ہسپانوی کُنبے رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ صحن کے درمیان میں قرطبی رواج مطابق کھجور کا ایک تن آور درخت تھا۔ ہم ایک ایسے گوشے میں بیٹھ گئے جہاں سے مسجد قرطبہ کا چوکور مینار برقی روشنیوں سے منوّر نظر آ رہا تھا۔

ثوریا کی طرح میں نے یہاں بھی "بیعنو تو رسنیکا" پر انحصار کیا اور ویٹر اُندلسی پائیلیا کے ساتھ بہاولپوری طرز کی ایک کچی صراحی بھی لے آیا۔

"سانگریا سینورا!" اُس نے جھک کر میرا گلاس سُرخ مشروب سے لبریز کر دیا۔ ایک گھونٹ بھرنے سے معلوم ہو گیا کہ سیدھا سادا شربت رُوح افزا ہے جسے ان لوگوں نے سانگریا کا نام دے رکھا ہے۔

"اوہ! سانگریا" ناژلا نے فوراً ناک پر عینک جما کر کتابچے کی ورق گردانی کی اور مجھے اس مشروب کے اجزائے ترکیبی سے آگاہ کیا "مالٹے اور لیموں کا رس، انناس، سرخ چیری چینی، ڈھیروں برف اور...... سُرخ وائن۔"

"واللہ" میں نے آخری جُزو سے خائف ہو کر کہا اور گلاس رکھ کر پائیلیا یعنی اُندلسی پلاؤ کی طرف راغب ہُوا۔ گیلے گیلے موٹے چاولوں اور سمندری خوراک کا نمکین مرکب جسے میں نے صرف اس لیے مزے سے کھایا کہ اس کا خوبصورت نام پائیلیا کانوں میں پائل کی طرح کھنکتا تھا۔

کھانے سے فارغ ہوئے تو کافی آ گئی۔ مَیں سگرٹ سُلگا کر قرطبہ کے نیم تاریک آسمان پر دُعا میں اُٹھنے والے ایک ہاتھ کی طرح بلند مینارِ مسجد کے خدوخال میں کھو گیا۔ اس وقت پورے شہر پر روشنی کی بارش کر رہا تھا۔

"واللہ مستنصر باللہ" ناژلا میری جانب یُوں جُھکی جیسے خوردبین میں سے میرا جائزہ لے رہی ہو "جب سے ہم اس ریستوران میں آئے ہیں تم خاموش بیٹھے ہو۔"

"خلیل جبران کا کوئی حوالہ یاد نہیں آ رہا" میں نے چونک کر کہا۔

"اب اس کی کیا ضرورت ہے" ناژلا نے بے دھیانی میں کہہ دیا "ویسے میں لبنان واپسی پر ایک مرتبہ پھر جبران کی تمام کتابیں بغور پڑھوں گی۔ صرف یہ معلوم کرنے کے لئے

کیا سچ مچ اُس نے یہ تمام باتیں کہی ہیں یا تم نے صرف ......"

"جیسا کہ تم نے کہا ہے اب اس کی کیا ضرورت ہے"

سانگریا کی صراحی خالی ہو چکی تھی۔

"ڈان منوئل" میں نے ویٹر کو پکارا "سانگریا"۔

"تمہیں اِس ویٹر کا نام کیسے معلوم ہو گیا؟" ناژلا نے حیران ہو کر پوچھا۔

"سیاحوں کے کتابچے سے۔ ڈان منوئل صرف "اوئے" کہنے کا مؤدب ہسپانوی طریقہ ہے"۔

میری نظریں بدستور مسجد کے مینار پر جمی تھیں۔ پھر یکدم پہلی منزل کی روشنیاں گُل ہوئیں اور اس کے بعد دوسری، تیسری اور چوتھی منزلیں بھی تاریک ہوتی گئیں میں نے وقت دیکھا ..... ایک بج رہا تھا۔ صحن میں بیٹھے ہوئے اکثر لوگ جا چکے تھے۔ ویٹر سانگریا کی صراحی لے کر آیا تو میں نے ریستوران کے بند ہونے کے اوقات کے بارے میں پوچھا۔

"عام طور پر تین بجے تک کُھلا رہتا ہے" اُس نے ناژلا پر ایک پُر مسرت نگاہ ڈالتے ہوئے کہا "لیکن اگر سینیورا اور سینیوریتا ایسا خوبصورت جوڑا یہاں آ جائے تو پھر تمام شب ......"

اس تعریفی فقرے نے مجھے ایک لمحے کے لیے بھی قائل نہ کیا۔ مجھے معلوم تھا خوبصورت جوڑے سے مراد صرف خوبصورت ناژلا ہے۔

قرطبہ کی صبحیں ہمیشہ خنک ہوا کے دامن میں آتی ہیں۔ دوپہر کو خاصی شدید گرمی پڑتی ہے اور شام کو موسم بے حد خوشگوار ہو جاتا ہے۔ لیکن نصف شب کے بعد قرطبہ پر ٹھنڈک سے لبریز ایسی ہوائیں چلنے لگتی ہیں کہ جسم کے روئیں روئیں میں خنکی اُترنے لگتی ہے۔ ناژلا کی سیاہ شال بار بار کندھوں سے ڈھلک جاتی اور سائیں سائیں کرتے کھجور کے پتوں کے سائے اس کے چہرے پر سمٹتے اور پھیل جاتے۔ ہوا کا ایک نم آلود جھونکا آیا جس نے مالٹے کے پتوں کی مخصوص خوشبو کے علاوہ ایک جانی پہچانی باس کا پتہ دیا۔ میں ناژلا کو وہیں چھوڑ کر اس آوارہ مہک کے تعاقب میں گلی سے باہر آ گیا۔ چند قدم کے فاصلے پہ دائیں ہاتھ ایک اور گلی تھی۔ خوشبو اسی جانب سے آ رہی تھی۔ میں اندر چلا گیا۔ تمام دیواریں مکمل طور پر چنبیلی کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ پتے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ صرف پھول تھے۔ برف کی

طرح سفید سے جیسے دیوار پر تازہ تازہ سفیدی کی گئی ہو۔ میں نے آگے بڑھ کر ایک بڑا سا گچھا توڑا اور واپس صحن میں آ کر ناژلا کے سامنے رکھ دیا۔ "خاسمین سنبوریتا"۔

"اوہ" ناژلا نے سفید خوشبو کو منہ سے لگا لیا۔ "اس میں سے لبنان کی مہک آتی ہے" اب میں اُسے کیا بتاتا کہ مجھے اس میں سے یہاں سے ہزاروں میل دُور کھجور کے ایک جھنڈ کے پار ایک گھر کی خوشبو آ رہی ہے۔

رات تین بجے جب ہم "کیا لیورخو" سے نکلے تو قرطبہ کی سفید گلیوں میں قدیم طرز کے لیمپ گُل ہو چکے تھے۔ پچھلے پہر کے بجھتے بجھتے چاند کی زرد روشنی سفید دیواروں کو مٹیالے دُھیمے رنگ میں بدل رہی تھی۔ البتہ وادی الکبیر کے رُومی پُل کی محرابیں ابھی تک روشن تھیں اور "کرمنوڈے لاس ڈولرس" کے چوک میں ایک لالٹین جل رہی تھی۔ ہم ویران گلی کوچوں میں سے گذرتے سٹیشن کی جانب جا رہے تھے۔ ناژلا اپنے جوڑے میں لگے چنبیلی کے پھولوں کو اُتار کر بار بار رخسار سے لگاتی۔ کابیے کامیداس سے متصل ایک چھوٹی سی گلی میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ ناژلا نے آگے بڑھ کر جنگلے کی سلاخوں میں سے اندر جھانکا "یہ گلی بند ہے"۔ اس نے سرگوشی کی۔ عربوں کے زمانے کے حمام کا ٹوٹا ہُوا گنبد۔ ایک شکستہ محراب۔ گرتی ہوئی دیوار پر ایک قدیم طرز کا لیمپ جس کی مٹیالی روشنی میں گئے وقتوں کا یہ کھنڈر محوِ خواب تھا۔ "یہ گلی بند ہے"۔ ان الفاظ میں قدامت کی گونج تھی۔ سینکڑوں برس پیشتر یہ فقرہ شاید یہیں ادا ہُوا تھا۔ ناژلا سے پہلے بھی تو کسی نے یہ کہا تھا۔ ایک بوڑھا فقیہہ سرِ شام مسجدِ قرطبہ میں نماز پڑھنے کے لئے جا رہا تھا۔ راستہ بھول کر ایک ایسی ہی تنگ گلی میں جا نکلا۔ ایک انتہائی خوبصورت لڑکی نے فقیہہ کی جانب دیکھا اور آہستہ سے صرف اتنا کہا "یہ گلی بند ہے"۔ فقیہہ اس فقرے کی ادائیگی اور اُس لڑکی کے حُسن کی تاب نہ لا سکا۔ اب قرطبہ میں ٹھہرنا گویا اپنی نیک نامی کو دفن کر دینے والی بات تھی۔ اُسی شب فقیہہ نے قرطبہ چھوڑا اور کسی غیر معروف گاؤں میں جا کر گوشہ نشین ہو گیا جہاں چند روز بعد اُس کا انتقال ہو گیا۔

میں نے ناژلا کی جانب دیکھا۔ وہ بدستور سلاخوں کے ساتھ چہرہ جمائے کھنڈر کے ابدی

سکوت میں کھوئی ہوئی تھی۔ اُس نے ایک بار پھر مڑ کر میری طرف دیکھا "یہ گلی بند ہے"
"کیا تو اُن راتوں کو یاد کرے گی جن میں ہم ایک جگہ جمع ہوئے۔ تیرے نفس کی شعاعیں ہالہ کی طرح ہمیں گھیرے ہوئے تھیں۔ کیا تو اُن چنبیلی کی بیلوں کو یاد کرے گی جن کی شاخوں کے سائے میں ہم بیٹھے تھے اور وہ ہم پر اس طرح سایہ فگن تھیں گویا ہمیں انسان کی نگاہوں سے چھپائے ہوئے ہیں۔ کیا تو اُن گلیوں کو یاد کرے گی جن پر ہم چلتے تھے۔ تیری انگلیاں میری انگلیوں میں اس طرح پیوست تھیں جیسے......"
" واللہ مستنصر باللہ تم عجیب و غریب شخصیت ہو" نازلا مجھے خاموش پا کر میرے قریب آ گئی "یہ گلی واقعی بند ہے"
اُسے چھونے کے لیے اب مجھے خلیل جبران کی ضرورت نہ تھی۔

اشبیلیہ کی جانب سے میڈرڈ جانے والی گاڑی چھت سے لٹکے "کارڈوبا" کے بورڈ تلے سرکتی ہوئی آئی اور ایک دھچکے سے خالی پلیٹ فارم پر رک گئی۔ نیچے اُترنے والا واحد مسافر ایک موٹا پادری تھا جو صبح کی خنکی سے بچنے کے لیے کالے چوغے میں ہاتھ ٹھونسے تیز تیز چلتا سٹیشن سے باہر نکل گیا۔
"تمہارا وہ میکسیکن ہیٹ کہاں ہے؟"
"میڈرڈ کے کسی نیلام گھر میں۔ میرے بقیہ سامان کے ساتھ" اُس کے لبوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ روشن ہوئی اور بھڑک کر بجھ گئی۔ انجن کی تیز وسل سٹیشن سے نکل کر نیم خوابیدہ قرطبہ پر گونجی اور مدھم ہو کر لوٹ آئی۔
" واللہ......" اس نے بے چارگی کے عالم میں دونوں ہاتھ پتوں کی طرح جھٹکے اور پھر لبنان کے دیودار کے درختوں اور پہاڑی چشموں ایسی ایک لڑکی جو نازلا سعد تھی خاموشی سے اپنے سامنے کھڑے ڈبے میں سوار ہو گئی
"کون ہے؟"
"میں کبھی لاجواب نہیں ہوا مگر اس شخص کے سامنے جس نے مجھ سے پوچھا تو کون ہے؟"
میں گاڑی کے چلنے کا انتظار کیے بغیر سٹیشن سے باہر آ گیا۔
یہ گلی بند ہے۔

بجلی ایک مرتبہ پھر چمکی تو دائیں ہاتھ پر سیرا مورینا کی جانب جاتی ہوئی سڑک کے کنارے "مدینۃ الزہرا — اِس طرف" کا بورڈ نظر آیا مگر ہماری ماضی کے ان مزاروں کی بجائے فصیلِ قرطبہ کے ساتھ اشبیلیہ جانے والی شاہراہ پر مُڑ گئی۔

آج صبح حسب پروگرام مدینۃ الزہرا کے کھنڈرات دیکھنے کے لئے خیمے میں کپڑے بدل رہا تھا کہ یکدم باہر تیز ہوا چلنے لگی۔ پہلے درختوں سے زیتون پکے بیروں کی طرح ٹپ ٹپ میرے خیمے پر گرے اور اس کے ساتھ ہی تیز بارش شروع ہو گئی۔ باہر آیا تو کیمپنگ میں سیّاحوں کے خیمے بے گھر پرندوں کی طرح پَر سمیٹے بھیگ رہے تھے۔

"اس وقت مدینۃ الزہرا کی جانب جانا سراسر حماقت ہے"، کیمپنگ کے مالک نے خبردار کیا "سیرا مورینا پر ایسے طوفانی موسم میں اکثر بجلی گرتی ہے اور کھنڈرات میں سانپ رینگتے ہیں۔"

شام کو بارش میں قدرے کمی ہوئی تو میں خیمہ سمیٹ کر اشبیلیہ جانے کے لیے کیمپنگ سے باہر آ گیا۔ خوش قسمتی سے دو جرمن سیّاح جو میرے ساتھ والے خیمے میں مقیم تھے اُسی وقت اشبیلیہ کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ اُنھوں نے مجھے بھی اپنی کار میں بٹھا لیا۔

بارش اب پھر تیز ہو چلی تھی۔ جب کبھی بجلی چمکتی کار کے شیشوں پر رینگتے پانی کے قطروں میں سے سیرا مورینا کی سیاہ چوٹیاں نظر آ جاتیں۔ اس وقت مدینۃ الزہرا کے کھنڈروں میں سانپ رینگ رہے ہوں گے .... اُن کھنڈروں میں جن میں ایک ایسا عجوبۂ روزگار ایوانِ خاص تھا جس کی دیواریں سونے اور چاندی سے تعمیر ہوئی تھیں۔ اس کے وسط میں ایک ایسا فوّارہ تھا جس کے نیچے تالاب میں ہر وقت پارہ بھرا رہتا تھا سورج کی کرنیں ایک خاص زاویے سے جب ایوان کے روشندانوں میں سے داخل ہوتیں تو ایک غلام خلیفہ کے حکم پر پارے کو ہلا دیتا۔ پورا ہال ایک متحرک اور ناقابلِ برداشت تیز روشنی کی زد میں آ جاتا۔ دیواروں پر چڑھے سونے اور فوّاروں میں نصب جواہرات کی چمک اس پر مستزاد۔ سینکڑوں خوبصورت تالابوں، باغات، محلّات اور انتظامی امور کی عمارتوں پر مشتمل مدینۃ الزہرا یعنی کنیز زہرا کا شہر پچیس کروڑ روپے کی لاگت سے چالیس برسوں

میں تعمیر ہوا مگر صرف پینتیس برس بعد بربر قبائل نے اِس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔
"تم دیکھ رہے ہو کہ ایک خوبصورت چہرے کو ایک حبشی نے آغوش میں لے رکھا ہے"
حبشیوں نے سچ مچ زُہرا کے خوبصورت چہرے کو اپنی تباہ کن آغوش میں لے کر کھنڈر کر دیا۔ زُہرا کا مجسمہ پاش پاش کر دیا گیا۔

اور آج ایک ہزار برس بعد اس عجوبۂ روزگار محل کے کھنڈر اتنی وقعت بھی نہ رکھتے تھے کہ ایک پاکستانی سیاح انہیں دیکھنے کے لئے قرطبہ میں صرف ایک روز اور ٹھہر جانے کی تکلیف گوارا کرتا۔ میں نے کھڑکی کا شیشہ سرکایا تو پانی کی بوچھاڑ نے مجھے بھگو دیا۔ سیرا مورینا پر مسلسل بجلی کوند رہی تھی۔ اسے اب بادامون کے سفید شگوفوں کی بجائے سفید بادلوں نے ڈھانک رکھا تھا۔ زہرا کے مجسمے کے ٹکڑے اپنے عظیم الشان محل کے کھنڈروں میں بکھرے ہوئے تھے۔ حزم ابن جہور نے مدینۃ الزہرا کے کھنڈرات دیکھ کر کہا تھا۔

"میں نے ایک دن اس قصر کے کھنڈرات سے پوچھا کہ جن کے بانی تباہ ہو گئے کہ تیرے ساکن جو ہماری عزت کرتے تھے، کہاں گئے۔ اُس نے کہا، یہاں تھوڑی دیر ٹھہرے پھر چلے گئے۔ معلوم نہیں کدھر گئے۔"

بائیں جانب عبدالرحمٰن الداخل کی تعمیر کردہ گیارہ میل طویل بلند فصیل کے مینار اور بُرج گذر رہے تھے۔ باب الدور میں سے شارع المنصور کی ایک جھلک دکھائی دی۔ میں نے پچھلے شیشے میں سے قرطبہ پر الوداعی نظر ڈالی۔ فصیل اور شہر کی عمارتوں سے الگ تھلگ وادیٔ الکبیر کے کنارے مسجد قرطبہ کا مینار سینٹ رافیل کے مجسمے کا بوجھ اُٹھائے تنہا کھڑا تھا۔ قرطبہ کی گم گشتہ عظمتوں کا کتبہ مٹیالے آسمان میں گڑا ہُوا۔ دریا کے درمیان میں مُورش پن چکیاں بُوڑھی بھکارنوں کی طرح ڈیرہ ڈالے ہوئے تھیں۔ پھر کھجوروں کا ایک جُھنڈ آیا...... میرا گھر؟ کیا اس جھنڈ کی دوسری جانب راوی کے پار مجھے بادشاہی مسجد کے مینار دکھائی دیں گے؟ یا میں اُن میں سے ایک مینار کو اپنے

پیچھے چھوڑ آیا ہوں، اپنے گھر کو پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ وہ گھر جو صدیوں پیشتر وادی الکبیر کے کنارے مسجدِ قرطبہ کے پہلو میں آباد تھا۔

میرے گھر نے مجھ سے کہا مجھے نہ چھوڑ کہ تیرا ماضی مجھ میں آباد ہے اور میرے راستے نے مجھ سے کہا میرے پیچھے چلا آ کہ میں تیرا مستقبل ہوں۔

اور یوں میں نے اُس گھر کو چھوڑا جس میں میرا ماضی آباد تھا اور اُس راستے کے پیچھے چل دیا جو کہ میرا مستقبل تھا۔

......اور اشبیلیہ

پٹڑی کُوٹتے ہوئے پہیوں کی گڑگڑاہٹ اور گاڑی کے بھڑتے ہوئے ڈبّوں کی متواتر حرکت ۔ ایک آہنی لوری...... ایک جھنجھوڑتا جُھولا ۔ آنکھیں بے اختیار بند ہو رہی ہیں سر پنڈولم کی طرح ہلتا ہے...... اور پھر رات کے پچھلے پہر گاڑی کسی قصباتی اسٹیشن پر رُک جاتی ہے ۔ سکوت ایک دھماکے کی صورت میں سوتے جاگتے اعصاب پر پھٹ کر یکدم آپ کو بیدار کر دیتا ہے...... کار سانس روکے کھڑی تھی ۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا اور ماتھے پر تیوری ڈال کر نیند سے بھاری ہونٹوں کو بمشکل کھولا...... میرے ہمسفر گیراڈ اور دِلّی اگلی نشستوں پر موجود نہ تھے۔ سامنے ونڈ سکرین پر روشنیوں سے منوّر ایک بلند محرابی خلا نظر آ رہا تھا ۔ شکستہ فصیل کے تاریک سائے ہیں...... بھاٹی دروازہ...... آ دِلّی دَر دتے! نہیں سر کلر روڈ نہیں ہے ۔ شاید ہم ابھی تک قرطبہ میں ہیں ۔ لیکن کار کے وائپر اپنی اپنی جگہ اطمینان سے لیٹے ہوئے تھے ۔ قرطبہ نہیں ہو سکتا ، وہاں تو بارش ہو رہی تھی ۔

"یہ پہلا ہسپانوی قصبہ ہے جہاں قہوہ خانے رات کے ڈیڑھ بجے ہی بند ہو جاتے ہیں" گیراڈ نے کار کا دروازہ جھٹکا اور دھپ سے اپنی نشست پر گر کر چابی گھما دی...... کار ایکسلریٹر کے دباؤ کے بغیر ہی ڈھلوان سڑک پر تیزی سے اُترنے لگی ۔ کچھ عرصے بعد کار کا جھکاؤ ہموار ہُوا اور ہم پہاڑی سے اُتر کر میدانی علاقے میں داخل ہو گئے ۔ محرابی دروازہ اب بھی نظر آ رہا تھا ۔ عرش کے دروازے میں چھدا ہُوا چابی کا سوراخ ۔

"اِس قصبے کا نام کیا تھا ۔ گیراڈ ؟ "

"اوہ..... تم جاگ رہے ہو ؟" گیراڈ چونک گیا اور سڑک سے توجہ ہٹائے بغیر بے دلی

سے بولا "مجھے نہیں معلوم اور نہ ہی جاننے کا شوق رکھتا ہوں۔ محرابی دروازے میں سے اندر داخل ہُوا تو دل میں ہَول اُٹھنے لگا۔ تاریک اور پژمردہ گلیاں جیسے کوئی مر گیا ہو...... اور پھر صرف ڈیڑھ بجے۔" اُس نے فقرہ ادھورا چھوڑ کر سگرٹ سلگا لیا۔

"میں بھی ایک...... سگرٹ پی لوں......" وِلی نے ڈیش بورڈ کے بٹن پر انگوٹھا رکھ کر نہایت عاجزی سے اجازت چاہی۔

"نہیں......" گیراڈ سختی سے بولا "کار میں نہیں......"

ان ہر دو حضرات سے میری شناسائی ابھی ابتدائی مراحل میں تھی ورنہ ضرور پوچھتا کہ بھلے آدمی خود تو کش پہ کش لگائے جا رہے ہو اور وِلی غریب پر یہ قدغن کہ کار میں نہیں۔ بہرحال یہ عقدہ کیمپنگ اشبیلیہ میں جا کر کُھلا۔

آخرِ شب ہم اشبیلیہ شہر سے دس میل اِدھر ایک کیمپنگ گراؤنڈ میں داخل ہُوئے۔ ہماری بے وقت آمد سے بیزار، اُونگھتی ہوئی ایک خاتون نے داخلے کے رجسٹر پر ہمارے نام درج کیے اور ہمارے پاسپورٹوں سے بدن کھجلاتی واپس قہوہ خانے کے اندر چلی گئی۔ خیمے نصب کرنے کے بعد فیصلہ ہُوا کہ اتنے خوشگوار موسم میں خیموں کے اندر بند ہو کر سونا زیادتی ہے۔ باہر کھلی ہوا میں بقیہ شب بسر کی جائے۔ میں اپنے سلیپنگ بیگ پر لیٹا، تو میرے گرد تازہ کٹی ہوئی گھاس نے خبر کی، تم آزاد ہو۔ جو خوشبوئیں میرے جُثّے میں ہمیشہ کے لیے رچ بس گئی ہیں وہ سب دھرتی میں سے پُھوٹتی ہیں۔ پیاسی زمین پر بارش کے پہلے قطرے سے اُٹھنے والی مٹی کی گرم مہک۔ گُندھے ہوئے گندم کے آٹے میں سے آنے والی اناج کی خوشبو اور تازہ کٹی ہوئی گھاس کی سبز باس۔ وطن سے دُور میں اپنی دھرتی اور اناج کی خوشبو کے لیے ترستا ہوں ــــ اور وطن میں اُس سبز باس کو جو دورانِ سیّاحت ہر شب خیمے میں لیٹے مجھے آزادی کا احساس دلاتی ہے۔ کبھی یوں بھی ہُوا کہ میں مُنہ اندھیرے اُٹھ کر جناح باغ کے کسی کونے میں اوس سے بھیگی زمین پر آزردہ ہو کر جا لیٹا۔ اور گھاس کی مہک کے سہارے گھُٹے ہوئے ماحول اور بے کیف زندگی کے بندھن صرف چند لمحوں کے لیے ٹوٹتے ہوئے محسوس کر لیے...... کیمپنگ اشبیلیہ کے سرسبز میدان میں چاندنی چھٹکی ہوئی

تھی۔ میری آنکھوں پر ایک وسیع نکھرا ہُوا آسمان تھا....... ولایت میں ایک شب جب شدید برفباری ہو رہی تھی اور کمرے کا گیس ہیٹر سکوں کی کمی کے باعث ٹھنڈا پڑا تھا تو میرے دوست حنیف نے کمبل میں سے سر نکال کر آہستہ سے کہا "مستنصر! میں یورپ میں صرف ایک تجربے کو مِس کرتا ہوں..... اپنے وطن لائل پور کے چک نمبر ۳۶ کے کچے کوٹھے پر گرمیوں کی راتوں میں بستر کی سفید چادر پر لیٹے چاندنی اور ٹھنڈک کا احساس..... اگر اندلس کی اس خوشگوار رات میں حنیف میرے ہمراہ ہوتا تو وہ لائل پور کے چک نمبر ۳۶ کو شاید اتنا مِس نہ کرتا۔

"گیراڈ....." وِلّی اپنے سلیپنگ بیگ پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا "اب پی لوں"۔

"ہاں پی لو!" گیراڈ نے انتہائی شفقت سے اجازت دے دی۔ وِلّی نے ایک تلاشی بھری اور کار کے ڈیش بورڈ میں سے ایک پوٹلی نکال لایا۔ ایک سگرٹ کو پکڑ کر اسے تمباکو سے خالی کیا اور پھر تمباکو کو ہتھیلی پر پھیلا کر..... بہرحال اس نے دو سگرٹ بھرے اور وہیں سلیپنگ بیگ پر بیٹھ کر سُوٹے لگانے لگا۔

"وِلّی اور میں ہیمبرگ کے ایک ہی دفتر میں کام کرتے ہیں" گیراڈ نے ایک نارمل سگرٹ جلاتے ہوئے کہا "گرمیوں کی چھٹیوں میں اکٹھے ہسپانیہ آئے........ اچھی بھلی دھوئیں سے پاک سیاحت کے بعد بدقسمتی سے میڈرڈ کے یوتھ ہوسٹل میں قیام ہو گیا۔ وِلّی نے چرس کا پہلا سگرٹ وہیں پیا۔ اب کہتا ہے جب تک سال بھر کا کوٹہ حاصل نہ کر لوں جرمنی واپس نہیں جاؤں گا چنانچہ مراکو جا رہے ہیں"۔

وِلّی نے پہلا سگرٹ تو نہایت شریفانہ طور پر کھینچا مگر دوسرے کا پہلا کش لگاتے ہی وہ اِدھر اُدھر کی ہانکنے لگا۔ وہ بایاں ہاتھ بلند کر کے انگلیوں سے "وِی" کا نشان بناتے ہوئے نعرے لگانے لگا۔ "امن۔ امن"

"وِلّی....." گیراڈ نے ڈانٹ پلائی "کیا تم چاہتے ہو کہ پچھلی تین کیمپنگ گراؤنڈز کی طرح یہاں سے بھی ہم نکالے جائیں؟"

وِلّی نے فوراً اپنی "وِی" بھینچ کر لی اور نہایت مسکین شکل بنا کر بیٹھ گیا۔ دوسرا سگرٹ ختم کرنے کے بعد وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا اور پھر میرے قریب آ کر کہنے لگا "دراصل

میں ایک ہندوستانی سنیک چارمر ہوں۔" وہ سلیپنگ بیگ پر پھر آلتی پالتی مار کر اکڑوں بیٹھ گیا اور انگلیوں میں تھامی ایک خیالی بین کو جھوم جھوم کر بجانے لگا۔

"اور اگر یہاں سے سچ مچ کوئی سانپ نکل آئے تو......" میں نے سرگوشی کی۔ اُس کا جھومتا ہوا سر اور ہاتھ وہیں ساکت ہو گئے "آہم......" اُس نے خوف زدہ ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا "وہ تو پاکستان وغیرہ میں ہی ہوتے ہیں...... نہیں؟"

"نہیں! سپین وغیرہ میں بھی ہو سکتے ہیں۔ گرم خطہ ہے۔"

"تم یقیناً مذاق کر رہے ہو......" وِلی نے سلیپنگ بیگ میں گھستے ہوئے ہکلا کر کہا۔ گیراڈ جو اب تک خاموش لیٹا بڑی دلچسپی سے یہ تماشہ دیکھ رہا تھا دھیرے سے اُٹھا اور کیمپنگ کے عقب میں زیتون کے سیاہ باغ کی جانب اشارہ کر کے انتہائی سنجیدگی سے کہنے لگا "اس گھنے باغ میں یقیناً یہ لمبے لمبے پھنیئر سانپ ہوں گے۔"

وِلی تھر تھر کانپنے لگا اور ٹڑاپ سے اپنا سر سلیپنگ بیگ میں گھسیڑ لیا۔ سلیپنگ بیگ یوں ہل رہا تھا، جیسے اندر بھونچال آیا ہوا ہے۔

گیراڈ جس کی نیند وِلی کی خرمستیوں کی وجہ سے برباد ہو چکی تھی اب شرارت کے موڈ میں تھا۔ وہ کہیں سے ایک سوکھی ٹہنی اُٹھا لایا اور وِلی کے سلیپنگ بیگ پر پھینک دی۔ وِلی نے "یا ہُو" کی ایک دلدوز چیخ بلند کی اور سلیپنگ بیگ سمیت اُٹھ کھڑا ہوا...... بھاگنے کی کوشش کی تو دھڑام سے نیچے آگرا۔ میں اور گیراڈ ہنس ہنس کر بے حال ہو رہے تھے۔ اتنی دیر میں وِلی نے اپنے آپ کو سلیپنگ بیگ سے آزاد کیا اور "سانپ سانپ!" کا شور مچاتا کار کی جانب لپکا۔ کار میں گھستے ہی اُس نے تمام دروازے پھرتی سے مقفل کر لیے اور ونڈسکرین پر ناک جما کر کسی خوفزدہ خرگوش کی مانند باہر تکنے لگا۔

گیراڈ نے چپکے سے ایک کنکر کار کی چھت پر پھینک دیا۔ وِلی نے "یا ہو" کا ایک اور نعرہ لگایا اور چھلانگ لگا کر کار سے باہر آ گیا۔ اُس نے کمال پھرتی سے نشستوں سمیت کار کا تمام سامان نکال کر باہر پھینک دیا اور پھر اچھی طرح تسلی کرنے کے بعد کہ کہیں کسی کونے کھدرے میں سانپ وانپ تو نہیں چھپا بیٹھا پھر مقفل ہو کر اندر جا بیٹھا۔ ہمارے قہقہے اور وِلی کی دہائی

سُن کر چوکیدار خاتون اُونگھتی ہوئی پھاٹک کی طرف سے برآمد ہو گئی "مجھے معلوم ہے کہ یہ آپ کے بس کی بات نہیں لیکن اگر آپ حضرات مہذّب بننے کی کوشش کریں تو میں شکر گذار ہوں گی۔!" اُس نے انتہائی ورشتگی سے کہا۔

"بات یہ ہے ......" گیراڈ نے دانت نکالتے ہوئے کہنا شروع کیا "بات یہ ہے کہ ہمارے دوست کو یہاں سانپ نظر آ رہے ہیں۔"

"سانپ؟" خاتون نے نہایت اطمینان سے اِدھر اُدھر دیکھا "عام طور پر تو نہیں ہوتے۔ ہاں کبھی کبھار زیتون کے باغ میں رینگ کر ایک آدھ اِدھر بھی آنکلتا ہے ......"

گیراڈ کا اُبلتا ہُوا قہقہہ ٹھنڈا ہو کر واپس حلق میں اُتر گیا اور اُس نے فی الفور اپنا مُنہ سلیپنگ بیگ میں گھُسیڑ لیا۔

"ویسے بے ضرر ہوتے ہیں۔" خاتون نے جاتے ہوئے تسلّی دی۔

"مگر ہوتے تو سانپ ہی ہیں نا!" گیراڈ سلیپنگ بیگ کے اندر بڑبڑایا۔ اس دوران میں ہنستے ہنستے میرا جسم دُکھنے لگا تھا۔ اب میری باری تھی۔ مَیں نے ایک اور کنکر اُٹھا کر کار کی جانب لڑھکا دیا۔

"ہا ہُوا! ہُو ہُوا!" وِلی عزیب کی تو گھگھی بندھ گئی۔ کار چاروں پہیوں پر یُوں لڑکھڑائی جیسے ابھی ٹہوسی مار کر اوندھی ہو جائے گی۔ اتنی دیر میں میرے سلیپنگ بیگ پر سرسراہٹ سی ہوئی۔ میری کھلی ہوئی باچھیں فوراً معمول پر آگئیں ...... تھوڑی دیر بعد پھر حرکت ہوئی۔ میں نے جھرجھری لے کر سلیپنگ بیگ اپنے اوپر کھینچا اور ایک کونے میں دُبک گیا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ گیراڈ کی کارستانی ہے مگر کیا پتہ ......

میری آنکھ کھلی تو آسمان نیلے ملتانی پیالے کی مانند ہلکی ہلکی دھوپ میں دمکتا نظر آیا۔ پنجاب کے دیہات میں اوائلِ سرما ایسی سفید دھوپ جب زندگی کی تمام تر راحتیں کھیت کی منڈیر پر بیٹھ کر پونے گنّے چُوسنے سے حلق میں اُترتی ہیں۔ میرے قریب گھاس پر ایک نوٹ پڑا تھا۔ "اشبیلیہ کے سانپ تمھیں مبارک ہوں ..... ہم اب مراکوس جا کر ہی ہین بجائیں گے ..... خوش قسمتی تمھارے ساتھ ہو ..... گیراڈ اور وِلی" کیمپنگ کے میدان میں نکوتے

خیمے چھوٹے چھوٹے رنگین اہراموں کی طرح ہر سُو بکھرے ہوئے تھے جن کے باہر اہالیانِ خیمہ جا ناشتے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ پونے گنّے کی طرح رس بھری دو سویڈش گوریاں نہانے کے مختصر ترین لباس جسم سے چپکائے تالاب کی جانب جا رہی تھیں۔ میں نے سلیپنگ.. تہہ کر کے خیمے میں رکھا اور سومنگ کاسٹیوم زیب تن کر کے ان پیچھے پیچھے گنڈیریوں کے پیچھے پیچھے پ دیا۔ وہ گوریاں گنّے دیاں پوریاں نہاتے کا تردد کیے بغیر تالاب کے کنارے اوندھی .. ط کر دھوپ سینکنے لگیں۔ اِدھر اُدھر انگلیاں چٹخاتے ہسپانوی نوجوانوں نے گنّے کی مٹھاس خوشبو سونگھی اور اُن کے گرد بھنبھنانے لگے۔ دل ناتواں نے مقابلہ کرنے سے انکار کر دیا کہ ا نوجوان بے حد خوش شکل تھے۔ انگور کھٹّے ہیں کے مصداق اب وہ گوریاں مجھے پونے کی بجا کاتے گنّے نظر آ رہی تھیں...... تالاب میں چند ڈبکیاں لگانے کے بعد میں نے کپڑے تبدیل کیے اور کیمپنگ کے باہر آ کر اشبیلیہ جانے والی بس پر سوار ہو گیا۔

دُور سے ہی سُرخ چھتوں اور سفید دیواروں کے وسط میں ایک چوکور مینار نظر آیا۔

"لاخیرالدا" ڈرائیور نے اشارہ کیا۔ "اہلِ اشبیلیہ سفر سے واپسی پر خیرالدا کو دیکھتے ہی کہ اُٹھتے ہیں۔ بس گھر آ گیا۔"

نفح الطیب میں لکھا ہے اسپینیہ کو آباد کرنے والا روم کا پہلا سیزر جولیس تھا۔ شہر کا نام رومینہ جو .. قرار پایا جو بعد میں بگڑ کر اشبیلیہ کہلایا۔ رومی عہد میں اس کی اہمیت کا اندازہ اس با.. لگایا جا سکتا ہے کہ روم کے دو سیزر ہیڈرین اور ٹروجن اسی شہر میں پیدا ہوئے۔ رومیوں کے بعد گوتھ آئے اور پھر موسیٰ بن نصیر کے ہاتھوں یہ شہر مسلمانوں کے زیرِ نگیں آیا۔ پانچ سو چھتیس سالوں پر یہ دور اشبیلیہ کا زرّیں عہد تھا۔ ایک عرب تاریخ دان لکھتا ہے "یہ شہر وادی الکبیر کے کنار واقع ہے جو دریائے فرات اور نیل سے بزرگی میں کسی طرح کم نہیں۔ ہوا معتدل ہے۔ ہر طرف سبزہ زار ہیں۔ عمارتیں نہایت خوبصورت ہیں جن پر سفیدی ہوتی رہتی ہے اور باغوں کے سبزے میں وہ ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے رات کو آسمان پر ستارے۔" علامہ الشقندی نے لکھا اس شہر میں دنیا کی ہر شے میسّر ہے یہاں تک کہ اگر کسی کو پرندوں کے دودھ کی بھی ضرورت ہو تو وہ بھی شاید اشبیلیہ میں مل جائے۔"

ثوریا کی تعریف میں رطب اللسان ہونے والا شاعر مچادو اپنے آبائی شہر کو اندلس کے تمام شہروں پر فوقیت دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے قادس! نمکین چمک کا شہر ہے۔ غرناطہ! پوشیدہ پانی جو اشکبار ہیں۔ قرطبہ! خاموشش ملاگا! فلیمنکو رقاص۔ المیریا! الفرقی۔ جیان! رد پہلی اور .... اشبیلیہ!___ یعنی اندلس کے تمام شہروں کی تعریف کی جا سکتی ہے مگر اشبیلیہ کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اشبیلیہ ہے۔ گویا لاہور! لاہور ہے والا قصہ ہے اور یوں اہل لاہور کا شعری ذوق مچادو کے ہم پلہ ٹھہرتا ہے۔

بس کا آخری سٹاپ اشبیلیہ کی سب سے خوبصورت شاہراہ سیئرپس پر تھا جسے حسب معمول یورپ کی خوبصورت ترین سڑک کے لقب سے نوازا گیا ہے۔ اشبیلیہ میں کہاوت ہے کہ زندگی میں تین بڑی مسرتیں ہیں۔ نوجوان ہونا، اشبیلیہ میں ہونا اور سیئرپس پر کھڑے ہو کر حسین لڑکیوں کو تکتے رہنا۔ پہلی دو مسرتوں سے تو ہم محروم تھے تیسری کے حصول کے لیے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو سخت مایوسی ہوئی۔ ہاں البتہ قریبی ٹورسٹ آفس کی میزبان لڑکی کو ایک کونے میں کھڑا اس وقت تک زندگی کی اس تیسری مسرت سے لطف اندوز ہوتا رہا جب تک کہ اس نے مجھ سے پوچھ نہ لیا کہ صاحب جو کچھ پوچھنا ہے پوچھو اور اپنی راہ لو۔ میں نے حسب معمول شہر کے نقشے کی فرمائش کی جو فوراً پوری ہوئی۔ پھر ہسپانوی سگرٹوں کے نام دریافت کیے کہ انگریزی سگرٹوں کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا۔ اس نے نقشے پر ہی دو نام گھسیٹ دیے فلیبرا اور گویا! میں حسب میڈرڈ گویا کہ ...... کہنے والا تھا کہ ایک امریکی سیاح نے مجھے پرے دھکیلتے ہوئے مسخرے پن سے دریافت کیا "گویا! دہ باربر آف اشبیلیہ کی دکان کدھر ہے میں نے حجامت بنوانی ہے"۔

باہر آ کر میں نے "گویا سگرٹ" کو ترجیح دی کہ آرٹسٹک نام ہے۔ مگر پہلے کش سے ہی دم باہر کو آیا ...... بالکل نار برانڈ! معلوم ہوتا ہے اب بھی مقامی تمباکو فیکٹری میں میریمی کے کردار کارمن جیسی خانہ بدوش دوشیزائیں کام کرتی ہیں جو اپنے عشق کی کڑواہٹ سگرٹوں میں بھر دیتی ہیں۔

جیسے پیرس میں داخل ہوتے ہی آنکھ اس لوہے کے ڈھانچے کو ڈھونڈتی ہے جسے ایفل ٹاور کا نام دیا جاتا ہے۔ کچھ اسی طرح اشبیلیہ میں قدم رکھتے ہی دل میں جیرالڈا ٹاور کو دیکھنے کے لیے لُدبُد شروع ہو جاتی ہے۔ مگر جیرالڈا ایفل ٹاور کی طرح اپنے آپ کو دیر تک پوشیدہ نہیں رکھ سکتا۔ اشبیلیہ میں آپ کہیں بھی ہوں نگاہ اُٹھاتے ہیں اور جیرالڈا آپ کے سر پر رہوڈز کے عظیم الشان مجسمے

کی طرح کھڑا ہوگا۔ مراکشی طرز تعمیر کا تین سو پانچ فٹ بلند جیرالڈ ۱۱۸۴ء میں جامع اشبیلیہ کے مینار کے طور پر تعمیر ہوا۔ اس کے پہلو میں مسجد کی بجائے ایک دیوہیکل کلیسا کی عمارت کھڑی ہے۔ اس پر استعمال شدہ گچ دن کی روشنی کے ساتھ ساتھ رنگ بدلتا رہتا ہے۔ پچھلے پہر اس کا چوکور حجم زرد گلاب کی مانند پیلا پڑ جاتا ہے اور شفق کی سرخی اس پر دہکتے ہوئے شعلوں کی طرح بکھرتی ہے۔ مسلمانوں کے اخراج کے بعد جب پندرھویں صدی میں جامع مسجد کے ہمراہ جیرالڈ کو بھی مسمار کیا جانے لگا تو شہزادہ الفانسو نے حکم جاری کیا کہ اگر اس خوبصورت مینار کی ایک اینٹ بھی اُکھاڑی گئی تو وہ اشبیلیہ کی پوری آبادی کو تہ تیغ کر دے گا۔ مسجد کے ملبے پر کھڑے ہو کر پیٹر نے اعلان کیا۔ "آؤ اس مسجد کی جگہ ایک اتنا عالی شان اور بڑا کلیسا تعمیر کریں کہ آنے والی نسلیں ہمیں پاگل سمجھیں!" اور جب ایک سو چار برس بعد کلیسا مکمل ہوا تو آنے والی نسلوں نے پتھر کے اس عظیم تودے کو دیکھ کر واقعی اس کے معماروں کو پاگل سمجھا۔ نیشنل کالج آف آرٹس لاہور کے جاوید نجم جیرالڈا کو دنیا کا پہلا سکائی سکریپر قرار دیتے ہیں۔ مینار کی چوٹی تک سیڑھیوں کی بجائے پہاڑی سڑک جیسی چڑھائی ہے۔ میں چوٹی پر پہنچا تو بلندی کی وجہ سے تیز ہوا چل رہی تھی اور گھڑیال بے بس ہاتھیوں کی طرح جھول رہے تھے۔ سیّاح ہانپتے ہوئے دروازے میں سے برآمد ہوتے۔ کچھ دیر سستانے کے بعد گیلری کے چاروں طرف گھوم کر تصویریں اُتارتے اور نیچے اُتر جاتے۔

صحت مند رجحانات کی حامل ایک سیّاح لڑکی اپنے بوڑھے باپ کے ہمراہ اُوپر آئی۔ جونہی اُس نے گیلری میں قدم رکھا تیز ہوا سے اس کا مختصر سکرٹ پھڑپھڑاتا ہوا اُٹھا اور اُس کے جسم کے بالائی حصّے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جیسے ایک سنہری بُھٹّے کو اُلٹا کر اس کے پرت چھیل دیے جائیں۔ اس نے بے دلی سے سکرٹ نیچے کرنے کی کوشش کی اور پھر گیلری پر جھک کر مینا کے قدموں میں بچھے شہر کو دیکھنے لگی۔ آرپار دیکھنے قسم کا گلابی زیرجامہ جو مختصر ہونے کی وجہ سے بس پنکھڑی اک گلاب کی سی تھا فوری طور پر توجہ کا مرکز بنا اور متعدد ہسپانوی نوجوان جنھیں مینار کی چوٹی پر چلنے والی تیز ہوا کی اس مہربان خصوصیّت کا علم تھا مناسب زاویوں پر تعینات ہو کر محوِ نظارہ ہو گئے۔

چوٹی پر عیسائیوں کا نصب کردہ ایک مذہبی مجسمہ ہے جو تیز ہوا کے زور سے ہر وقت گ

رہتا ہے۔ اسی مجسّمے سے مینار نے اپنا نام پایا۔ جیرالڈا یعنی گھومنے والا مینار کے قدموں میں ایک فوارے کے گرد مالٹے کے درختوں کا ایک مختصر باغ ہے جو جامع اشبیلیہ کا صحن ہُوا کرتا تھا مسجد قرطبہ کے صحن کی طرح اِسے بھی "صحن نارنجستان" کہا جاتا ہے۔ سامنے کلیسا سان مارکو کا مینار ہے جس پر چڑھ کر گوئیل سروانتس اپنی محبوبہ کے آنگن میں تانک جھانک کیا کرتا تھا۔ قدیم القصر کو ایک بلند فصیل اپنے اندر چھپائے ہوئے تھی۔ ایک طرف سانتا کروز کا محلّہ تھا۔ پُل رنگ چاند کی سطح پر کسی گہرے کھڈ کی طرح شہر کی عمارتوں میں اُبھرا ہُوا تھا۔ گدلا وادی الکبیر سرخ چھتوں کے درمیان یوں سرکتا ہے جیسے خزاں رسیدہ پتّوں میں کوئی مٹیالا اور بوڑھا اژدہا رینگ رہا ہو۔ پُل سانتی مو کے پہلو میں "موروں کا مینار" کھڑا ہے جسے اس کی رنگت کی بنا پر سنہری مینار بھی کہا جاتا ہے۔ شہر کی عمارتوں سے پرے وسیع میدانوں کا ایک سلسلہ ہے جنھیں "الجراف" کہتے ہیں یعنی وہ سرزمینیں جو جیرالڈا کے مینار سے دکھائی دیتی ہیں۔ ان میدانوں میں بہترین نسل کے بیل اور گھوڑے پالے جاتے ہیں۔ جیرالڈا پر کھڑے ہو کر احساس ہوتا ہے کہ اشبیلیہ کو عکسوں کا شہر کیوں کہا جاتا ہے۔ آسمان کی نیلاہٹ، سرخ چھتیں، سفید دیواریں، سیاہ کلیسا، سبز زیتون اور گلابی..... نہیں! میری نظریں شہر کا طواف کرنے کے بعد بالکونی پر جھکی لڑکی تک آگئی تھیں جس کا سکرٹ ابھی تک پیراشوٹ کی طرح ہوا میں بلند تھا اور خوش نظر حضرات بہترزاویوں کی جستجو میں بار بار پہلو بدل رہے تھے۔

جیرالڈا سے اُتر کر نیچے چوک میں آیا تو یوں لگا جیسے جمبو جیٹ ہوائی جہاز پر سفر کر کے زمین پر قدم رکھا ہو۔ چوک میں غیر ملکی سیاحوں کی آمد و رفت ایک تسلسل سے جاری تھی۔ القصر سے نکل کر وہ کلیسا کے پیٹ میں اُتر جاتے اور پھر قویٰ کی مضبوطی کے تناسب سے کچھ جیرالڈا پیمائی پر کمر باندھتے اور بیشتر قہوہ خانوں کے باہر بیٹھ کر تصویریں اتارنے لگتے۔ میں نے کلیسا کے اندر جانے کا قصد کیا تو زرد زرد چوکیدار آڑے آیا۔

"ٹکٹ!"

"کاہے کا؟"

"کلیسا دیکھنے کا"

"کتنے کا؟"

"پچاس پسیتے"

"کیا دیکھنے میں ملے گا؟"

"کولمبس کی قبر۔ بادشاہ الفانسو کی قبر۔ اس کی ماں کی قبر۔ بادشاہ فرڈیننڈ کی قبر۔ پیٹر ظالم کی........"

"بہت بہت شکریہ۔ پھر کبھی سہی!"

کلیسا کیا ہوا اچھا خاصا گورستان ہو گیا۔ میں سڑک پار کر کے القصر کی جانب چلا گیا۔ معلوم ہُوا کہ بند ہو چکا ہے۔ اگلی صبح نو بجے کھُلے گا۔

سیئرپس سٹریٹ کے جدید ماحول میں یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ آپ ایک پُرانی تہذیب کے کھنڈروں میں سانس لے رہے ہیں۔ یہ تہذیب یہودیوں اور عربوں کے پُرانے محلے سانتا کروز میں زندہ تھی۔ میں اس تاریخی محلے کی پتھریلی اور خمدار گلیوں میں دیر تک بے مقصد گھومتا رہا۔ سرسبز پاتیوز میں تانک جھانک کی۔ قہوہ خانوں میں سے اُبلتی گٹاروں کی صدائیں سُنیں۔ چنبیلی کے دو گجرے خرید کر اُنھیں ہیپیوں کی طرح باہوں میں ڈالا اور پھر سستانے کی غرض سے ایک مختصر چوک کے درمیان ایک قدیم وضع کے کھمبے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میرے اُوپر ایک آہنی صلیب تھی اور پہلو میں ہسپانیہ کا مشہور مصور مور ریلو زیر زمین سوتا تھا۔ شام ہو رہی تھی۔ جیرالڈا کی اینٹوں پر شفق کی سرخی مدھم پڑتے پڑتے سیاہی میں بدلنے لگی۔ سانتا کروز کی گلیوں میں بکھرے چوکوں کے وسط میں لالٹینیں روشن ہو گئیں۔ کھجور کے پتّوں کے کٹاؤ میں سے روشنی جھانکتی تو چوک کے گول پتھروں پر عجیب نقش ظہور پذیر ہوتے۔ دیواروں کے سفید پس منظر میں بالکونیوں کے آہنی نقوش یوں واضح تھے جیسے کسی نے سفید کاغذ پر کوئلے سے تصویریں کھینچ دی ہوں۔ ایک سیاہ بگھی چوک میں داخل ہوئی اور سامنے گلی میں گُم ہو گئی۔

سایوں اور روشنیوں کے اس پُرسکون چوک میں بیٹھے وطن کی تانگ نے ایک مرتبہ پھر میری رُوح کو افسردگی کے جال میں لپیٹ لیا۔ گھر سے نکلے تو صرف اجنبی مناظر کی چاہت

آپ کے دل میں کہیں ہوتی ہے۔ وقت اور فاصلے بڑھتے ہیں تو اس چاہت کی شدت میں کمی ہوتی جاتی ہے اور اس کی جگہ اپنے گھر کی چار دیواری میں پھر سے مقیّد ہونے، بہن بھائیوں کے روزمرہ جھگڑوں اور دوستوں کے ساتھ بے جا اختلافات میں اُلجھنے کی خواہش سر اُٹھانے لگتی ہے۔ سیاح کے دل کے گرد وطن کی مٹی ایک ایسی گرہ لگا دیتی ہے جو فاصلوں کے بڑھنے سے مضبوط ہوتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ پھانس کی طرح چبھنے لگتی ہے۔ میں فاصلوں کو ختم کر کے اب اس گرہ کو کھول دینا چاہتا تھا۔ خیالات کا یہ سلسلہ جو لاہور اور اشبیلیہ کے درمیان پھیلا ہوا تھا ایک بے ہنگم مشینی آواز نے ریزہ ریزہ کر دیا اور اُسی لمحے سامنے کی تنگ گلی میں سے ایک بھاری بھرکم موٹر سائیکل معہ ایک لڑکھڑاتی ہوئی سائیڈ کار کے چوک میں داخل ہوگئی۔ ایک ادھیڑ عمر کا پتلا دُبلا شخص اس پر یوں بُت بنا بیٹھا تھا جیسے وہ بھی آج سے پچاس برس پیشتر اس موٹر سائیکل کے ساتھ ہی اسمبل ہوا تھا۔

موٹر سائیکل کی بوڑھی میم پاپ آرٹ کے نمونوں اور شوخ سائیکی ڈیلک رنگوں کی لالی لگاموں سے مزیّن تھی۔ اسے فٹ پاتھ پر پارک کرنے کے بعد بوڑھے نے سائڈ کار میں سے مشکیزہ نکال کر شراب کا ایک گھونٹ بھرا اور سگرٹ سلگا کر ایک نافہ زدہ اصیل مرغے کی طرح سینہ پھلا کر کھڑا ہو گیا۔ سگرٹ کے چند کش لگانے کے بعد اس نے بالکونی میں کھڑی لڑکیوں کی جانب ایک ہوائی بوسہ پھینکا اور پھر اکڑا ہوا میرے پاس چلا آیا۔

"سینور! مجھے بتایا گیا ہے کہ مرلو کی قبر کے نزدیک ایک قہوہ خانہ ہے جہاں اشبیلیہ کی بہترین شراب ملتی ہے اور اُندلس کی خوبصورت ترین رقاصہ ناچتی ہے۔"

"اگر مجھے اُس قہوہ خانے کے بارے میں علم ہوتا تو کیا میں اشبیلیہ میں اپنی پہلی شام اسی کھمبے کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا ہوتا؟" میں نے مسکرا کر کہا۔ مجھے معلوم تھا کہ سفر کے ان اُداس لمحوں میں کوئی نہ کوئی دلچسپ کردار ہمیشہ نازل ہو جایا کرتا ہے۔

"بہت خوب" وہ انتہائی مسرت آمیز لہجے میں بولا "گویا تم ہسپانوی نہیں ہو؟"

"نہیں! میں اشبیلیہ میں اجنبی ہوں۔"

"گویا تم ایک آوارہ گرد ہو کیونکہ روایت ہے کہ سانتا کروز میں ایک سو گیارہ چوک

ہیں۔ ہر چوک کے درمیان ایک ندیم لالٹین ہے اور ہر لالٹین کے سائے میں ایک آوارہ گرد بیٹھا رہتا ہے.....“

”یہ میرا پہلا چوک ہے۔“ میں نے اس کی حسِ مزاح سے لطف اندوز ہوتے ہوئے جواب دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اس کا مطلب ہے ابھی مجھے مزید ایک سو دس چوک بھگتانے ہیں۔“

”اور اس دوران شاید مطلوبہ قہوہ خانے کا سراغ بھی مل جائے...... میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں مگر اس سے پیشتر میرے پرندے سے مل لو۔“

میرا تجربہ ہے کہ امریکی چاہے اپنے ملک کا صدر ہو یا کسی ہوٹل کا بیرا پارٹ ٹائم مسخرہ ضرور ہوتا ہے اور یہ حسِ لطیف ہمارے ہاں کی طرح تیس سال کی عمر کے بعد خود ساختہ بزرگی کے کفن میں دفنا نہیں دی جاتی بلکہ عمر کے ساتھ ساتھ اس کی شرح میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک قہقہے لگاتے قبر میں اتر جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ حضرت بھی عمر کے اس حصے میں پہنچ چکے تھے جہاں وہ اب پارٹ ٹائم کی بجائے فل ٹائم مسخرے تھے۔

”میرے پرندے سے ملو“ اس نے فٹ پاتھ پر کھڑی عجوبہ موٹر سائیکل کو پیار سے دیکھا۔ تعارف سے فارغ ہو کر اس نے سائڈ کار میں سے مشکیزہ نکالا۔ سانس اندر کو کھینچا اور اس عمل سے پیدا ہونے والے خلا کو شراب سے لبریز کر دیا۔ اس کا تمتماتا چہرہ گواہی دیتا تھا کہ بقول منٹو حلق سے اترنے کے بعد شراب ہر سو ”انقلاب زندہ باد“ لکھتی چلی جاتی ہے۔ منٹو ہسپانیہ میں ہوتا تو شرپسند ہونے کے جرم میں دھر لیا جاتا کہ ڈکٹیٹر شپ کی موجودگی میں یہ ممنوعہ الفاظ منہ سے ہی نہیں پیٹ سے بھی ادا کرنے پر پابندی عائد ہے۔

”سانتا کروز کی بھول بھلیوں میں پرندے پر بیٹھ کر گھوما جائے یا پیدل؟“ میں نے پرندے کی چنگھاڑ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے صلاح دی کہ اسے فی الحال سستانے کا موقع دینا چاہیے۔

”جانِ من!“ اس نے مڈگارڈ کو پیار سے تھپکا ”ہم ابھی آتے ہیں۔“

قدامت کی خوبصورتی میں ڈوبی سانتا کروز کی گلیوں کے نام مقامی کہاوتوں سے اخذ کیے گئے ہیں۔ ”دیدا“ یعنی زندگی۔ ”اگوا“ یا نی۔ ”گوریا“ عظمت۔ ”آنا ؤد“ کفن اور ”پمی انتا“ یعنی سرخ مرچ وغیرہ۔ ہمارا گذر کا لیے سوزانا سے بھی ہوا جو اس یہودی عورت کے نام سے موسوم ہے جس نے وصیت کی تھی کہ

موت کے بعد اُس کی لاش مکان کی چوکھٹ پر رکھ دی جائے" تاکہ مر کے رُسوا ہو کر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر سکے۔ راہبہ نفر لیبا نے ان گلیوں کے حسن سے متاثر ہو کر کہا تھا "یہ جو لوگ اتنے خوبصورت شہر میں پاکیزہ رہتے ہیں، کمال کرتے ہیں"

بقیہ شب گذارنے کے لیے ہم جس پُر شور قہوہ خانے میں داخل ہوئے وہاں کمال کرنے کے مواقع خاصے ناتواں تھے۔ راہبہ نفر لیبا سے معذرت کے بعد ہم نے کمال کرنے کو کسی اور شب پر اُٹھا دیا...... شُوں شُوں کرتی بُلبلے چھوڑتی شمپئن کے بعد ہم ایک دوسرے سے تفصیلی طور پر متعارف ہوئے "پینتیس سال تک میں نے ڈیٹرائٹ کی فیکٹریوں میں غلاموں کی طرح لوہا کوٹا ہے" اُس نے اپنے کھُردرے ہاتھ میز پر جما کر کہا "غلامی کے دور میں شادی کی اور بچے پیدا کیے۔ دو سال پیشتر میرا لڑکا ویت نام کے جنگلوں میں اپنے ہی طیارے سے گرائے ہوئے نیپام بم کی زد میں آکر راکھ ہو گیا۔ پچھلے برس میری بیٹی نے اپنی یونیورسٹی کے لان کو اپنے خون سے سُرخ کیا۔ وہ ویت نام کی جنگ کے خلاف احتجاج کر رہی تھی کہ نیشنل گارڈز نے اُسے ہلاک کر ڈالا اور پھر میری بیوی نے صرف اس بناء پر مجھ سے طلاق حاصل کر لی کہ میں اپنے مرے ہوئے بچوں کو تو بہت یاد کرتا ہوں مگر اُس کے زندہ جسم کا دھیان نہیں کرتا۔ طلاق کے بے پناہ اخراجات کے بعد میں نے اپنی بقیہ جمع شدہ پُونجی سے حصص خرید لیے جن سے مجھے اتنی آمدن ہو جاتی ہے کہ میں اور میرا پرندہ گرمیوں کے چھ ماہ یورپ کے طول و عرض میں آوارہ گردی کر سکتے ہیں۔ سردیاں یونان کے جزیرے مکناس کے ایک جھونپڑے میں گذر جاتی ہیں"

"مجھے افسوس ہے!"

"ہا" اُس نے ہاتھ جھٹک کر کہا "یہ زندگی ہے...... بس کمبخت بدقسمتی......"

"اشبیلیہ میں آئے ہوئے آپ کو کتنے روز ہوئے۔؟" میں نے موضوع بدلنے کی خاطر پوچھا۔

"ابھی آیا ہوں"

"اور کب تک......"

"آج شب ہی چلا جاؤں گا" اُس نے لاپروائی سے کہا۔

"کہاں ؟"

"پتہ نہیں..... "اُس نے میز بجا کر کہا" پرندے پر منحصر ہے۔ جدھر لے جائے۔"

"آؤچ" قریب سے گذرتی نوجوان وٹیرس نے ٹرے کو ایک ہاتھ پر معلق کرکے مجھ پر گھونسا تان لیا۔ "شرم نہیں آتی۔"

"مگر سینیورتیا..... "میں بوکھلا گیا۔

"کیا بات ہے بیٹی ؟" اس نے وٹیرس کی کمر پر دستِ شفقت پھیر کر پوچھا۔

"اس ..... سینیور نے ..... چٹکی کاٹی ہے۔" وہ غصّے سے کانپ کر بولی۔

"کوئی بات نہیں جوان خون ہے" دستِ شفقت کمر سے پھسل کر جائے واردات تک پہنچنے کو تھا کہ وٹیرس بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔

"لیکن میں نے تو ....."

"تم نے نہیں ..... میں نے کاٹی تھی۔" اس نے ہنستے ہوئے تیسری بوتل کا تار مروڑ کر کارک اُڑا دیا۔ "اس کمبخت نے اگر لباس کے نیچے کچھ پہن رکھا ہوتا تو یوں نہ چیختی ورنہ اس قسم کے قہوہ خانوں کی وٹیرسوں کے لیے یہ چٹکیاں صرف پروفیشنل ہیزرڈ ہوتی ہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ اُف تک نہیں کرتیں۔"

اب بارے اس قہوہ خانے کے کچھ بیان ہو جائے گرچہ ایک مرتبہ پھر یہ ذمہ داری ہم قاضی ولی محمد کے ناتواں کندھوں پر ڈالے دیتے ہیں۔ انھوں نے اشبیلیہ کے محلہ سینٹ ماریہ کے قہوہ خانے "نوی داد" کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔" وہ پھر مجھے لے چلا وہیں دیکھو۔ دل خانہ خراب کی باتیں .... قہوہ خانہ گرم تھا۔ امریکہ کے سیاح۔ فرانس کے بے فکرے۔ انگلستان کے غیور۔ (قاضی صاحب کی نکتہ گیری بحق سرکارِ انگریزی) اسپین کے جھلانجے ہوئے تھے۔ ایک مغنیہ زرق البھڑک لباس پہنے سر پر اوڑھنی ڈالے مصروفِ ترنم تھی۔ تین چار سازندے ہمنوا سارنگی (غالباً گٹار) اور دف بجا رہے تھے۔ کبھی کبھی سب مل کر اہلِ ہند کی طرح تالی بجاتے تھے جو کسی قدر بھلی معلوم ہوتی تھی۔ ہر شخص کے پاس اس کے مذاق کے موافق

قہوہ۔شراب وغیرہ کی تھالیاں رکھی تھیں۔میرے لیے یہ بالکل نیا تماشہ تھا اور گو سمجھ خاک نہ آیا لیکن دلکش آواز۔مشرقی لباس اور مشرقی انداز نے بالکل مسحور کرلیا تھا۔میں تو بے خود تھا۔ ½ ۱۱ بجے واپس ہوٹل پہنچا۔"

اس قہوہ خانے میں بھی وہ تمام تر حشر سامانیاں موجود تھیں جن کا شکار قاضی صاحب قہوہ خانہ "لوی واد" میں ہوئے۔البتہ مغنّیہ کسی ہسپانوی گیت کی بجائے بیٹلز کا کوئی نغمہ "یاہ یاہ" کے نعرے بلند کرتی الاپ رہی تھی۔اور جو کچھ مٹک سکتا تھا اُسے ہمہ تن مٹکانے میں مصروف تھی۔رات دو بجے ہم باہر نکلے تو میرے ساتھی نے اعلان کر دیا کہ اسے اپنے پرندے کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ اب وہ خود ایک پرندہ تھا۔ذہنی طور پر تو وہ یقیناً فضائے بسیط میں محو پرواز تھا مگر جسمانی طور پر وہ میرے سہارے کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہ چل سکتا تھا۔اس نے پتلون کی دونوں جیبوں میں شیمپئن کی بوتلیں اُڑس رکھی تھیں۔

ہم واپس چوک میں پہنچے تو ہر سُو خاموشی تھی۔ایک بوڑھا موریلو کی قبر پر جھکا موم بتیاں روشن کر رہا تھا۔موٹر سائیکل سٹارٹ ہوئی تو گڑگڑاہٹ کی پہلی ضرب سے ہی خاموشی چُور چُور ہو کر بکھر گئی۔

"اب کدھر کا ارادہ ہے؟"

"میرے لیے تمام راہیں ایک سی ہیں۔" وہ بچوں کی طرح ہنس دیا۔"میں سنگ میل پڑھ کر سفر نہیں کرتا۔"

"کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ آپ خمار کی حالت میں ڈرائیونگ نہ کریں۔صبح تک اشبیلیہ میں ٹھہر جائیے اور......"

"صبح تک؟" اس کا تمتماتا چہرہ زرد پڑ گیا۔"اب سے صبح تک کے جمود کا عذاب کون سہے گا؟"

"سفر بخیر۔" میں نے ہاتھ آگے کر دیا۔

اُس نے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور مجھے اپنی جانب کھینچ کر کان میں کہنے لگا۔"ایک راز

کی بات بتاؤں؟ .... اُس ویٹریس کو معلوم تھا کہ چُٹکی تم نے نہیں میں نے کاٹی تھی.... اور اسی لیے وُہ تم سے خفا تھی۔"

موٹر سائیکل چوک سے باہر نکلی تو خاموشی ایک ایسے پرندے کی مانند چُپکے سے واپس لَوٹ آئی جو کسی دھماکے سے خوفزدہ ہو کر تھوڑی دیر کے لیے اپنے گھونسلے سے اُڑ جاتا ہے۔

بادشاہ، بیگم اور غلام

سانتاکروز سے نکلا تو وہاں رت جگا تھا اور پارک ماریا میں پہنچا، جہاں صرف رات تھی، سناٹا تھا، گھنے درختوں تلے بس سٹاپ کی انتظار گاہ میں صرف دو مسافر تھے۔ ایک تاریک کونے میں بچھے، بدن کے سفر میں محو، دوئی ختم کرنے کے درپے۔ میں قریبی بینچ پر بیٹھنے کو تھا کہ لڑکے نے منمناتے ہوئے اطلاع کی کہ "تم اپنا وقت ضائع کرو گے۔ آخری بس پچھلے دو گھنٹے سے جا چکی ہے۔" اور دوبارہ مائل سفر ہو گیا۔ میں پارک ماریا کے تناور درختوں کے سائے میں اپنا رستہ محسوس کرتا ہوا وادی الکبیر کے کنارے تک آ گیا۔ کیمپنگ یہاں سے قریباً دس میل کے فاصلے پر تھی۔ اگر وہاں تک پیدل جانے کا بھی قصد کر لیتا تو بھی پہنچتے پہنچتے صبح ہو جاتی۔ ٹاور دے مورو کے پہلو میں سے ایک پگڈنڈی دریا کی سطح تک جاتی تھی۔ میں اپنے بوجھل قدم گھسیٹتا نیچے اترا، اور بقیہ شب بسر کرنے کی خاطر نیم خنک ریت پر لیٹ گیا۔ میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگتیں تو یوں لگتا کہ اشبیلیہ کا آسمان قریب آ کر میرے ہونٹوں کو چھو رہا ہے۔ آنکھیں کھولتا تو یکدم سرمئی نیلاہٹ بلند ہوتی چلی جاتی۔ میرے پہلو میں لیٹے وادی الکبیر کی سطح ہوا کی غیر موجودگی میں بالکل پرسکون تھی۔ ایک لہر بھی نہ تھی۔ کوئی ایسی لہر جسے کسی بہادر کی ذرّہ بکتر سے تشبیہہ دی جاسکتی۔

ایک شب اشبیلیہ کا معتمد اور اس کا شاعر دوست ابنِ عمّار بھیس بدلے چاندنی چوک میں جاری "پاسیو" میں شامل ہیں۔ آج کی طرح اس شب یوں گم سم سناٹا نہ تھا۔ دبی دبی ہنسی، قدموں کی چاپ۔ ٹوریا کے پاسیو کی طرح۔ خوشگوار ہوا کے جھونکے وادی الکبیر کی سطح پر ہلکی

لہروں کو جنم دے رہے ہیں معتمد لہروں کے اس جال کو دیکھ کر فی البدیہہ کہتا ہے۔

ے بادِ نسیم کے جھونکوں سے موجیں ذرہ بکتر کی طرح اُبھر رہی ہیں۔

ابن عمّار ابھی شعر مکمل کرنے کی خاطر دوسرے مصرعے کی تلاش میں ذہن پر زور دے رہا ہے کہ لبِ دریا کپڑے دھوتی ہوئی ایک حسین عورت متوجہ ہوئے بغیر کہہ دیتی ہے:

"اگر یہ موجیں منجمد ہو جائیں تو ایک بہادر کے لیے کیا خوب ذرّہ بن جائے"

معتمد اس فی البدیہہ مصرعے پر پھڑک اُٹھتا ہے اور اپنے خواجہ سرا کو حکم دیتا ہے کہ اس عورت کو القصر میں پیش کیا جائے۔ حسب نسب دریافت کرنے پر وہ کہتی ہے،

"میں رمیک کی لونڈی ہوں۔ رمیکیہ کے نام سے مشہور ہوں اور خچر ہانکنا میرا کام ہے۔"

معتمد رمیکیہ کو خرید کر اپنے عقد میں لے لیتا ہے۔

شاہِ اشبیلیہ معتمد۔ رمیکیہ اور ابن عمّار ایک تاریخی مثلث کی ایسی تین فصیلیں جنھیں جذبۂ حسد اور ہوسِ اقتدار نے یوں دھکیلا کہ درمیان میں بسا اشبیلیہ ان کے تصادم میں پس کر رہ گیا۔ معتمد احسن پرست، شراب و شعر کا دلدادہ مگر میدانِ جنگ میں بے پایاں شجاعت کا مالک۔ حسن و شعر کا مرقع رمیکیہ اسے وادی الکبیر کے کنارے کپڑے دھوتی ہوئی ملی اور شراب و شعر کا ساتھی ابنِ عمّار ولبا کے دُور افتادہ صوبے میں۔

گیارہ برس کی عمر میں شہزادہ معتمد صوبۂ ولبا کا گورنر مقرر ہوتا ہے۔ ایک گرد آلود پگڈنڈی پر ایک شخص خچر پر سوار، پھٹی پرانی قبا اوڑھے، سر پر میلی کچیلی ٹوپی چپکائے، اپنے شعر ترنّم سے پڑھتا جھومتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ اس کی مسرّت کا باعث جَو سے بھرا وہ توڑا ہے جو ایک مقامی امیر نے اسے قصیدہ کہنے پر خچر کے لیے عطا کیا ہے۔ معتمد اس سے ہم کلام ہوتا ہے اور ہر سوال کا جواب نہایت بلند پایہ اشعار کی صورت میں پاتا ہے۔ یہ ابن عمّار تھا۔ نوعمری کے باوجود معتمد اور ابن عمّار کی طویل دوستی میں بیک وقت نفرت اور محبّت کے شدید جذبے اُبھرتے نظر آتے ہیں۔ اُن کی حزن آمیز رفاقت کی داستانیں اُندلسی لوک گیتوں میں ڈھل چکی ہیں۔

معتمد نے اپنے باپ معتضد کی وفات پر تخت نشین ہوتے ہی اپنے دوست کو اسی صوبے میں بطور گورنر روانہ کر دیا جہاں وہ چند برس پیشتر خچر پر سوار اپنے شعر سنا کر بھیک مانگا کرتا تھا۔ ابن عمار نے عہدہ سنبھالتے ہی چاندی سے بھرا ہوا وہ توڑا اس امیر کو روانہ کیا جس نے اسے خچر کے لیے جَو فراہم کیے تھے۔" اگر اس روز مجھے جَو کی بجائے گندم سے نوازتے تو آج یہ توڑا چاندی کی بجائے سونے سے بھرا ہوتا۔ اُدھر معتمد زیادہ عرصہ اپنے دوست کی جدائی برداشت نہ کر سکا۔ اسے اشبیلیہ واپس بلا کر اپنا وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ اور ربوں القصر کی شامیں اس کے اشعار اور رمیکیہ کے قہقہوں سے نکھرنے لگیں۔ ایک ایسی ہی شب محفلِ شعر و نغمہ برپا ہوئی۔ کثرتِ مے نوشی کے باعث دونوں دوست وہیں فرش پر سو گئے۔ ابن عمار کو خواب میں ایک آواز نے خبردار کیا: "اے نامراد تیری موت معتمد کے ہاتھوں لکھی ہے۔" وہ خوف زدہ ہو کر اٹھا، قصر سے بھاگ جانے کا ارادہ کیا مگر تمام دروازے بند تھے، چنانچہ ایک قالین اپنے گرد لپیٹ کر ایک کونے میں چھپ گیا۔ معتمد کی آنکھ کھلی، تو دوست پہلو میں نہ تھا۔ تلاش کیا تو صدر دروازے کے ساتھ قالین میں لپٹا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ معتمد ہنس ہنس کر بے حال ہو گیا۔ ابن عمار نے اپنا خواب سنایا تو اسے گلے لگا کر چوما، تسلی دی اور دوستی کے واسطے دے کر واپس لے آیا۔

کچھ عرصہ بعد معتمد کے حکم پر ابن عمار نے مرسیہ کا محاصرہ کر لیا۔ فتح کے بعد شہر میں پورے جاہ و جلال سے داخل ہوا۔ تخت پر بیٹھ کر معتمد جیسی عبا اوڑھی اور اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ دوستی کے ناطے یوں توڑے کہ معتمد کی ایک ایسی ہجو لکھی جس میں رمیکیہ کے بارے میں نہایت نامناسب الفاظ تھے، یہ ہجو اب بھی ابن عمار کا شعری شاہکار گردانی جاتی ہے۔ ایک مہم کے دوران بدقسمتی سے ابن عمار ایک عرب سردار کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ معتمد نے جسے اپنے دوست کی بے وفائی پر بے حد قلق ہوا تھا منہ مانگی رقم ادا کر کے اسے خرید لیا۔ ابن عمار شہر میں یوں داخل ہوا کہ ایک گدھے پر بھوسہ لدا ہوا ہے اور وہ اس کے درمیان سر جھکائے بیٹھا ہے۔ قید خانے میں اس نے دربان کی منت سماجت کر کے وو کاغذ حاصل کیے۔ ایک پر اپنے محسن کی شان میں ایک شاندار قصیدہ لکھ کر معتمد کو روانہ کیا اور دوسری تحریر

ایک نواحی حکمران کے نام تھی کہ آؤ اشبیلیہ پر حملہ کر دیں معتمد کے خلاف تمہاری مدد کر دوں گا بدقسمتی سے قاصد پکڑا گیا۔ دونوں تحریریں معتمد تک پہنچیں۔ پہلے قصیدہ پڑھا تو پرانی رفاقتوں کی خوشبو نے اُسے موم کر دیا اور ابن عمار کو رہا کر دینے کا ارادہ کر لیا۔ دوسرا خط دیکھا تو اس پر غداری کے سیاہ لفظ بچھوؤں کی طرح رینگ رہے تھے۔ معتمد میں باپ کی سفاکی اُبھر آئی۔ لیون کا بنا ہوا ایک وزنی تبر اُٹھایا اور قید خانے کی جانب دوڑتا ہوا گیا۔ ابن عمار معتمد کی سُرخ آنکھیں دیکھ کر لرزنے لگا۔ سمجھ گیا کہ موت کا وقت قریب ہے بیڑیوں کو گھسیٹتا ہُوا آگے بڑھا اور قدموں میں گر کر پاؤں چُومنے لگا۔ معتمد نے پاؤں سے ٹھوکر ماری اور ابن عمار کے سر پر تبر کا وار کیا۔ اس کا بھیجا باہر نکل پڑا مگر معتمد کا ہاتھ نہ رُکا یہاں تک کہ تبر کا دستہ سر میں اُلجھ گیا۔ رمیکیہ نے ہنس کر کہا "بس کرو معتمد۔ دیکھو! ابن عمار ہُد ہُد بن گیا ہے"۔ کھوپڑی اور اس میں اُلجھے ہوئے تبر کو ہُد ہُد سے تشبیہہ دینا عربی شعریت کی ایک بھیانک مثال ہے۔ ابن عمار کا خواب سچ ثابت ہُوا۔

عربوں کے عہد میں اندلس کے قابلِ ذکر شہروں میں امیر یا بادشاہ کی رہائش گاہ کو القصر کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ آج بھی ہسپانیہ کے اکثر بڑے شہروں میں ان عمارتوں کے کھنڈر موجود ہیں اور چند ایک جو استبدادِ زمانہ کے ہاتھوں کسی طور محفوظ رہیں اب بھی اَل یا القصر ہی کہلاتی ہیں۔ ہسپانوی خانہ جنگی کی سب سے مشہور جنگ ٹولیڈو کے القصر میں لڑی گئی تھی۔ اشبیلیہ میں معتمد کا القصر رمیکیہ کی طرح حسین اور ابن عمار کے شعروں کی مانند دُھنوں کا حامل تھا۔ مگر اقدار پر اندھا دھند یقین رکھنے والے ناشقین نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور یہ قصر کھنڈر ہو گیا۔ مسلمانوں کے اخراج کے بعد پادرو ظالم نے اس کی بنیادوں سے ایک اور محل کی عمارت اُٹھائی جس میں تباہ شدہ مدینۃ الزہرہ کا ملبہ استعمال ہوا، اور اسی لیے جگہ جگہ ستونوں اور چوکھٹوں پر عربی اشعار خزاں رسیدہ پتوں کی طرح بکھرے نظر آتے ہیں۔ معتمد کے محل کا صرف ایک حصّہ پاتیو دل یاسو کی صورت میں اپنے گم گشتہ حُسن کی نشانیاں دیتا ہے۔ وادی الکبیر کے کنارے شب بسری کے بعد

جب میں دوسری صبح القصر کی چار دیواری کے اندر داخل ہوا تو شکستہ فصیل سے لپٹی پیگن ولیا بیلیں ہلکی اوس میں بھیگی ہوئی تھیں۔ بائیں باغ کے سرسبز قطعوں اور پھولوں کی کیاریوں پر دھند کی دبیز چادر دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ کھجور کے درخت اُس حمام کے کھنڈرات کے گرد اندھے گواہوں کی طرح لاچار کھڑے تھے جس میں معتمد نے ساٹھ بربر سرداروں بند کر کے بھاپ کے جہنم میں بھون ڈالا تھا۔ انہی روشوں کے گرد اِن سرداروں کے سَر ں میں سجا کر رکھے گئے تھے۔ بائیں جانب وہ گلی ہے جس میں رمیکیہ نے بارش کے بعد بدّو عورت کو کیچڑ میں لباس گھٹنوں کے اُوپر سمیٹ کر چلتے دیکھا تو معتمد سے شکایت کی "یہ کیسا القصر ہے جہاں میں کیچڑ میں بھی نہیں چل سکتی۔" دیوانِ خاص کے صحن میں خوشبودار مٹی کے ڈھیروں پر گلاب اور چنبیلی کا عطر چھڑک کر گارا بنایا گیا اور رمیکیہ نے اپنی سہیلیوں کے ہمراہ اس معطر کیچڑ میں اُتر کر اپنی حسرت پوری کی۔ القصر اُن عمارتوں سے نہیں ہے جو آپ کے لیے مسرّت کے لمحے تخلیق کرتی ہیں بلکہ اس میں چلتے ہوئے دم احساس ہوتا ہے کہ آپ کسی کھنڈر میں چلے آئے ہیں اور کوئی آپ کا پیچھا کر رہا ہے۔ تاریک خواب گاہ میں جھانکتے سے خوف آتا ہے۔ رمیکیہ یہاں محوِ خواب تھی۔ جھروکوں میں سائے سمٹتے ہیں کہ یہاں رمیکیہ جلوہ آرا ہوتی تھی۔ بائیں باغ کی روشوں کے گرد سجے گملوں میں سے خوبصورتی کی بجائے خوف کی کونپلیں پھوٹتی نظر آتی ہیں۔ اُبھری ہوئی ہر سطح پر ابن عمار کی قبر کا گمان ہوتا ہے کہ وہ شاعر کھوپڑی میں پیوست تبر سمیت القصر میں ہی کہیں دفن ہے۔ میں صدر دروازے سے باہر آنے سے پیشتر قدیم فصیل کے سامنے میں رُکا جسے مسمار کر کے مرابطین اس قصر میں داخل ہوئے۔

اِدھر معتمد رمیکیہ کی ناز برداریوں میں مصروف تھا اور اُدھر عیسائی حکمران الفانسو کی فوا ج اشبیلیہ کے دروازوں تک پہنچ گئیں۔ معتمد نے ایک قاصد افریقہ کے گورنر یوسف ن تاشفین کو بھیجا اور مدد کا خواستگار ہوا۔ وزیر اعظم نے اس اقدام کی شدید مخالفت "تاشفین عیسائیوں کو شکست دے کر افریقہ واپس نہیں جائے گا۔ وہ ہمیں ہمارے صروں سے نکال دے گا اور سلطنتوں پر قابض ہو جائے گا۔" معتمد نے جواب دیا "میں

افریقہ میں اونٹ چرانے کو قشتالیہ میں سوروں کو ہانکنے پر ترجیح دوں گا" ۱۰۸۶ء میں میدانِ زلاقہ میں معتمد اور تاشفین الفانسو کے سامنے آئے۔ الفانسو نے اپنی عظیم فوج دیکھ کر کہا "میں جیالے جوانوں کی یہ فوج شیطانوں، فرشتوں اور بھوتوں کو بھی شکست دے سکتی ہے" وہ انسانوں کا ذکر بھول گیا اور شکست کھا گیا۔ تاشفین معتمد کے لرزتے ہوئے تخت کو الفانسو کی شکست کا عارضی سہارا دے کر واپس افریقہ چلا گیا۔

معتمد اور رمیکیہ ایک مرتبہ پھر دنیا و مافیہا سے بے خبر شراب و شعر کی دنیا میں ڈوب گئے۔ اندلس کے فقیہوں نے رمیکیہ کے خلاف فتوے دے دیا کہ تمام تر آفتوں کی ذمہ دار یہ عورت ہے جو معتمد کو شراب نوشی اور عیاشی کی جانب مائل کرتی ہے۔ امام غزالیؒ نے بھی اس فتوے سے اتفاق کیا۔ جنگِ زلاقہ کو چودہ برس گذر چکے تھے۔ عیسائیوں کی قوت کی لہر جسے تاشفین نے پیچھے دھکیل دیا تھا، اب پھر پورے زور شور سے اشبیلیہ کی دیواروں سے ٹکرانے لگی۔ تاشفین ایک مرتبہ پھر افریقہ سے نکلا مگر اس بار مدد کی درخواست معتمد کی جانب سے نہیں بلکہ اندلس کے فقیہوں کی طرف سے روانہ کی گئی جو چاہتے تھے کہ وہ باہم برسرِپیکار مسلمان ریاستوں کو ختم کر کے ایک عظیم تر اندلس کی بنیاد رکھے۔ مرابطین نے وادیٔ الکبیر میں لنگر انداز شاہی بیڑے کو آگ لگا دی اور اشبیلیہ کی فصیل میں نقب لگا کر شہر کے اندر داخل ہو گئے۔ معتمد زرہ بکتر کے بغیر تلوار سونتے مقابلے کے لیے نکل آیا۔ ایک مرابطی کا نیزہ اس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ معتمد نے ایک ہاتھ سے نیزے کو تھاما اور دوسرے سے تلوار کا ایک بھرپور وار کر کے مرابطی کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ اشبیلیہ کے معتمد کی شجاعت پانسا پلٹنے کو تھی کہ سیر ابن ابوبکر نے تازہ دم فوج کے ساتھ شہر پر دھاوا بول دیا۔ تمام عمارتوں کو آگ لگا دی گئی اور ہر طرف لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا۔ مرابطین نے اہلِ اشبیلیہ کے کپڑے تک اتروا لیے۔ معتمد القصر میں واپس آیا تو بیگمات رو رہی تھیں۔ دوست سمجھاتے تھے کہ اطاعت قبول کر لو مگر معتمد اس لمحے میں بھی سر ہلاتا تھا اور شعر پڑھتا تھا "میں شکست نہیں کھا سکتا، میں نے زرہ بکتر کے بغیر جنگ لڑی ہے" اتنی دیر میں مرابطین فصیل مسمار کر کے القصر کے اندر گھس آئے اور آگ لگا دی۔ تاشفین نے معتمد کو گرفتار کر کے ملک بدر کر دیا۔ جب

یا بجولاں طنجہ کی جانب لے جایا جا رہا تھا تو راستے میں ایک انبوہِ کثیر بارش کی دُعا مانگنے کے لیے مسجد کی جانب رواں تھا۔ معتمد نے کہا:

"جب لوگ بارش کی دُعا مانگنے والے تھے۔ مجھے ملے تو میں نے کہا کہ میرے آنسو مینہ کی جھڑی کا کام دے سکتے ہیں۔ لوگوں نے جواب دیا یہ تو درست ہے کہ آپ کے آنسو ضرور کافی ہوں گے لیکن مشکل یہ ہے کہ ان میں خون ملا ہُوا ہے۔"

"سیرا موریناً" کا کالا پہاڑ دیکھ کر رو دینے والی رمیکیہ اب معتمد کے ہمراہ ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں قید تھی۔ وہ اپنے خاوند کا پیٹ بھرنے کی خاطر سارا دن سُوت کاتتی اور شام کو اُس کی بیٹیاں بازار جا کر اسے بیچ آتیں۔ تاشفین کے حکم سے معتمد کے ہاتھ پاؤں کبھی تو بیڑیوں سے جکڑ دیئے جاتے اور کبھی اُسے آزاد کر دیا جاتا۔ ایک روز اس نے قید خانے کے سوراخ میں سے پرندوں کا ایک غول پرواز کرتے دیکھا۔

"اے کاش مجھے کوئی یقین دلاتا کہ میں اپنے باغ اور بحیرے پھر دیکھوں گا جو اس ملک میں ہیں جہاں زیتون کا درخت اُگتا ہے۔ جہاں قمریوں کی کُوکُو اور طیورِ خوش سخن کے نغمے سُنے جاتے ہیں۔"

اشبیلیہ کا معتمد قیدِ حیات سے آزاد ہُوا تو نمازِ جنازہ کے لیے نمازی نہ ملے۔ لوگوں کو آواز دی جاتی تھی کہ آؤ ایک مسافرِ بے وطن کی نماز پڑھ لو۔

"کسی اور بادشاہ کو قوم اتنا نہیں روئی جتنا معتمد علی اللہ کو روئی اور رونا روئی کہ دوسروں پر گمنامی کا اندھیرا چھا دیا اور اس رونے میں حزن و ملال تھا جو پھول کو آخری بار کھلتے دیکھنے یا موسمِ خزاں کے آخری ساکت و خاموش دنوں کو یا غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی آخری کرنوں کو دیکھ کر ہوتا ہے۔"

قدیم قرمونہ

اشبلیہ کیمپنگ کی مختلف راحتوں نے جن میں نہانے کا تالاب اور اس میں اچھلتی متناسب اور زان مخلوق سرِ فہرست تھیں مجھے انتہائی کاہل الوجود بنا دیا۔ ہر شب مصمّم ارادہ کرتا کہ اگلی صبح بہر صورت غرناطہ روانہ ہو جاؤں گا۔ صبح اُٹھ کر بڑے اہتمام سے شیو بنا تا، تالاب میں ڈبکی لگانے کے بعد کنارے پر نقشہ پھیلا کر غرناطہ جانے کے لیے راستے کا تعیّن کرنے لگتا اور پھر تالاب کے پانیوں میں اپنے بدن کی مہک گھولتی کوئی خاتون میرے قریب آ بیٹھتی "کیا میں تمھارے قریب لیٹ جاؤں۔ آج دھوپ کتنی خوشگوار ہے" اور یوں وہ میرے نقشے اور روانگی کے ارادوں پر اپنے جسم سے نچڑتا ہُوا پانی پھیر دیتی۔ میں حرکت سے منہ پھیر کر اشبلیہ کے مہربان سورج کی شعاعوں سے نرم آسودگی میں بھیگتا وہیں گھاس پر لیٹ کر اونگھنے لگتا۔ ایک خصوصی حیوانی حس کے تحت اس کے خشک ہوتے ہوئے بدن سے اُٹھنے والی بُو فوراً خبر کر دیتی کہ محترمہ صرف دھوپ میں بدن سینکنے کی خاطر ہی یہاں لیٹی ہیں یا اس وقت ان کی حیوانی حس بھی میری سطح پر کام کر رہی ہے اور انھیں باآسانی "پچھلے پہر قریبی زیتون کے باغ میں پکنک کے لیے مدعو کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے درختوں کی طرح زیتون کے درخت بھی کم از کم اس دنیا میں منہ میں زبان نہیں رکھتے۔

ایک صبح کاہل الوجودی کے ایک ایسے لمحے میں جب میں سومنگ کاسٹیوم پہنے تالاب کے کنارے اوندھا لیٹا بیداری اور نیند کے درمیانی مراحل میں جُھول رہا تھا مجھے یک دم قرطبہ اور اشبیلیہ کے درمیان پڑتے ہوئے اس قصبے کا خیال آ گیا جس کی شکستہ فصیل میں سے اُٹھتا ہُوا ایک

قدیم عربی دروازہ دُور سے آسمان کی وسعتوں میں معلق لگتا تھا۔ میں نے فوراً بھیگے ہوئے نقشے کو اپنے سامنے پھیلا یا۔ قرطبہ سے اشبیلیہ آنے والی سڑک کے درمیان صرف ایک نام تھا۔ قرمونہ!....... ایک جانا پہچانا نام....... جو قرطبہ۔ اشبیلیہ اور غرناطہ ایسے بھانبھڑوں نکلے میرے ذہن کے کسی نہاں خانے میں کسی بجھتے ہوئے اُپلے کی طرح دُھواں دے رہا تھا....... قرمونہ!... امیر عبدالرحمٰن .... خلیفہ منصور....... محاصرۂ العلا....... تاریخ کی زنگ آلود کڑیاں ایک ایک کرکے آپس میں پیوست ہوتی چلی گئیں۔ اُموی شہزادہ عبدالرحمٰن فرات اور اطلس کے درمیان عباسیوں کے ...ہ جھنڈوں کی تاریک موت سے فرار ہو کر اندلس میں وارد ہُوا اور دمشق میں سے اُکھاڑ دیئے جانے والے بنواُمیہ کے تناور درخت کی جڑوں کو اندلس کی زرخیز مٹی سے ڈھانپ دیا۔ اُموی ... الرحمٰن عباسی خلیفہ المنصور کے ذہن پر ایک بھیانک خواب کی طرح مسلط ہو گیا۔ اس نے بنواُمیہ کے اکلوتے شہزادے کو قتل کرنے کے لیے بن مغیث کی سرکردگی میں ایک لشکر اندلس روانہ کیا۔ بن مغیث ... شہروں کو زیر کرتا قرمونہ کی فصیلوں تک پہنچ گیا اور شہر کو گھیرے میں لے لیا۔ اُس کا شکار عبدالرحمٰن ... مونہ کے القصر میں محصور تھا۔ یہ محاصرہ جو العلا کے نام سے تاریخ میں آیا دو ماہ تک جاری رہا۔ ... قرمونہ کے بلند قصبے کے گرد میدانوں میں آگ لگا دی گئی۔ فرار کے تمام راستے مسدود ہو گئے۔ بن مغیث کو یقین تھا کہ بھوک سے نڈھال ہو کر عبدالرحمٰن اور اس کے چند ساتھی ہتھیار ڈال دیں گے۔ وہ انتظار کر سکتا تھا۔ ایک شب عبدالرحمٰن نے اپنے سات سو ساتھیوں کو اکٹھا کیا، اپنے دادا ہشام کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے نیام توڑ کر جلتے ہوئے الاؤ میں پھینک دی اور تلوار سونت لی۔ رات کے پچھلے پہر وہ القصر کی چٹان سے اُتر کر دشمن پر پل پڑا اور اس بے جگری سے لڑا کہ ... ابن مغیث کی پوری فوج ہراساں ہو کر بھاگ نکلی۔ عبدالرحمٰن نے بن مغیث اور عباسی سرداروں کے سر قلم کرکے انھیں کافور اور نمک سے حنوط کیا اور اگلے برس جب المنصور خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا ایک اُموی سردار نے سیاہ جھنڈے میں لپٹے یہ سر اُس کے قدموں میں ڈال دیئے۔ المنصور نے ابن مغیث کے سر کو چھوتے ہوئے کہا "شکر ہے کہ میرے اور قریش کے اس عقاب کے درمیان ایک سمندر حائل ہے۔"

"اگر تم فارغ ہو تو میری پُشت پر ٹین لوشن سے مالش کر دو۔" پاس لیٹے بدن میں

حرکت ہوئی۔

"کل" میں نے نقشہ سمیٹ کر اُٹھتے ہوئے کہا۔

"کل؟" وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی "کیا ہم آج زیتون کے باغ میں پکنک منانے نہیں جائیں گے؟"

"کل!"

"اور آج کہاں جا رہے ہو؟" اس نے جسم کا زیادہ سے زیادہ حصہ سنوارنے کی خاطر بکینی ڈھیلی کر کے کولہوں سے نیچے کرتے ہوئے پوچھا۔

"آج مجھے جنگل سے صدا آ رہی ہے۔"

"مشرقی لڑکے یقیناً پُراسرار ہوتے ہیں" اس نے سر ہلایا اور تالاب میں کود گئی۔ ایک وحشی جانور انسانوں کے درمیان پلنے بڑھنے کے باوجود جب پہلی مرتبہ جنگل سے آنے والی حیوانی آوازیں سنتا ہے تو وہ بے قابو ہو کر اپنے قدرتی ماحول کی جانب لوٹ جاتا ہے۔ کچھ اسی طور اِس انجانے قصبے قرمونہ کی آواز نے بھی مجھے تالاب کے کناروں پر لیٹی اور زیتون کے باغ میں بھی بعد میں لیٹی راحتوں سے منہ موڑ کر وہاں جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

ہمارے اردگرد زیتون اور مالٹے کے گھنے باغ تا حدِ نظر پھیلے ہوئے تھے۔ ڈرائیور نے گیئر کو متعدد جھٹکے دیئے اور بس ایک بوڑھے مگر باہمت کوہ پیما کی طرح سست روی اور اطمینان سے بلندی کی جانب رینگنے لگی۔ پہاڑ کی چوٹی پر قرمونہ کا قصبہ یوں سمٹا ہوا تھا جیسے طویل اُڑان کے بعد ایک پرندہ پَر سمیٹے سستا رہا ہو۔ شکستہ فصیل کی آغوش میں لیٹا قرمونہ پچھلے پہر کی دھوپ میں ایک ایسی تصویر کی مانند دکھائی دے رہا تھا جس کا رنگ اگرچہ وقت گذرنے سے بھورا ہو چکا ہے مگر گزشتہ حُسن کی پرچھائیاں اب بھی دلنشین ہیں۔ بس اس محرابی دروازے کے پہلو میں لمحہ بھر کے لیے رُکی جسے میں نے شب کی تاریکی میں منور دیکھا تھا اور پھر قرطبہ کی جانب ڈھلوان سے اُترنے لگی۔ میں قرمونہ میں اُترنے والا اکیلا مسافر تھا۔ بائیں ہاتھ پر ایک کلیسا نظر آیا جس کے پہلو میں جیرالڈا کی طرز کا ایک مُورش مینار

میں چھے کی طرح پیوست تھا۔ اُندلس کی اُن ہزاروں مساجد میں سے ایک جسے ڈھا کر یا عمارت میں معمولی ردّو بدل کر کے کلیسا میں بدل دیا گیا۔ البتہ مینار کی خوبصورت ساخت اور معصوم شباہت نے اُسے بربادی سے بچالیا تھا۔ بعض لوگ اس بات پر سیخ برہم نظر آتے ہیں کہ اندلس میں تعمیر کردہ ان مساجد کو کیوں مسمار کر دیا گیا یا انہیں کلیساؤں میں کیوں بدل دیا گیا۔ میرے خیال میں یہ ایک لازمی تاریخی عمل ہے۔ اگر عقیدہ رکھنے والے کسی سرزمین سے ہجرت کر جائیں یا مٹا دیئے جائیں تو اس عقیدے کے معبد محض عام عمارتوں میں بدل جاتے ہیں اور پھر اس کا انحصار مقامی لوگوں کی حسِ انصاف پر ہوتا ہے کہ وہ ان عمارتوں کو اپنے عقیدے کے معبدوں میں بدل دیں اور ان کا تقدس برقرار رکھیں جیسا کہ اکثر اندلس میں ہُوا یا پھر ان میں ڈھور ڈنگر باندھ دیں اور منقش در و بام پر اُپلے تھوپ دیں، جیسا کہ ہمارے ہاں ہُوا۔

وہ بلند محراب جس کی سرخ اینٹوں میں اُگی ہوئی گھاس سبز برف کے گالوں کی طرح نیچے لٹک رہی تھی باب اشبیلیہ کہلاتی ہے کہ اس کا رُخ اشبیلیہ کی جانب ہے۔ قرمونہ کے قدیم قصبے میں داخل ہونے کا واحد راستہ۔ سیاہ لباس میں لپٹی ایک پستہ قد بوڑھی عورت ہاتھ سینہ پر باندھے سر جھکائے دروازے میں سے باہر نکل رہی تھی۔ مخصوص سیاہ لباس میں لپٹی ایک ایسی بوڑھی عورت جو آپ کو ہسپانیہ کے ہر شہر، قصبے بلکہ ویرانوں میں بھی اسی طرح ملے گی۔ کہیں بھی نظر اُٹھا کر دیکھ لیجیے۔ سیاہ پوش، پستہ قد۔ ہاتھ سینے پر باندھے سر جھکائے! ایک خوش لباس نوجوان گدھے پر اس رعونت سے بیٹھا چلا آ رہا تھا جیسے وہ الفا رومیو کے تازہ ترین ماڈل پر سوار ہے۔ ہسپانیہ کے پسماندہ دیہات میں گدھا ایک سٹیٹس سمبل ہے۔ یہاں تک کہ کھاتے پیتے لوگ بھی موٹر سائیکل خریدنے کی نسبت سواری کے لیے کسی عمدہ نسل کے گدھے کو ترجیح دیتے ہیں۔ گدھوں کے لیے اس پُرشوق جذبے کی وجوہات کے بارے میں جب میں نے ایک صاحب حیثیت قشتالوی دہقان سے پوچھا تو اُس کا جواب بھی وہی تھا جو ایک مرتبہ بچپن میں میرے پھوپھی زاد بھائی نے مجھے منڈی بہاؤالدین کے قصبے وریانا میں گھوڑے اور شیورلٹ کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے دیا تھا۔ "وَت گھوڑا تے شریکاں دے پُٹھے دَ شُھے تے دِی پَل دبندا اے۔ پٹرول دی کائی لوڑ نائیں۔ تے نالے دَاہناں وِچ نے گھوڑا ابجدا اے۔ شیورلٹ

تھوہدی وا اودھنے کی کم؟"

بابِ اشبیلیہ کے اندر داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ پر دو تین ایسی دیہاتی قسم کی دکانیں ہیں جن پر گکھڑ منڈی کے بازار میں واقع اپنے دوست شیخ پھتو کی ہٹی کا گمان ہوتا ہے۔ سستی کریم کی شیشیاں، نالے پراندے، کاپیاں۔ بال صفا پوڈر..... ناتراشیدہ پتھروں کی ایک ڈھلوان سڑک کے دونوں جانب کوٹھڑی نما سفید مکانوں کی قطار بلند ہوتی ہوئی قصبے کے آخر تک چلی گئی تھی۔ شاید کسی مذہبی تہوار کی آمد تھی۔ اکثر مکانوں کے باہر نوجوان لڑکیاں اور بچے قلعی سے بھری تسلوں میں کوچیاں ڈبو ڈبو کر دیواروں پر سفیدی کرنے میں مشغول تھے۔ میں پاس سے گذرتا تو وہ ایک ہاتھ کولہوں پر جما کر کسی بینڈ ماسٹر کی طرح دوسرے ہاتھ میں کوچی تھام کر میرا جائزہ لینے لگتیں۔ ہسپانوی زبان میں فقرے بھی کسے جاتے۔ اس مقام پر تلمیذ حقانی بہت یاد آئے کہ موصوف پورے دو برس ہسپانوی زبان سیکھنے کے بعد جب کسی ہسپانوی سیاح خاتون سے ہمکلام ہوتے تو "ہیلو سینیوریتا" کے بعد کان کھجلا کر کھانستے ہوئے فرماتے "ہُن تُسی ہمت کرو۔ ساڈھی ہسپانوی تے مُک گئی اے۔" بہرحال ان فقروں پر میرا ردِ عمل وہی ہوتا جو گوالمنڈی میں سے گزرنے والے غیر ملکی سیاحوں کا ہوتا ہے۔ یعنی زندہ دلانِ لاہور کی ٹھیٹھ پنجابی گالیوں کے جواب میں کندھے سکیڑ کر مسکرا دینا۔ کبھی کبھار ایک آدھ بچہ ان قلعی گروں سے علیحدہ ہو کر میرے ساتھ ساتھ چلنے لگتا جسے ہمیشہ ڈانٹ ڈپٹ کر واپس بلا لیا جاتا۔

قرمونہ۔ قرطبہ یا اشبیلیہ نہ تھا کہ میں ٹورسٹ آفس سے حاصل کردہ نقشے کی مدد سے اس کے گلی کوچوں کے ناموں کا تعین کر کے قابلِ دید مقامات تک رسائی حاصل کر سکتا۔ اس غیر معروف قصبے میں یہ مقصد صرف بے مقصد آوارہ گردی سے ہی حاصل کیا جا سکتا تھا، چنانچہ میں ایک شترِ بے مہار کی مانند منہ اُٹھائے تنگ گلیوں میں تانک جھانک کرتا۔ سنسان چوکوں اور رنگین محلوں میں سرگرداں کسی ایسی عمارت یا کھنڈر کی تلاش میں رہا جو قرمونہ کے مُورش عہد کے متعلق ہو۔ ایک بظاہر بے آباد گلی میں سے گذر ہوا جس کے آخر میں ایک مُورش طرزِ تعمیر کا چار پہلو مینار حسبِ معمول ایک گوتھک طرز کے بے جان کلیسا کے

پہلو میں مجبوراً کھڑا تھا۔ ایک ایسی حسین بیوہ کی طرح جس کا سہاگ لوٹ کر اُسے زبردستی کسی ناپسندیدہ مرد کے پلّے باندھ دیا جاتا ہے مینار کی سُرخ اینٹوں پر کندہ قرآنی آیات دھوپ میں اُن گہنوں کی طرح چمک رہی تھیں جو اُجڑے سہاگ کی نشانیاں تھے۔ کلیسا کے آہنی دروازے پر پڑا زنگ آلود قفل اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ یہ عمارت عرصہ دراز سے عبادت کے لیے استعمال نہیں ہوئی۔ کلیسا کے عقب میں ایک تنگ گلی بلندی کی جانب جا رہی تھی۔ یہاں بھی ہُو کا عالم تھا۔ مکانوں کے بوسیدہ کواڑ ہوا کے زور سے ہلتے تو ایسی بھدی آوازیں آتیں جیسے کوئی اناڑی وائلن کے تاروں پر بے دردی گز چلا رہا ہو۔ تھوڑی دُور چلنے کے بعد گلی کے عین وسط میں ایک گرتی ہوئی محراب نے میرا رستہ روک لیا۔ میں نے واپس جانے کے بجائے اندر جھانکا۔ ایک کچی دیوار کے سائے میں ایک منحنی سی بڑھیا چرخے پر جھکی آہستہ آہستہ سُوت کات رہی تھی۔ میرے قدموں کی آہٹ سُن کر اُس نے سر اُٹھایا اور کچھ دیر مجھے اپنی چُندھی ہوئی آنکھوں سے گھورنے کے بعد ہسپانوی میں کچھ کہا۔ میں نے لاعلمی کے اظہار کے طور پر کندھے اُچکائے اور ہاتھ کے اشاروں کی مدد سے پوچھا "کیا یہ گلی بند ہے؟" وہ تھوڑی دیر اسی حالت میں بیٹھی سر ہلاتی رہی اور پھر چرخے پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ مگر اس عمل سے اس کے قد میں کوئی اضافہ نہ ہُوا۔ چرخے کے پیچھے کھڑی تین چار فٹ کی اس بڑھیا کو دیکھ کر یوں لگا جیسے جنوبی افریقہ کے کسی وحشی قبیلے کے وِچ ڈاکٹر نے اُس پر جادو کر کے اُسے مختصر کر دیا ہو۔ اس نے میری حیرت کو بھانپ لیا اور سر کے اشارے سے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ وہ بھیڑ کے ایک نوزائیدہ بچّے کی طرح اُچک اُچک کر صحن میں سے چلتی ہوئی مجھے مکان کے پچھواڑے میں ایک دروازے کے پاس لے آئی۔ قد کی مناسبت سے دروازے کی کُنڈی صحن کی سطح سے صرف دو فٹ بلند تھی۔ کُنڈی کھول کر اُس نے مجھے باہر جانے کو کہا۔ دوسری طرف ایک بارونق سڑک تھی جو ایک ایسے بلند محرابی دروازے پر ختم ہوتی تھی جو باب اشبیلیہ سے کئی گنا بڑا تھا۔

"کاسا دے مورو!" اس نے گڑیوں ایسے ننھے منّے ہاتھ ہلا کر اشارہ کیا۔

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اُس کا شکریہ ادا کیا اور سٹرک پر اُتر گیا۔ قرمونہ کی حفا
فصیل میں واقع یہ عظیم الشان دروازہ بھی عربوں کا تعمیر کردہ تھا۔ ایک درمیانی عمر کی عورت ا
ہاں کے دال اور کھیلیں بیچنے والوں کی طرح ایک بانس کے دونوں سروں پر بانی کے
لٹکائے چلی آ رہی تھی۔ میرے قریب پہنچنے پر وہ سانس لینے کو رُکی اور پھر دروازے
طرف اشارہ کر کے کہنے لگی۔

"کاسا دے مورو!"

مورو ہسپانوی زبان میں مُور یا عرب کو کہتے ہیں۔ ٹھگنی بڑھیا کی طرح وہ بھی میر
شکل و شباہت سے جان گئی تھی کہ میں کوئی مشرقی سیاح ہوں جسے موروں کے عہد کی
عمارت یا جگہ کی تلاش ہے۔ شاید اُس سامنے والے بلند دروازے کو ہی کاسا دے مو
کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ میں تصدیق کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ محراب کے نیچے چند
ایک دائرے کی صورت میں کھڑے تالیاں پیٹ رہے تھے۔ اُن کے درمیان میں ا
لڑکا ماتھے پر بکری کے دو سینگ باندھے کبڑا ہو کر بُل کی مانند کسی ایک دوست کی جانب
بڑھتا جو بُل فائٹر کے انداز میں نہایت سنجیدگی سے پنجوں پر گھوم کر وار بچا جاتا۔ ان بچوں
میں سے اکثر کے خدوخال مشرقی دکھائی دیتے تھے۔ شاید بربر زال قبیلے کے خون کی آمیزش
جو عربوں کے عہد میں قرمونہ میں آباد تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ بُل فائٹنگ بھول گئے اور
تمام کے تمام میرے گرد اکٹھے ہو گئے۔ "مورو! مورو!" سب نے شور مچا دیا۔

"ہیلو تورو!" میں نے مسکراتے ہوئے سینگوں والے لڑکے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

"ہیلو سینیور مورو!" وہ انتہائی گرمجوشی سے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ اس لڑکے
کے رنگ ڈھنگ اور طرزِ تکلّم میں بے پناہ سنجیدگی تھی۔ پُراعتماد اور مغرور چہرہ جسے دوسر
یورپی اقوام "مغرور ہسپانوی چہرہ" کا نام دیتی ہیں۔

"کاسا دے مورو؟" میں نے دروازے کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"نادا۔ نادا" سب لڑکوں نے کورس میں جواب دیا۔ اور پھر میرے تازہ ترین دوست
یعنی نقلی بُل نے میرا ہاتھ تھاما اور مجھے دروازے کے دوسری جانب لے آیا۔ دروازہ ایک

ایسی بلند فصیل کے سینے میں گڑا تھا جو پورے قرمونہ کو اپنے اندر چھپائے ہوئے تھی۔ فصیل کے ساتھ ہی گہری کھڈ تھی اور اس سے پرے نشیب میں اندلس کے شاداب میدان تا حد نظر پھیلے ہوئے تھے۔ "کاسا دے مورو" نفلی بل نے فصیل کے ساتھ اٹھتے ہوئے ایک کچے راستے کی طرف اشارہ کیا اور پھر میرے آگے آگے چلنے لگا۔ راستہ انتہائی خطرناک تھا۔ پاؤں پھسلنے پر ہم یقیناً عربوں کے اس قبرستان تک جا پہنچتا جو کھڈ کے خاتمے پر تھا اور پھر ظاہر ہے وہیں کا ہو رہتا۔ میرا دوست انتہائی نپے تلے قدم اٹھا رہا تھا اور بڑے اعتماد کے ساتھ بلندی کی جانب رواں تھا۔ کبھی کبھار وہ فصیل کے کسی شکستہ پتھر کو دیکھ کر رک جاتا اور ہاتھ پھیلائے، سر نیہوڑے اس پر حملہ آور ہونے کے انداز میں جسم کو حرکت میں لے آتا۔

"اولے!" میں اپنا اکھڑا ہوا سانس درست کر کے بمشکل داد دیتا۔

چٹان کی چوٹی پر ایک وسیع رقبے میں شکستہ عمارتوں کے کھنڈر بکھرے ہوئے تھے، ٹوٹی ہوئی محرابیں۔ ستونوں کے ٹکڑے۔ سرخ اینٹوں کے ٹیلے۔ ایک دیوار کے ساتھ چند شکستہ سیڑھیاں جو کہیں بھی نہیں جاتی تھیں۔ مٹی میں دبا ایک دروازہ جس کی چوکھٹ دکھائی دے رہی تھی۔ البتہ ایک صدر دروازہ اب بھی اصلی حالت میں موجود تھا۔ یہ کاسا دے مورو تھا۔ موروں کا قلعہ۔ عبدالرحمٰن الداخل کا قلعہ۔

"گراسیا" میں نے دس پسیتے کا ایک سکہ ننھے راہبر کی طرف بڑھا کر شکریہ ادا کیا۔

"ناوا" اس نے انکار میں سر ہلایا "لیوا امیگو!" اور بھاگتا ہوا نیچے چلا گیا۔

کھنڈرات کا ایک چکر لگا کر میں ایک ٹیلے پر بیٹھ گیا۔ سگریٹ سلگانے کو تھا کہ پھٹے پرانے کپڑوں میں لپٹا ایک باریش بوڑھا جانے کہاں سے نمودار ہوا اور انگریزی میں بولا "سینیور آپ عربوں کے عہد کے نوادرات دیکھنا پسند کریں گے؟"

بوڑھا شکل و صورت سے کسی عجائب گھر کا نگران تو ہرگز دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پھر اس کے پاس یہ نوادرات کہاں سے آ گئے۔

میں نے اسے ایک سگریٹ دیا اور پوچھا "کہاں ہیں؟"

"میرے پیچھے چلے آؤ" اس نے آہستہ سے کہا۔

کھنڈروں کے ساتھ جو گہری گھاٹی تھی اُس کے ایک کنارے پر بوڑھے کا جھونپڑا تھا۔ وہ مجھے اندر لے گیا اور کچّے فرش کے درمیان میں کُھدے ایک گڑھے میں ہاتھ ڈال کر ایک گٹھڑ نکال لایا۔

"سو فیصد درست نوادرات" اس نے گرہ کھولتے ہُوئے کہا۔

دو زنگ آلود تلواریں۔ ایک خنجر۔ نیزے کی ایک اَنّی۔ چند کلہاڑے،

"میں رات کو عبدالرحمٰن کے قلعے کے کھنڈر کھودتا ہوں" اس نے سرگوشی کی" بالکل اصلی ہیں"

یہ ہتھیار یقیناً پُرانے تھے اور تلواروں کی ہلال نُما ساخت سے اندازہ ہوتا تھا کہ عرب عہد کے ہی ہیں۔ خنجر کے زنگ آلود دستے پر بھی عربی میں ایک فقرہ کندہ تھا۔

"ان کی قیمت کیا ہے؟" میں نے پوچھا کیونکہ اس قسم کے کردار کھنڈر کھود کر نوادرات بیچنے کا کاروبار کرتے ہیں۔

"قیمت؟" وہ ہنسنے لگا اور پھر میرے سگرٹ سے ایک گہرا کش لگا کر بولا" میں انھیں بیچتا نہیں، یہ میرا عجائب گھر ہیں۔ انھیں بیچ دوں تو کھاؤں کہاں سے؟ بیس پسیتے ...." اس نے ہتھیلی پھیلا دی" میرا عجائب گھر دیکھنے کی فیس........"

میں نے اُسے بیس پسیتے دیئے تو اس نے گٹھڑی سمیٹ کر پھر گڑھے میں دبا دی۔ وہ مجھے واپس کھنڈرات تک چھوڑنے آیا۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور جاتے ہوئے ایک اور سگرٹ دے دیا۔ تھوڑی دیر میں سُورج غروب ہونے کو تھا چنانچہ میں نے ایک پتھر پر کھڑے ہو کر چند تصاویر اُتاریں اور پھر وہیں بیٹھ کر سگرٹ پینے لگا۔

میرے نیچے میلوں تک پھیلے ہوئے اُندلس کے سرسبز میدانوں میں ایک طویل بل کھاتی ہوئی سڑک لیٹی تھی۔ سڑک پر قرطبہ سے آنے والی بس ایک ناقص میکانکی کھلونے کی طرح رُک رُک کر دھیرے دھیرے رینگ رہی تھی۔ وادیٔ کاربونیس کے اس وسیع و عریض میدان میں صرف ایک گھر نظر آ رہا تھا۔ پیلی دُھوپ میں چمکتا سفید اُندلسی گھر۔ اسی میدان میں ابن مغیث کی افواج کے خیمے بکھرے اور راتوں کو اُن کے درمیان الاؤ روشن ہوتے۔ اس قلعے کے

دونوں میں سے روشنی اندر آتی تو عبدالرحمٰن کے ساتھیوں کے دل بُجھ جاتے۔ جس پتھر پر میں بیٹھا یقیناً اُسی کے نواح میں کھڑے ہو کر ایک شب عبدالرحمٰن نے سامنے میدان میں پھیلے خیموں کو دیکھ کر بالآخر اپنی میان توڑ کر پھینک دی تھی اور پھر سُرخ بالوں والا اُموی شہزادہ اسی گھاٹی سے نیچے اُترا اور اس کی تلوار کے ٹکراؤ سے پُوری وادی گونجنے لگی...... مگر آج ان میدانوں میں مکمل سکوت تھا۔ سوائے قرطبہ سے آنے والی بس کے انجن کی آواز کے جو لمحہ بہ لمحہ قریب تر ہو رہی تھی۔ مجھے اس بس پر واپس اشبیلیہ جانا تھا۔ جب میں کاسادے مورو سے نیچے اُترا تو شام ہو رہی تھی اور قرمونہ کی چٹان کا سایہ آہستہ آہستہ بڑھتا ہُوا منظر سبز میدان کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔

اشبیلیہ جانے والی بس جسے میں پُوری دوپہر اُس وسیع میدان میں رینگتے دیکھتا رہا تھا۔ پورے آٹھ بجے قرمونہ کی چٹان سے اُتری۔ سُورج غروب ہو چکا تھا۔ زمین کا رنگ نظروں سے اوجھل ہو رہا تھا۔ دونوں اطراف شفق کی روشنی میں نہائے زیتون اور مالٹے کے باغ گزر رہے تھے۔ ابھی سپین کی شرابوں کا اثر تھا۔ خنکی اتنی کہ جسم کو صرف چھُوئے۔ دُور اُفق پر صرف ایک گھڑسوار شبیہہ دکھائی دی۔ ایک اور رُفان کے خوتے ...... رعنائیوں کی تلاش میں...... محبتوں کا متلاشی، میری طرح! زیتون کا ایک اور باغ گذرا۔ درمیان میں ایک خاموش گھر۔ پانیوں میں کھجور کے درخت۔ بس کھڑی ہوتی تو گرد و پھیلے باغوں میں سرسراہٹ سی سنائی دیتی جیسے ہوا زیتون کے درختوں میں چپکے سے دبے پاؤں چل رہی ہے۔ کیا اُندلس کی شامیں آج سے سینکڑوں برس پیشتر بھی ایسی ہی سحرانگیز تھیں؟ اگر تھیں تو تبھی لوگ اِن شاموں پر فدا ہوئے اور یہیں کے ہو رہے جب تک کہ نکالے نہ گئے۔

فلیمنکو

"ساندیا! ساندیا!" بس میں سوار بچوں اور چند مسافروں نے تالیاں پیٹتے ہوئے شور مچا دیا۔ تربوزوں سے بھرا ہوا ٹرک ایک مرتبہ پھر بھونپو بجاتا بس کو کندھے مارتا ہوا آگے نکل گیا۔ اشبیلیہ سے نکلتے ہی یہ تماشا شروع ہو گیا تھا۔ تربوزوں والے ٹرک کے ڈرائیور نے غالباً پونتر مریم کی قسم کھا رکھی تھی کہ وہ اپنے کھٹارے کو ہر قیمت پر غرناطہ جانے والی ہماری بس کے آگے آگے ہی چلائے گا اور اس طریقے سے چلائے گا کہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ اِدھر ہمارے ڈرائیور کی رگوں میں بھی کسی غیر مہذب بُل کا خون دوڑ رہا تھا۔ جونہی ٹرک ہمیں اوورٹیک کرتا وہ باآواز بلند مسافروں کی بخشش کی دعا مانگ کر سینے پر صلیب کا نشان ثبت کرتے ہوئے دھاڑ سے ایکسلریٹر پہ پاؤں دے مارتا اور یوں اُس کا خاندانی وقار اور ہماری بس جھُولتے ہوئے ٹرک سے آگے نکل جاتے۔ پاکستانی بسیں بے حد یاد آئیں کہ اس قسم کے کھیل تماشے سے پیشتر "مسافر" اپنے گناہوں کی معافی مانگ لو ہو سکتا ہے یہ تمھارا آخری سفر ہو" کی وارننگ پڑھ کر اپنے آپ کو بخشوا لیتا ہے، انجانے میں تو نہیں مارا جاتا۔ حادثے کی صورت میں ڈرائیور کی دعائے بخشش صرف ہسپانوی مسافروں کے کام ہی آتی جو بلا روک ٹوک جنت الفردوس میں جگہ پا جاتے۔ میرے جیسے مسافر کے نامۂ اعمال پر داخلے کی مُہر ہرگز نہ لگتی۔ کہ جملہ مذاہب کی جنتوں میں غیر محرم اشخاص کا داخلہ ممنوع ہے۔ ویسے یہاں سوائے مجھ ڈرپوک کے بس میں سوار تمام مسافر ڈرائیور کی بے جگری کی داد حسبِ معمول "اولے اولے" کے نعروں سے دے رہے تھے اور خاص طور پر بچہ لوگ "ساندیا، ساندیا" یعنی تربوز۔ تربوز" کے شور سے اس کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ اگرچہ یہ خوبی اب تک مناسب حد سے تجاوز کر چکی تھی۔ اس دوڑ

کے دوران ایک مرتبہ جب ہماری بس ٹرک کو اوورٹیک کرنے لگی تو ٹرک باقاعدہ ایک شرابی کی طرح جھومنے لگا اور ہمیں راستہ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ یہ صریحاً سپورٹس مین سپرٹ کی خلاف ورزی تھی چنانچہ ڈرائیور سمیت مسافروں نے بھی اپنے آدھے دھڑ کھڑکیوں سے باہر نکال کر اس کمینے کی شان میں قصیدہ گوئی شروع کر دی۔ مخالف فریق میں گھرے کبڈی کے کسی کھلاڑی کی طرح ہماری بس بچ نکلنے کے لیے دائیں بائیں متواتر جھول رہی تھی مگر ٹرک پہلوان بھی اُسی پھرتی سے کٹ کرکے راستے کی دیوار بن جاتا۔ یہ کشمکش ابھی جاری تھی کہ مخالف سمت سے ایک تیز رفتار ویگن دندناتے بھرتی ہوئی آئی۔ تصادم ناگزیر تھا میں نے دہشت زدہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیں، اور اگلی نشست کو مضبوطی سے بھینچ کر آیۃ الکرسی کا ورد کرنے لگا...... ایک بالغ زلزلے کا ورود ہوا۔ تمام مسافر یوں ہلنے لگے، جیسے بادامیوں کو گڈوی میں نمک ڈال کر نرم کرنے کے لیے جھٹکے دیے جا رہے ہوں۔ پھر مکمل خاموشی کے ایک وقفے کے بعد بس میں ہڑبونگ مچ گئی۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور نشست میں کھبی ہوئی انگلیوں کو بمشکل علیحدہ کیا...... ہماری بس سڑک کے ساتھ کچے راستے پر اشبیلیہ کی جانب رُخ کیے ساکت کھڑی تھی۔ اور تربوزوں والا ٹرک سڑک کی دوسری جانب تیس چالیس گز کے فاصلے پر ایک تربوزوں کے ہی کھیت میں اپنے زیریں حصے کی نمائش کرتا ہوا اس حالت میں کھڑا تھا کہ اس کے دو پہیئے فضا میں معلق نظر آ رہے تھے۔ دُور سے یُوں لگتا جیسے کوئی دیوزاد کتا ٹانگ اُٹھائے حوائجِ سگاں سے فارغ ہو رہا ہے۔ قریب ہی ٹرک ڈرائیور آسمان کی طرف منہ کیے بڑے اطمینان سے سگرٹ پی رہا تھا۔ ہماری بس کا ڈرائیور مسافروں کے جلوس کے آگے آگے مکے لہراتا ہوا اُس کی جانب جا رہا تھا۔ مارکٹائی کا قوی امکان تھا، اب میں بھی اپنی نشست سے اُٹھ کر باہر آ گیا کہ زندہ دلانِ لاہور میں سے ہوں جو کسی سڑک پر پڑے ہوئے حادثے میں زخمی ہونے والے کی طرف تو آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتے، مگر جہاں کہیں دو شخص قدرے بلند آواز میں گفتگو کریں وہاں میلہ دیکھنے کے لیے ضرور کھڑے ہو جائیں گے۔ بلکہ نوبت مار پیٹ تک نہ پہنچے تو "بکری" کے طعنے دے کر صلح پسند آدمی کو بھی اشتعال دلا دیا جاتا ہے۔ بہرحال میرا جذبۂ شوق جائے واردات پر پہنچتے ہی سرد ہو گیا۔ دونوں ڈرائیور کھیت کی منڈیر پر بیٹھے نہایت دوستانہ ماحول میں سگرٹ کے کش لگانے میں مصروف تھے اور بات بے بات پر نہایت

گرمجوشی سے ہاتھ ملا رہے تھے ۔مجھے "بکری" کی ہسپانوی نہیں آتی تھی ، ورنہ میں ان کو یُوں چین سے نہ بیٹھنے دیتا۔اکثر مسافر ذرا دُور نکل کر کھیتوں کو سیراب کر رہے تھے اور بچے ٹرک میں سے لڑھکے ہوئے تربوزوں کو فٹ بال کی طرح ایک دوسرے کی جانب اُچھال رہے تھے ۔یہ صورتِ حال اتنی مایوس کُن تھی کہ میں واپس آکر بس میں بیٹھ گیا۔

بس دوبارہ چلی تو میں نے اشبیلیہ سے چلنے کے بعد پہلی مرتبہ اطمینان کا سانس لیا اور اس بات کا ثبوت اِس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا تھا کہ میں اب تک اپنی ہم نشست ہسپانوی لڑکی کی موجودگی سے تقریباً بے خبر رہا جو اس وقت ٹرک سے چوری کیا ہوا تربوز کچر کچر کھائے چلی جا رہی تھی۔میں ابھی اس بی بی کے ساتھ راہ و رسم بڑھانے کی خاطر کسی پھڑکتے ہوئے فقرے کی تلاش میں تھا اور دخل در خوردنِ تربوز کو تھا کہ اس نے اپنے سرخ ہونٹ سُرخ تر گودے پر جما کر شپ سے سانس اندر کو کھینچا اور پھر منہ کھڑکی کی جانب موڑ کر پوائنٹ بلینک ایک لمبی پھُوار داغ دی، تربوز کے بیج اُس کے نیم وا لبوں میں سے یُوں چھُوٹے جیسے چھرّے دار بندوق چل گئی ہو۔

"وویلا سیوس" اس نے بھنچے ہوئے ہونٹ پٹاخ سے کھولے اور سر زور سے یوں جھٹکا جیسے سَبون اَپ کے اشتہار والی لڑکی مشروب کا ایک گھونٹ بھر کر پٹ پٹ دیدے جھپکاتی سر جھٹک کر کہتی ہے ۔"سبون اَپ فار دی ایکشن "۔

ایس اُستد فلیمنکو؟" اُس نے گردن گھُما کر ایکشن کا رُخ میری طرف کر دیا۔

"ہیں جی؟"میں نے ہڑبڑا کر کہا۔ ہسپانوی ایکشن کے جواب میں میرا لاشعوری ری ایکشن پنجابی کی صُورت میں ظاہر ہُوا۔

"ایس ....اُستد...... فلیمنکو؟"اس نے کسی کنڈر گارٹن اُستانی کی طرح ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

فلیمنکو؟ میں نے گردن کے بالوں کو اُنگلی کے گرد لپیٹتے ہوئے سوچا "ہاں ...... میں کھِل اُٹھا، "فلیمنکو یعنی برڈ - پرندہ!"

"نادا" اس نے ایک مرتبہ پھر "سبون اَپ فار دی ایکشن" ایسا سر جھٹکا۔

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں رُک سیک میں سے گندے کپڑوں تلے دبی

"ہسپانوی انگریزی بول چال" کی کتاب نکال کر اس سنیوریتا کے سوال کا ترجمہ سلیس انگریزی میں کرتا اور بات کو آگے بڑھاتا۔

"مومنتو" میں نے لمحۂ صبر کی تلقین کے بعد ریک پر سے ٹرک نیک اُتارا۔ خاصی تگ و دو کے بعد کتاب نکالی اور ورق گردانی میں مشغول ہو گیا۔ ایس..... یعنی ہلو۔ اُسند کا مطلب تم..... اور فلیمنگو...... پرندہ وغیرہ نہیں تھا بلکہ خانہ بدوش! پوچھا جا رہا تھا۔ کہ کیا خانہ بدوش ہو۔؟ اب کہنا تو میں یہ چاہتا تھا کہ خانہ بدوش تو ہوں کہ خیمہ اٹھائے پھرتا ہوں مگر اس قسم کا نہیں۔ جو ہسپانیہ میں گھوڑے بیچتے ہیں۔ قسمت کا حال بتاتے ہیں اور بچے اغوا کرتے ہیں بلکہ اس قسم کی کوئی کچر کچر کرتی تربوز کھاتی بچی مل جائے تو اُسے بھی نہیں چھوڑتے۔ لیکن ان الفاظ کا ہسپانوی متبادل اگر میں کتاب میں تلاش کرتا تو ہم غرناطہ پہنچ جاتے۔ چنانچہ صرف "ناوا" یعنی "نہیں" پر ہی اکتفا کیا۔

"ہسپانول؟" اس نے بے یقینی کے عالم میں دریافت کیا۔

"اسب گول۔ کچھ نہ پھول" میں نے قافیہ ملاتے ہوئے جوش میں آ کر کہہ دیا۔ اس لیے کہ جواب سے شاید اُسے میری ذہنی حالت کے بارے میں خفیف سا شبہ ہوا۔ اس نے ہونٹوں کو سکیڑ کر صرف ہُونہہ کیا اور کھڑکی کی طرف منہ موڑ لیا۔ ساڑھے تین بجے اشبیلیہ سے روانگی ہوئی تھی اور تیز بڑوں کے کسی اور ٹرک کے ساتھ حادثے کے امکانات خارج کر دینے کی صورت میں ہمیں ساڑھے نو بجے غرناطہ پہنچنا تھا۔ میرے جیسے گلاڈورآدمی کے لئے پانچ چھ گھنٹے متواتر منہ بند کیے رکھنا خاصا صبر آزما تھا۔ اس لیے میں نے ایک مرتبہ پھر گائیڈ بک کی جانب رجوع کیا کہ شاید کوئی ایسا فقرہ، ایسا کیچوا دستیاب ہو جائے جسے سُن کر، جسے دیکھ کر اس مخزم، اس مچھلی کے منہ میں پانی بھر آئے اور وہ میری جانب پھر سے متوجہ ہو جائے۔ مطالعے کے بعد معلوم ہُوا کہ گائیڈ بک بوڑھوں، وہ بھی صرف شریف بوڑھوں کے لیے لکھی گئی تھی۔ کیونکہ اس میں "نزدیکی ہسپتال کا فون نمبر کیا ہے؟ اس ہوٹل کا غسلخانہ کہاں ہے؟ میں بہت تھک گیا ہوں! میرا خیال ہے مجھے جوڑوں کا درد ہے" اور "اس تابوت کی کیا قیمت ہے" قسم کے ہسپانوی فقرے تو موجود تھے مگر "آج رات تم مجھے کہاں ملو گی؟ تمھارے والدین کتنے بجے سو جاتے ہیں؟ تمھارے گھر کی

دیوار کتنی اونچی ہے"اور صحن میں کتنا وغیرہ تو نہیں بندھا ہوتا!" جیسے نسخے ناپید تھے۔ خاصی جدوجہد کے بعد ایک کارآمد فقرہ دستیاب ہوا جسے میں نے اندھا دھند چلا دیا
"ٹوس او فوس سَون پیرا ببلوس"
اس فقرے کا ردِ عمل اتنا شدید ہوا کہ میں نے فوراً گائڈ بک دیکھ کر اطمینان کر لیا کہ کہیں مناسب فقرے کی بجائے "میں کپڑے بدلنا چاہتا ہوں آپ کمرے سے باہر چلی جائیں" والا فقرہ تو نہیں بول گیا۔ بہرحال "تمھاری آنکھیں بے حد خوبصورت ہیں" کے لیے بھی ہسپانوی الفاظ درج تھے۔ اس کے چہرے پر حیا کی ایسی سُرخی چھا رہی تھی جیسے یورپی لڑکیاں بچّہ گاڑی سے باہر قدم رکھتے ہی چہرے سے پَچھوڑ دیتی ہیں۔
"نادا" اس نے بے یقینی کے عالم میں سر جھٹکا "استد ویسے بین ترا سس" اور مجھے آبلاپا کے سامنے ایک اور طویل ہسپانوی فقرے کی دیوار کھڑی کر دی۔ ایک مرتبہ پھر میں نہایت خشوع و خضوع سے گائڈ بک کی اوراق پیمائی پر کمر بستہ ہو گیا۔ سینیوریتا نے بھی حسبِ سابق کچھ کہہ کر منہ نہ موڑا بلکہ کن اکھیوں سے کتاب کی جانب دیکھتی رہی .... استد .... تم! ویسے ... بولتے ہو! میں ترا س ... جھوٹ ۔ ان لفظوں میں کمال کا حُسنِ طلب پنہاں تھا یعنی ایک بار پھر کہو ذرا"

"جھوٹ ...... نادا" میں نے کانوں کو چھوتے ہوئے ادب سے کہا "پیرا ببلوس۔ پیرا ببلوس"
"گراسیا!" وہ شکریہ ادا کرنے کے بعد اپنے کھسکتے ہوئے سکرٹ کو گھٹنوں پر کھینچ کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ "واُ استد اگرا نادا؟"
میں نے گائڈ بک بند کر کے رُک سیک کی جیب میں اُڑس دی، کیونکہ پچھلے دس منٹ کی عرق ریزی کے بعد میں ہسپانوی پر خاصا عبور حاصل کر چکا تھا۔
"سی ... گرا نادا" میں نے جیب سے ٹکٹ نکال کر نمائش کی۔
"اسپانیول!" اس نے دوبارہ میرے ہسپانوی ہونے کی تصدیق چاہی۔
"نادا ...... نہیں" میں نے اُسی کے "فاردی ایکشن" انداز میں سر جھٹکا "اَن ..... فراستیرو ... اَن ... آندالوسیّہ" اور گائڈ بک پر درج اوّلین فقرہ دہرا دیا یعنی میں تو اندلس میں اجنبی ہوں۔
"مو ئی بیاں ......" وہ آنکھوں کی مدح سرائی کے بعد انھیں کچھ زیادہ ہی جھپکا رہی تھی "تو رسنتلم؟"

"ہی ...... تو رستا ...... پاکستانی!" میں اب اہلِ زبان کی مانند فر فر بول رہا تھا چنانچہ
م اور آگے بڑھا یعنی اسمِ شریف دریافت کیا" کومو سے لیاما استند؟"

"مرسیڈیس" جواب آیا۔

اب ایک اچھی بھلی دکھتی ہوئی ہسپانوی سینیوریتا کارمن یا مالاگروسا تو ہو سکتی تھی مگر مرسیڈیس
ری بھرکم نام کسی قریہ جرمن فراؤ لائن کو ہی زیب دیتا ہے۔ ضرور اسے سمجھنے میں غلطی ہوئی
نے سوچا اپنی بجائے بس کا میک بتا رہی ہے۔

"تو نامے ...... تو" میں نے تو پہ بوجھ ڈالتے ہوئے پھر پوچھا۔

"مرسیڈیس" پھر جواب آیا۔

"موئی بیاں ...... بہت خوب" میں نے ہتھیار ڈال دیے اور جیب میں سے گویا کا کڑوا
نکال کر سلگا لیا۔ اس نے بھی سلسلۂ تربوز خوردن جہاں سے ٹوٹا تھا وہیں سے شروع کیا
یچر کرنے لگی۔ مرسیڈیس کے دانت جب تربوز کے سُرخ گودے کو سمیٹتے چھلکے کی سفیدی
پہنچے تو اس نے ایک حسرت بھری نگاہ چھلکے پر ڈالی اور پھر دل پہ پتھر رکھ کر اُسے
باہر پھینک دیا۔

"سٹرینجر اِن اندلسیا؟ ...... بیوٹی فل!" تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد مرسیڈیس نے
اچھی خاصی شستہ انگریزی میں کہا ......

"مَرن جوگی ......" میں بھی زیرِ لب بڑبڑایا۔ سینیوریتا اچھی بھلی انگریزی جاننے کے باوجود
اہ ہسپانوی بول بول کر میرا مغز چاٹتی رہی تھی۔

"تم نے مجھ سے کچھ کہا"؟ اس نے بدستور انگریزی کو سلسلۂ کلام بنائے رکھا۔

"ہاں ...... میں نے ہی تمہیں کچھ کہا" میں انتہائی خفگی کے عالم میں بولا "اور وہ" کچھ"
کہ اگر تم انگریزی زبان سے واقفیت رکھتی ہو تو مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"تم نے پوچھا ہی نہیں ......" وہ قہقہہ مار کر ہنس دی اور قدرے توقف کے بعد بظاہر
سے پوچھا "تو گویا میری آنکھیں پیرا سیوس ہیں۔ ہوں؟"

"اور گویا میں ایک خانہ بدوش ہوں ...... ہوں؟"

"وہ تو تم لگتے ہو" مرسیڈس انگلی سے اپنے گھٹنے پر دستک دیتے ہوئے بولی" بہرحال اس تم نے اتنی ہسپانوی ضرور سیکھ لی ہے کہ بس میں بیٹھی کسی لڑکی کے ساتھ گفتگو کا آغاز کر سکو۔"

"صرف ایسی لڑکی کے ساتھ جس کی آنکھیں پیرا سپوس ہوں۔"

"تم نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔" اُس نے گفتگو کا رُخ فی الفور موڑا۔

"مرسیڈس کی نسبت سے اصولاً تو میرا نام رومیو .... الفارومیو ہونا چاہیئے۔" میں الفارومیو کار اور جولیٹ والے رومیو کا ملغوبہ بنا کر اپنے تئیں ایک لاجواب فقرہ تخلیق کیا وہ محظوظ ہونے کی بجائے رنجیدہ نظر آنے لگی" تمہاری حسِ مزاح بھی ہسپانوی لڑکوں سے مختلف نہیں ...... کالج سے لوٹتی ہوں تو ہم جماعت لڑکے آوازے کستے ہیں، آہ! مرسیڈس کا ماڈل کتنا پیارا ہے۔ مجھے تو مرسیڈس سے محبت ہو گئی ہے۔ کاش میرے پاس اسے سٹارٹ کرنے کے لیے چابی ہوتی ...... ہونہہ! خانہ بدوشوں کے بچے!"

"یہ تو بہت مشکل ہے" اس نے سر جھٹکنے کا عمل دُہرایا" تم فلیمنکو لگتے ہو اور تمہارا نام بھی ہونا چاہیے۔"

اشبیلیہ کے سانتا کروز محلے کی باسی مرسیڈس اپنے والدین کے ہاں گرمیوں کی چھٹیاں گذارنے کے بعد واپس غرناطہ جا رہی تھی جہاں وہ ایک میڈیکل کالج میں فارمیسی کا ڈپلومہ کور کر رہی تھی۔ اس لمحے میں نے باہر دیکھا تو انتی کویرہ کا قصبہ گذر رہا تھا۔ ایک شکستہ عرب ... قصبے کے باہر تک ہمارے ساتھ چلی آئی۔ آرچی ڈونا کے بعد لوشہ آیا تو شام ہونے کو تھی۔ لوشہ غرناطہ کے مؤرخ اور وزیرِ اعظم محمد لسان الدین الخطیب کا جائے پیدائش ہے۔ الخطیب نے "الاحاطہ فی اخبار غرناطہ" کے نام سے تاریخ غرناطہ مرتب کی جس میں ہمیں اُس عہد کے قاضیوں سلطانوں اور شاعروں کے حالاتِ زندگی کے علاوہ اہالیانِ غرناطہ کے لباس و عادات کا بھی تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ وہ درباری سازشوں کا شکار ہو کر مراکو چلا گیا جہاں فیض میں موت کا شکار ہوا۔ اس کی موت غرناطہ کے آخری جینیئس کی موت تھی۔ لوشہ میں کافی کے لیے وقفہ تھا۔ ہم بس سے اُتر کر گلی کے پار ایک قہوہ خانے میں چلے گئے۔ اگرچہ یورپی ممالک کی نسبت ہسپانوی لڑکیاں عام طور پر کوتاہ قامتی کی طرف مائل ہوتی ہیں مگر مرسیڈس کی آنکھیں اپنی ہم وطنوں کے مقابلے میں بھی زمین کو زیادہ

سے دیکھتی تھیں۔ اگر وہ اپنے نام کے بارے میں اتنی جذباتی نہ ہوتی تو میں یقیناً اُسے کہہ دیتا کہ قدرے چپٹی ناک اور رنگ کے حوالے سے اس کا نام مرسیڈیس کی بجائے فوکس واگن ہونا چاہئے تھا۔

"لوشہ سے غرناطہ صرف بیس میل کے فاصلے پر ہے۔" مرسیڈیس نے بتایا "جونہی ہماری کار لوشہ سے باہر نکلے گی افق پر الحمرا کے سُرخ مینار اور بُرج نظر آنے لگیں گے۔"

غرناطہ! الحمرا! لبوں کی طرف اُٹھتا ہُوا سگرٹ نیچے آگیا۔ میں نے سر اُٹھا کر مرسیڈیس کی طرف دیکھا۔ "کیا یہ سچ ہے؟"

"ہاں ہاں! اس میں حیرت کی کونسی بات ہے؟" مرسیڈیس کافی کے پیالے میں جھانکتی ہوئی بولی "قصبے سے باہر نکلتے ہی ......" چہرے کی تصویر پر تخیّر سوندھی مٹی کی خوشبو کی طرح پھیلنے لگا "فلیمنکو! ...... تمھاری آنکھوں میں وحشت جھلک رہی ہے ...... کیا بات ہے؟"

"اوہ! کچھ نہیں" میں نے سگرٹ بُجھا دیا۔

ایک عرب شاعر نے کہا تھا "جنّتِ سماوی تو سب کے لیے نہیں مگر جنّتِ ارضی غرناطہ کے در ہر ایک کے لیے کھلے ہیں۔" میں اِسی غرناطہ سے صرف بیس میل کے فاصلے پر تھا۔ جہاں اس کی جھلک دیکھنے کے لیے بدن میں تپتے چینی کی سوئیاں چُبھ رہی تھیں وہاں اُداسی کا ایک گہری نشتر بھی دل میں اُتر رہا تھا۔ ایک سربستہ راز سے پردہ اُٹھ جائے گا۔ ایک اور شہر نقشے کے چند سیاہ حروف کی بجائے محبتوں، رعنائیوں اور نفرتوں سے عبارت ہو گا اور ان سربستہ رازوں کی اُنگلیاں، اِن اجنبی شہروں کے ہاتھ انسان کے ساکت وجود پر نمودار ہوتی ہوئی کائی کو سمیٹ کر اسے پھر سے آزاد کر دیتے ہیں۔ اگر تمام راز نہاں ہو جائیں، شہر اجنبیت کا لبادہ اتار دیں تو پھر میرا کیا ہو گا؟ کونسے ہاتھ مجھے آزاد کریں گے؟

لوشہ کا آخری گھر اور اس کے دروازے پر لٹکی ہوئی لالٹین کی مدھم روشنی نظروں سے اوجھل ہوئی تو مرسیڈیس نے اپنی چپٹی ناک کھڑکی کے شیشے پر جما دی "چند لمحوں میں الحمرا نظر آنے لگے گا۔" میں جان بوجھ کر کھڑکی کے باہر نہیں دیکھ رہا تھا۔ میری خواہش تھی کہ مرسیڈیس کے لبوں پر "الحمرا" آئے اور میں نظریں اُٹھا کر اس قصرِ پُرفسوں پر رکھ دوں۔ شب کی سیاہی

اتنی گہری ہو چکی تھی کہ سڑک کے کناروں پر کھڑے سرو کے درخت ماورائی ہیولوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔

"ہماری بس اگر لوشہ میں اتنی دیر نہ رکی رہتی تو ہم تاریکی چھانے سے پیشتر ہی اس تک پہنچ جاتے...... اب تو کچھ بھی نظر نہیں آ رہا" مرسیڈس نے خاموشی سے سرخ ناک کو انگلیوں سے ہلکے ہلکے رگڑنے لگی "سردی ہے" مجھے بھی ہسپانیہ میں داخل ہو بعد پہلی مرتبہ آج شب ہوا میں سردی کی ہلکی سی کاٹ کا احساس ہو رہا تھا۔

"لیکن الحمرا تو تاریکی میں بھی نظر آنا چاہیے" مرسیڈس کندھے اچک کر بولی "ہر شب اسے روشنیوں سے منور کیا جاتا ہے۔ آج جانے کیوں اسے روشن نہیں کیا گیا"

"شاید اہلِ غرناطہ کو معلوم ہو گیا ہے کہ آخری مُور بادشاہ ابو عبداللہ کو جلاوطن کرنے آٹھ سو برس بعد آج ایک اور مُور شہر میں داخل ہونے کو ہے اس لیے......"

"میں نہ کہتی تھی تم شکل سے فلیمنکو لگتے ہو" مرسیڈس ہنس دی "تو تم مُور ہو"

"نہیں میں تو خانہ بدوش ہوں"

"اتنی رات گئے اب تم رہائش کی تلاش میں کہاں مارے مارے پھرو گے" غرناطہ بس سٹیشن سے باہر نکلتے ہوئے مرسیڈس بے حد فکرمند تھی۔

"میں اپنی چار دیواری ایک خیمے کی صورت میں کندھے پر اٹھائے پھرتا ہوں، خانہ بدو جو ٹھہرا"

"ہاں! فلیمنکو" وہ سر جھٹک کر ہنس دی "اگر ہم اشبیلیہ میں ہوتے تو میں تمہیں اپنے لے جاتی مگر یہاں غرناطہ میں...... میرے ہوسٹل کی وارڈن راہبہ اتنی سخت گیر اور مردم آ ہستی ہے کہ رات کے وقت اس عمارت میں لڑکا تو کیا نر پرندہ بھی پَر نہیں مار سکتا"

"اور دن کے وقت؟"

"مشکوک چال چلن کے حامل خانہ بدوشوں کے علاوہ سب کو اجازت ہے......

ہم پیدل چلتے ہوئے جدید غرناطہ کے مرکزی چوک پلازا دے ازابیلا کیتھولیکا میں آ گئے

کے وسط میں فاتح غرناطہ فرڈیننڈ کی چہیتی ملکہ ازابیلا کا مجسّمہ نصب تھا۔ مجسّمے کے گرد ایک باغیچے میں ہسپانوی لڑکے ٹولیوں میں بٹے ادھر ادھر بے مقصد گھوم رہے تھے۔ میں نے رُک سیک میں سے "کیمپنگ گائڈ" نکالی جس میں ہسپانیہ کی کیمپنگ گراؤنڈز کی تفصیل درج تھی۔ غرناطہ کے آگے "کیمپنگ البتیمو" کا نام درج تھا۔

"کیمپنگ البتیمو؟" مرسیڈس سوچ میں پڑ گئی "یہ مزور شہر سے باہر واقع ہے ورنہ مجھے علم ہوتا...... تم یہیں ٹھہرو" وہ سڑک عبور کر کے گول باغیچے میں داخل ہو گئی اور اُسے دیکھتے ہی ہسپانوی لڑکوں کی پوری فوج نے اس کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ چند منٹ بعد جب وہ اس محاصرے سے باہر نکلی تو اس کے ہمراہ دو نوجوان بھی چلے آئے "کیمپنگ کے لیے تمہیں یہاں سے ٹرام نمبر ۲ پر سوار ہونا ہو گا" مرسیڈس قریب آ کر بولی "یہ لڑکے تمہیں مطلوبہ ٹرام پر سوار کروا دیں گے اور کنڈکٹر کو مناسب ہدایات بھی دے دیں گے۔"

"گراسیا" میں نے ہر دو سینیورز کا پیشگی شکریہ ادا کیا جو میرے دائیں بائیں حفاظتی فرشتوں کی طرح کھڑے ہو گئے تھے۔

"میں خود تمہیں چھوڑ آتی مگر میرے ہوسٹل کا صدر دروازہ ساڑھے دس بجے بند ہو جاتا ہے۔"

"آئندہ چند دنوں میں اُس دروازے کو کھلا رہنے دینا شاید کہ میں آؤں!"

"شاید فلیمنکو؟" اس کی آنکھوں میں نبضیں دھڑکنے لگیں۔ اس نے حسب معمول "فاروی ایکشن" انداز میں سر جھٹکا اور پھر سڑک عبور کر کے بھیڑ میں گم ہو گئی۔

پندرہ منٹ کے انتظار کے بعد ٹرام نمبر ۲ کا ڈھیلا پنجر کھڑکھڑ کرتا وارد ہوا اور گہماگہمی کی آوازوں پر حاوی ہو گیا۔ میرے ہر دو محافظوں نے میرا رُک سیک اُٹھا کر ٹرام میں رکھا اور کنڈکٹر کو میری منزل کے بارے میں ضروری ہدایات دینے کے بعد نیچے اُتر گئے ٹرام پلازا دے ازابیلا کی روشنیوں میں سے نکلی اور شب کی تاریکی میں گڑگڑاتی بلندی کی جانب رینگنے لگی۔ اس ٹرامی سفر نے اتنا طول کھینچا کہ میں بار بار کنڈکٹر سے دریافت کرتا کہ کیمپنگ البتیمو گذر تو نہیں گئی؟ ہم واپس اشبیلیہ تو نہیں جا رہے؟ بالآخر تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد جب میں اس آہنی جھولنے میں جھولتا ہوا آخری شخص تھا ٹرام ایک سنسان اور تاریک

مقام پر رُک گئی۔

"کیمپنگ الینمو" کنڈکٹر نے رُک سیک میرے کاندھے پر ڈالتے ہوئے دُور ایک مدھم سی روشنی کی جانب اشارہ کیا۔میں نیچے اُترا اور بوڑھے بیل کی طرح سر جھکائے سُم گھسیٹنے لگا۔

کیمپنگ الینمو کی زمین اتنی سخت اور پتھریلی تھی کہ ہتھوڑے کی ضرب لگتے ہی میخ مٹی میں اُترنے کی بجائے کُبڑی ہو کر اوندھی ہو جاتی۔جوں توں کر کے خیمہ نصب کیا تو وہ ایک لاوارث غبارے کی طرح ڈھیلا ڈھالا اور پچکا ہوا تھا۔بہرحال تھکاوٹ اتنی غالب تھی کہ سلیپنگ بیگ میں گھسنے ہی نیند نے آ لیا۔رات کے پچھلے پہر تیز ہوا کے شور اور شدید سردی سے میری آنکھ کھل گئی۔باہر برف پوش سیرا نواڈا سے آنے والی سرد ہوائیں گرج رہی تھیں۔میرا خیمہ ایک ایسے بے بس پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا جسے کھلے میدانوں میں بارش نے آ لیا ہو۔تھوڑی دیر بعد سردی نے مزید زور پکڑا۔پہلے میرے جسم کا رُواں رُواں یوں کھڑا ہوا کہ اگر کوئی مجھے اس حالت میں دیکھ پاتا تو خوفزدہ کنڈیالا چوہا سمجھتا۔پھر مناسب قسم کی کپکپی طاری ہوئی اور بالآخر دانت جلترنگ کی طرح بجنے لگے۔یُوں محسوس ہوا کہ ہسپانیہ جیسے گرم ملک کی بجائے سوئٹزرلینڈ کے کسی گلیشئر پر خیمہ زن ہوں۔ہراتی پوستین اوڑھنے سے بھی کچھ افاقہ نہ ہُوا۔سورج کی پہلی شعاع کے پھوٹتے ہی میں نے خیمہ سمیٹا اور ٹرام نمبر ۲ پر سوار ہو کر واپس پلازا دے ازابیلا پہنچ گیا۔نزدیکی ٹورسٹ آفس نے میری ارزاں ترین رہائش کی فرمائش ملحوظِ خاطر رکھی اور بیبارمبلا کے قریب "پالنسیاں ریو" کا پتہ دے دیا۔

پانچ رہائشی کمروں پر مشتمل "پالنسیاں ریو" کا بوڑھا مالک ایک ڈھیلی ڈھالی نیلون اور رنگدی بنیان میں واقع ڈائننگ روم میں کھڑا ایک ایسے آئینے کے سامنے شیو بنا رہا تھا جسے اگر اُلٹا کر لٹکایا جاتا تو شاید صورت زیادہ صاف دکھائی دیتی۔اس نے میرا استقبال اتنی گرمجوشی سے کیا جیسے اس کا کوئی نوجوانی کا لنگوٹیا یار ادھر آ نکلا ہو۔کہتے ہیں ہسپانیہ میں ہر دوسرے شخص کا نام انتونیو ہوتا ہے۔مجھے یہاں پر کبھی پہلے شخص سے ملنے کا اتفاق نہ ہُوا ورنہ اس کا نام جان جاتا۔حسب معمول یہ بھی دوسرا شخص تھا اور انتونیو تھا۔

"بریکفاسٹ" اس نے میرے کندھے سے رُک سیک اُتارنے میں مدد دیتے ہوئے خوشدلی

سے پوچھا۔

"سی......ہاں" میں نے سر ہلایا "گر ایسا تشکر بہ"

"مالاگروسا۔ کون چینیا" انتونیو نے گالوں سے جھاگ صاف کرتے ہوئے منہ پھاڑ کر نان لگائی۔

مالاگروسا اور کون چینیا یوں چھپاک سے کمرے میں داخل ہوئیں جیسے وہ باہر کواڑ کے تھ چپکی والد صاحب کی آواز کی ہی منتظر تھیں۔ مالاگروسا دری سی گھپلی قسم کی تر و تازہ اور ہشش بشاش لڑکی تھی اور کون چینیا اسم بامسما پتلی دبلی، تیز طرار، چینے کی مانند۔

ناشتہ کافی، ڈبل روٹی اور دلیے پر مشتمل تھا۔ کافی کا گھونٹ بھرا تو عجب سا ذائقہ۔ دلیے کا چمچہ منہ میں ڈالا تو اس میں بھی ایک خاص مہک تھی۔ میں نے منہ بنا کر بہنوں جوڑی کی جانب دیکھا جو ناشتہ لگانے کے بعد میرے سامنے میز پر کہنیاں ٹکائے بڑی میت سے مجھے ٹکر ٹکر دیکھے جا رہی تھیں۔

"دیلی سیوسو، ہوں؟" انہوں نے بیک وقت اپنے پکوان کی داد چاہی۔

"ہاں" میں نے ان کا دل رکھنے کے لیے مجبوراً کہہ دیا "البتہ دودھ کا مزہ کچھ عجیب سا ہے۔"

"بکری کا ہے" انہوں نے مسرت سے مغلوب ہو کر کہا۔

"بکری کا؟" مجھے اُبکائی آ گئی۔ ضلع گجرات کا تارڑ جاٹ اپنے آپ کو دنیا کا قدیم ترین انسان سمجھتا ہے اگر اسے ایسا کم چینی والا حلوہ کھلا دیا جائے جس کے بعد ہونٹ صرف چپ چپ ہی کرتے رہیں بجائے اس کے کہ ایک دوسرے سے باقاعدہ چپکے ہی رہیں اور بکری کا دودھ سامنے دیکھ کر تو وہ فی الفور خودکشی پر مائل ہو جاتا ہے۔ شریک گلی میں سے گذرے تو شاید اُسے قتل تو کر دیے مگر اُسے بھی بکری کا دودھ پیش کرنے کے بارے میں کبھی نہیں سوچ سکتا۔ "بکری کا؟" شکست خوردہ تارڑ نے پھر پوچھا۔

"ہاں ہاں! ہماری پالتو بکری کا!" مالاگروسا اور کون چینیا نے کورس میں جواب دیا۔ "اسی ہوٹل میں رہتی ہے......لائیں؟"

"جی نہیں" میں نے دیدے پھاڑ کر ہاتھ بلند کر دیئے۔

ناشتے سے فارغ ہوا تو مالا ڈلبیک بورڈ سے کمرے کی چابی اُتار کر اُسے چٹکی میں پکڑے یُوں ہلانے لگی جیسے بچے چھوٹی مچھلیوں کو دُم سے پکڑ کر بیٹڈولم کی طرح ہلاتے ہیں، اور رینیا نے الماری میں سے دُھلی ہوئی سفید چادریں نکال کر بغل میں داب لیں۔ "چلو"۔ کمرہ اتنا مختصر تھا کہ دروازہ دھکیلنے پر بیتا بیس درجے کے زاویے پر پلنگ سے جا ٹکرایا! چادریں بدلنے کے بعد دونوں بہنیں بڑی بے تکلفی سے پلنگ پر براجمان ہوگئیں اور ہلا ہلا کر آپس میں گفتگو کرنے لگیں۔ میں کچھ دیر تو راہداری میں کھڑا اُن کی روانگی کا منتظر رہا، مگر وہ جب میری موجودگی سے قطعی لاتعلق ہو کر بات بے بات پر قہقہے لگانے لگیں تو میں نے اُکتا کر اندر جھانکا "پھر کبھی تشریف لائیے گا"۔

اُن دونوں نے ماتھے پر تیوریاں ڈال کر مجھے یُوں گھورا جیسے میں زبردستی ان کے ذاتی کمرے میں گھس آیا ہوں۔ پھر فوراً ہی انھیں یہ احساس ہو گیا کہ یہ کمرہ اُن کے والد صاحب نے حال ہی میں کرائے پر اُٹھا دیا ہے اور وہ بادلِ ناخواستہ اُٹھ بیٹھیں۔ "ہاں ضرور" مالا نے اپنے ایپرن کا دھاگہ کمر کے گرد کستے ہوئے ہنس کر کہا "لیکن پاپا کی ہدایت کے مطابق ہم دونوں آئیں گی...... مجھے معلوم ہے تمام تُورِسٹ شرارتی ہوتے ہیں"۔ اُن کے وداع ہوتے ہی میں نے دروازہ بند کیا اور کپڑے بدل کر لیٹ گیا۔

بکریاں! نیم خوابی کی کیفیت میں میرے کانوں تک لاتعداد بکریوں کے ممیانے کی آوازیں پہنچ رہی تھیں۔ بکریاں؟ میں فوراً اُٹھ بیٹھا۔ شاید یہ بکری کے دودھ کی کافی اور دیسے کا صوتی ردِ عمل ہے، میں نے سوچا۔ کھڑکی میں سے نظر آنے والی کسی تجارتی عمارت کی ڈھلوان چھت پر دھوپ سرخ ٹائلوں میں اٹک اٹک کر سمٹتی جا رہی تھی۔ شام ہونے کو تھی۔ میں نے کپڑے تبدیل کیے اور کمرے کا دروازہ کھولا۔ باہر ایک نہایت فاقہ زدہ سی بکری سر جھکائے کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے حسبِ مقدور نتھنے پھُلائے اور ایک واجبی سی "میں" کے تعارف کے بعد کمرے میں چلی آئی۔ کونے میں پڑے رُک سیک پر تھوتھنی ڈال کر میری ہراتی پوستین کو اِک عالمِ وارفتگی میں سُونگھا اور پھر شدید کرب کے عالم میں ممیانے لگی...... تو یہ سارا کیا دھرا میری پوستین کا تھا۔ چونکہ افغانستان میں کھالوں کو

کیمیائی اجزا سے دھونے کی بجائے صرف دھوپ میں سکھا کر ان کی پوستینیں بنائی جاتی ہیں۔ اس لئے مرنے کے بعد بھی بکری یا بھیڑ کی مخصوص بو ان پیراہنوں میں سے بدستور اٹھتی رہتی ہے۔ سٹاک ہوم میں مارگریتا نے میرے فلیٹ میں پہلی مرتبہ قدم رکھا تو ناک سکیڑ کر بولی "ہو سکتا ہے یہ میرا واہمہ ہو مگر میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اس فلیٹ میں ایک بکری موجود ہے" ظاہر ہے یہ میری پوستین کا کمال تھا۔ اب اگر یہ رُومان پسند ہسپانوی بکری کچے دھاگے سے بندھی ہراتی بکرے کی بُو سونگھتی میرے کمرے تک آ پہنچی تھی تو یہ ایک تاریخ ساز لمحہ تھا۔ پچھلے برس تک خراسان کے پہاڑوں میں چرتے اُس بکرے کی قسمت کی داد دیجیے جو مرنے کے بعد بھی صنفِ نازک کو یُوں تڑپانے پر قدرت رکھتا تھا۔ چونکہ بکریاں صرف دُودھ ہی نہیں، مینگنیں بھی برآمد کرتی ہیں، اس لیے میں نے بربلا کی ماری اس بکری کا کان پکڑا، اور گھسیٹ کر کمرے سے باہر کر دیا۔

بیبا رَمبلا جو یقیناً کسی زمانے میں بابِ رِملا کہلاتا ہو گا جدید غرناطہ کا ایک دل کش اور سرسبز چوک ہے۔ چنار کے درختوں تلے چھوٹے چھوٹے خوشنما کھوکھے ہیں جن میں زندگی بسر کرنے کے خوبصورت اجزا ملتے ہیں۔ پھول، کتابیں، اخبار، سُرخ شراب اور کافی۔ میں اس بیبا رمبلا کے ایک قہوہ خانے کے باہر بیٹھا تھا اور میرے سامنے باہر میز پر وطن سے آئے ہوئے اُن خطوط کا پلندہ دھرا تھا جو سفری ادارے تھامس کُک کی معرفت مجھے میرے پیاروں نے روانہ کیے تھے۔ دُور دیسوں میں وطن سے آئے ہوئے ایک بند خط کو کھولنا بھی کتنا خوشگوار تجربہ ہوتا ہے...... ابا جان کا خط! بیٹے تم نے بہت دیر کر دی۔ میں اب دکان پر بیٹھا بیٹھا تھک جاتا ہوں...... جلد آنے کی کوشش کرو۔ امّی نے لکھا تھا اپنی صحت کا خیال رکھنا...... سڑک پار کرتے وقت دائیں اور بائیں ضرور دیکھ لیا کرو...... بہنوں کے خط حسبِ معمول فرمائشوں سے پُر تھے! بھائی جان کوٹ۔ بھائی جان پلیٹ فارم شوز...... پھر دوستوں کے سندیسے۔ کیا سکور ہے؟ ایک لفافے پر خلافِ توقع ہسپانوی ٹکٹ چسپاں نظر آئے "ہاں! اصریحاً پاگل پن مگر میں پچھلے پانچ روز سے قرطبہ میں ہوں اور روزانہ تھامس کُک کے دفتر سے تمہارے بارے میں دریافت کرتی ہوں...... آخر تم اب تک یہاں کیوں نہیں پہنچے؟ تم سے ایک مرتبہ پھر

ملنے کی موہوم اُمید پر میں ہوائی کمپنی سے ایک ہفتے کی رخصت لے کر یہاں آئی تھی.... آج میں قرطبہ سے جا رہی ہوں...... مارگرنیا!" ذہن میں اٹکی ہوئی ایک گرہ فوراً کھل گئی قرطبہ میں بھی جب میں حسبِ معمول تھامس کک کے ہاں سے اپنی ڈاک وصول کرنے گیا تو مجھے بتایا گیا "چند روز پیشتر ایک خاتون روزانہ دفتری اوقات کے خاتمے تک یہاں بیٹھی آپ کا انتظار کرتی رہتی تھیں....." مگر اُس وقت تو میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ کوئی آشنا چہ جائیکہ سٹاک ہوم کی مارگرنیا مجھے دُور افتادہ قرطبہ میں ملنے چلی آئے گی۔ چنانچہ میں نے اس خبر کو زیادہ اہمیت نہ دی۔

تو یہ مارگرنیا تھی جس نے بچپن میں واشنگٹن ارونگ کی "الحمرا کی کہانیاں" پڑھی تھیں اور جو یہ جاننا چاہتی تھی کہ آخر غرناطہ میں کونسا ایسا فسوں ہے جو لوگوں کو سب کچھ چھوڑ کر وہاں جانے پر مجبور کر دیتا ہے...... کونسا ایسا فسوں ہے؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا..... الحمرا! جواب آیا..... الحمرا!

جہاں حُسن رچ گیا ہے

"جب بادِ نسیم چلتی ہے تو غرناطہ کے اشتیاق میں
سوزشِ قلب اور سوزشِ دید پیدا ہوتا ہے۔
خدا غرناطہ کی ہر گھاٹی کو
برسنے والے بادلوں سے سیراب فرمائے۔
یہ وہ ملک ہے جس کے گھروں میں حُسن رچ گیا ہے۔
اور یہ وہ سرزمین ہے جس کے شوقِ دید میں غم غلط ہوتا ہے۔
اے بلند ترین غرناطہ تجھے خدا کی قسم ہے بتا
کیا ایک سرگرداں اور گریاں شخص کے لیے تیری طرف کوئی راہ ہے؟
مجھے اس کے مناظر کی تر و تازگی اور وادیوں کی عمدگی نے
مشتاق بنا دیا ہے اور یہی چیزیں آنکھوں کی طراوت ہیں۔
اے مخاطب دیکھو اور جب تو دیکھے گا
کہ قصرِ الحمرا سے تجھ تک گُلِ لالہ کا سلسلہ قائم ہے۔
جب غرناطہ کے بلند مقامات پر پھریرے لہراتے ہیں
اس وقت گویا شفق پر بجلیاں چمکتی ہیں۔
دریائے شنیل نے نیام سے ہندی تلوار کھینچ لی ہے
جس پر موتی اور عقیق جڑے ہوئے ہیں۔
اس کے درخت پہلو سے جب خوشبو پھیلتی ہے

تو دانۂ مشک کی خوشبو کا دھوکہ ہوتا ہے۔
اور جب چشمِ ابر اشک ریز ہوتی ہے
تو اس کے باغوں میں بالو بر کے غنچے کھل جاتے ہیں"

(ابن حسّان)

قصر الحمرا کے حصار کی ایک شکستہ دیوار پر تانبے کی ایک تختی ہے۔ دھوپ میں چمکتی اس تختی پر نظر نہیں ٹھہرتی اور جب ٹھہرتی ہے تو میکسیکو کے ایک شاعر اکازا کا مندرجہ ذیل شعر کندہ دکھائی دیتا ہے جو اس نے غرناطہ جیسے حسین شہر میں ایک اندھے گداگر کو دیکھ کر کہا تھا۔

"اے عورت، اِس گداگر کو بھیک دو،
کہ غرناطہ جیسے شہر میں ہونا
اور آنکھوں سے محروم ہونا
زندگی میں اِس سے بڑی اذیت اور کوئی نہیں"

اُس قدیم حُسن کا پرتو جو ایک ہزار برس پیشتر ابن حسّان کو غرناطہ کے گھروں میں رچا دکھائی دیا آج بھی اہلِ غرناطہ کے دلوں پر نقش ہے۔ جب کوئی ہسپانوی گہری سوچ میں گُم ہو تو پوچھا جاتا ہے "کیا غرناطہ یاد آ رہا ہے؟" مسلم غرناطہ کو ختم ہوئے صدیاں بیت گئیں۔ الحمرا کے ایوانوں پر ہلال کو غروب ہوئے پانچ سو برس ہونے کو آئے اور اب انھیں غرناطہ یاد آتا ہے۔ اُن کے ہم وطنوں نے مسلمانوں کے خلاف مذہب کی مقدس جنگ جیت لی.......... کچھ عرصے کے لیے اہلِ غرناطہ بھی اس فتح کے جشن میں شریک ہوئے مگر آہستہ آہستہ غرناطہ کے در و دیوار کی اداسی اور الحمرا کے اُجڑے ایوانوں کی سوگواری اُن کے دلوں میں اُترنے لگی.......... انھوں نے اپنے شہر میں ہوتے ہوئے بھی اسے کھو دیا تھا.......... غرناطہ کی شکست ان کی اپنی شکست تھی.......... یہ پچھتاوا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تقویت پکڑتا گیا...... اور آج اہلِ غرناطہ پر اگر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو اپنے آپ کو یہ کہہ تسلی دے لیتے ہیں" یہ آفت تو معمولی ہے۔ یہ آفت تو معمولی ہے غرناطہ کے چھن جانے کے صدمے سے کہیں کم.........؟ وہ اُداس ہوں تو پوچھا جاتا ہے "غرناطہ تو

.. چھین گیا؟"

یوں تو دنیا میں ایسے بے شمار شہر ہیں جو صرف اپنی شاندار تاریخ اور قدیم عمارتوں کے رے سانس لے رہے ہیں۔ مگر وہاں تاریخ مر چکی ہے، باشندے اس کے بوجھ تلے دفن ۔غرناطہ کو بھی "تاریخ کے رواں چشموں نے سیراب کیا مگر یہاں خوبصورتی آئی اور آ کر گئی۔ سبیکہ پہاڑی اور اس پر شفق رنگ الحمرا کی عمارتیں گواہ ہیں کہ خوبصورتی کے ان ہر کا تسلسل سینکڑوں برس کی بے توجہی۔ انسان کی جنگی تباہ کاریوں اور وقت کے پاؤں تلے وندے جانے کے باوجود نہیں ٹوٹا۔ البسین محلّے کی مُورش حویلیوں کی بلند دیواروں نے . تک اپنے اندر رچے حُسن کو سمیٹا ہُوا ہے۔ چنبیلی کی بیلیں جُدا نہ ہونے والی ہم آغوشی صورت میں عربی شعراء کی شعلہ نوائی سے مزّین ان گھروں کی محرابوں پر چھائی ہوئی ۔باغیچوں کے درمیان سنگِ سُرخ کے فوّاروں میں سے اُبلتے ہوئے پانی نے ماضی اپنا رابطہ نہیں توڑا۔

پُرانے غرناطہ کے کئی قہوہ خانوں میں آج بھی عورتوں کے بیٹھنے کے لیے علیحدہ انتظام ہے۔ ہری حُسن کے پہلو بہ پہلو ہزاروں سال گذر جانے کے باوجود غرناطہ کا صوتی حُسن بھی جُوں کا ں قائم ہے۔ آپ الحمرا کے کسی گوشے میں ہوں البسین کی تنگ گلیوں میں سے گذر رہے ں یا سیکرے مانتو کی کسی ڈھلان پر سستا رہے ہوں، لاتعداد فواروں میں گرتے اور یر زمین راستوں میں رواں اور چشموں میں اُبلتے پانیوں کی سرسراہٹ ایک آبی پائل کی نند آپ کے کانوں میں ہمہ وقت شُنن شُنن چلتی رہتی ہے۔ جیسے ہزاروں برفانی سانپ پ کے گرد شُوک رہے ہوں، جیسے ابھی ابھی بارش ہو کر ہٹی ہو۔ کسی بے حد اُداس کیفیت تحت مچادو نے اِنھیں "سربستہ روتے ہوئے پانی" کہا تھا، مگر پانی کی یہ رواں بہتی ہوئی دھنیں ہمیشہ سے وادیٔ غرناطہ میں نہیں گونجتی رہیں...... اُن دنوں جبلِ سبیقہ پر ایک موی حصار تھا اور اِس کے گرد...... خاموشی!

اشبیلیہ معتمد کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے، قرطبہ عبدالرحمٰن کا مرہونِ منّت ہے۔ اسی طرح

غرناطہ کا ذکر بھی الحمرا کے اولین معمار محمد الاحمر کے بغیر نامکمل رہتا ہے۔ بقول معتمد لوشی الاحمر سلطنتِ غرناطہ ایک گھوڑی کی بدولت ملی۔ لوشی کے دادا کے پاس ایک تیک رفتار گھوڑی تھی جسے خریدنے کی خاطر ایک نصرانی تاجدار اس کے پاس آیا۔ ابھی معاملہ طے نہ ہُوا تھا رات کو خواب آیا، گھوڑی ارجونہ کے قصبے میں لے جاؤ وہاں محمد بن یوسف نامی ایک غریب کاشت کار ہے جو مستقبل میں غرناطہ کا بادشاہ ہو گا۔ چنانچہ لوشی گھوڑی لے کر ارجونہ چلا وہاں سرائے میں ایک شخص نے گھوڑی خریدنے کی خواہش کی اور تعارف کروایا۔ نام محمد بن یوسف بن محمد بن احمر ہے۔ آباؤ اجداد یمن سے آئے۔ بنو نصر میں سے ہوں۔ مورث اعلیٰ حضرت سعدؓ بن عبیدہ تھے جو حضورؐ کے ہمراہ تمام غزوات میں شریک رہے۔ لوشی فوراً حامی بھر لی۔ الاحمر کے پاس لوجہ قلاکت پوری رقم نہ تھی۔ چنانچہ قسطوں میں ادائیگی کے وعدے پر گھوڑی حاصل کی۔ ۱۲۳۲ء میں جب الاحمر بطور فاتح غرناطہ میں داخل ہُوا تو اسی گھوڑی پر سوار تھا۔

الاحمر ایک ایسے دور میں تخت نشین ہُوا، جب اُس کے گرد مسلمان ریاستیں عیسائیوں کے سیلاب کے آگے کچے گھروندوں کی طرح منہدم ہو رہی تھیں۔ قرطبہ کے مینار پر صلیب آویزاں تھی اشبیلیہ کے وادی الکبیر کے پانیوں میں عیسائی فوجوں کی برچھیاں تیر رہی تھیں۔ الاحمر صرف اپنی سلطنت بچانے کی خاطر قشتالیہ کے حکمران فرڈیننڈ کا حلیف بن گیا۔ چنانچہ جب فرڈیننڈ اشبیلیہ کو زیر کرنے کے لیے آگے بڑھا تو الاحمر بھی معاہدے کے مطابق پانچ سو سواروں کے ہمرکاب اس مسلمان ریاست تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کی خاطر ساتھ ہو لیا۔ یہ ایک افسوسناک اور قابلِ مذمت حرکت تھی مگر ارجونہ کے اس غریب کسان نے اپنے ہم مذہبوں کی شاہ رگ کاٹ کر ان کا خون اپنی سلطنت کی بنیادوں میں اُنڈیلا۔ اشبیلیہ کو عیسائیوں کے حوالے کرنے کے بعد جب وہ باب البیرہ سے شہر غرناطہ میں داخل ہُوا تو رعایا نے "الناصر والغالب" کے نعرے لگائے۔ الاحمر کے ضمیر نے ملامت کی، وہ گھوڑے سے اُترا اور سر جھکا کر بولا "ولا غالب الا اللہ" یہ نعرہ بنو نصر سلطانوں کا سمبل بنا اور الحمرا کے در و دیوار پر جا بجا تزئین کے لیے استعمال ہُوا۔

فتح اشبیلیہ کے بعد الاحمر گوشہ نشین ہو گیا۔ وہ البیسن میں واقع اپنے قصر کے باغ میں ٹہلتا رہتا اور اس کی نظریں جبل سبیقہ پر لہراتے نصرانی پرچم پر جمی رہتیں جو مسلمانوں کی لاشوں اٹھا۔ شاید اُس کی یہی اُداسی اور بے چینی الحمرا کی تعمیر کا باعث بنی ۔۔۔۔۔۔ تاج محل کی بنیادیں نے سے چار سو برس پیشتر یعنی ۱۲۴۸ء میں الاحمر نے سیرا نوادا کے برفانی پس منظر میں سبیقہ پر بنے اُموی حصار کو منہدم کیا اور الحمرا کا سنگِ بنیاد رکھا۔ الاحمر بذاتِ خود دوروں، معماروں اور تزئین کاروں کو ہدایات دیتا۔ تعمیر میں اتنی عجلت سے کام لیا کہ ات کو بھی مشعل و چراغ کی روشنی میں کام جاری رہتا۔ سرخ روشنی، سرخ پتھر اور الاحمر نسبت قصر کا نام الحمرا رکھا گیا۔۔۔۔۔۔۔ ۷۹ سال کی عمر میں جب ایک بغاوت فرو کرنے خاطر فوج لے کر غرناطہ سے باہر نکلا تو ایک سوار کا گھوڑا چمکا اور اس کا نیزہ فصیل سے چیخ کر ٹوٹ درباریوں نے بُرا شگون جانا اور سلطان کو واپس چلے جانے کو کہا۔ الاحمر نہ مانا اور گھوڑے ایڑھ لگا دی۔ غرناطہ کی فصیلوں سے چند میل کے فاصلے پر گھوڑا بدکا اور اسے نیچے گرا دیا۔ تھی اُٹھا کر واپس لائے۔ سلطان کو خون کی قے ہوئی اور نوتعمیر الحمرا کے سُرخ بُرجوں تلے جان سے دی۔ نعش الحمرا میں لائی گئی اور قلعے کی مسجد میں نمازِ جنازہ کی ادائیگی کے بعد جبلِ سبیقہ کی گھاٹی میں دفن کر دی گئی۔ میں نے اپنے قیام کے دوران جبلِ سبیقہ کے پہلو میں واقع مکانوں متعدد مکینوں سے الاحمر کی قبر کے بارے میں استفسار کیا۔ بیشتر اہلِ غرناطہ اپنے سر پر کھڑے قصر کے معمار کے نام سے ہی ناآشنا تھے۔ اگر کسی کو علم بھی تھا تو وہ بھی اس امر سے ناواقف تھا کہ الاحمر جبلِ سبیقہ پر دفن ہوا تھا۔ مجھے بہت بعد میں علم ہوا کہ آخری تاجدارِ غرناطہ ابوعبداللہ الحمرا چھوڑتے وقت اپنے بزرگوں کی ہڈیاں بھی ساتھ لے گیا تھا" تاکہ بعد میں عیسائی ان کی بے حرمتی نہ کر سکیں۔۔۔۔۔۔ اور یوں شاہجہان کے برعکس الاحمر اپنے تعمیر کردہ شاہکار کی پہنائیوں میں محوِ خواب ہونے کی بجائے افریقہ کے کسی نامعلوم مقام پر خاک نشین ہے۔

وہ کونسا فسوں ہے!

شاعرِ مجادو کے پوشیدہ رو تے ہوئے پانیوں کی بے نام سرسراہٹ میرے تلے مسلسل گُہمک رہی تھی۔ الحمرا کے فوّاروں اور نالابوں میں سے بہہ نکلنے والا پانی زیر پائپوں میں سنسناتا ہوا میرے قدموں تلے رواں تھا۔ شائیں شائیں کرتی ہوئی آبی موسیقی بُلند سے بُلند تر ہوتی جا رہی تھی۔ ایک بے جہت گنگناتا شور اُس سفید دیوار کے پیچھے فوّاروں میں سے اُبل کر مجھ تک پہنچا جس کے سائے میں مَیں ڈھلوان فٹ پاتھ پر الحمرا کی رواں دواں تھا۔

ایک پُر پیچ آہنی دروازے میں سے "ہسپانوی باغوں میں ایک رات" کی دُھن کے خالا کا چھوٹا سا گھر نظر آیا۔ خالا کے قریبی دوست شاعر گارسیا لورکا نے اسی گھر کے پائیو... کر.... الحمرا کے سرخ سائے میں :.... اپنی خوبصورت ترین نظمیں تخلیق کیں۔

"ہوٹل واشنگٹن ارونگ" سے دائیں ہاتھ مڑتے پر بُلند و بالا درختوں کے درمیان اٹھتی سڑک کے ماتھے پر الحمرا کی سرخ فصیل نظر آئی۔ فصیل کے گرد ڈیوک آف ولنگٹن کے لگائے ہوئے کالے پاپلر اور ایلم کے درختوں کے جُھنڈ تھے.... خزاں کی آمد کی نوید.... تانبے کی طرح سرخ ہو رہے تھے۔ دُور سے یُوں لگتا جیسے یہ پتّے بھی فصیل کی طرح سرخ ... سے تراشیدہ ہیں۔ جُوں جُوں میں الحمرا کے قریب ہو رہا تھا پانی کی موسیقی بھی بُلند ہوتی جا... یہاں تک کہ یہ دبی دبی آہٹ اُبلتی دستک میں بدلی.... سرسراہٹ میں شور کا عنصر شا... ہوا اور سنسناتی آوازیں ہر سُو گونجنے لگیں.... لمحہ لمحہ تیز سے تیز تر۔ اک نکتۂ عروج کی جا...

رواں . . . . میں اس سے پیشتر بھی کہیں اس مسلسل بوچھاڑ کی لپیٹ میں آیا تھا . . . ہاں! بولیرو! یہ یقیناً ریول کی ترتیب دی ہوئی دُھن "بولیرو" ہی تھی جو ہر سُو گونج رہی تھی۔

ابتدا میں ہر سُو سناٹا ہے۔ پھر خاموشی کے عمیق سمندروں پر تیرتی ہوئی بانسری کی ایک مدھم لَے آپ تک پہنچتی ہے . . . . سکوت کا ایک اور لمحہ . . . . کہیں دُور وائلنوں کا ایک جھرمٹ جھُرجھُری لے کر بیدار ہوتا ہے۔ پھر سازوں کا ایک اور قافلہ اپنی آمد کا اعلان کرتا ہے . . . . بے حد آہنگی کے ساتھ! اس دھیمے پس منظر میں بانسری کی وہی مخصوص لَے ایک مرتبہ پھر اُبھرتی ہے مگر پہلے سے قدرے بُلند . . . . یہ دُھن آہستہ تہ کی گہرائیوں میں سے دھیرے دھیرے بُلندیوں کی جانب سرکنے لگتی ہے۔ لمحہ بہ لمحہ جذباتی انجام کے دہانے تک پہنچنے کی سعی میں موسیقی کا یہ لاوا اُبلنے لگتا ہے . . . . اور پھر دُور کہیں طبلِ جنگ بجتا ہے۔ سُریلی بانسریوں کا ایک رَیلا آتا ہے۔ وائلنیں ایک طوفانی لہر کی صورت میں گرد و پیش پر حاوی ہو جاتی ہیں . . . . اب ہر سُو بے پناہ شور ہے۔ ساز ایک بپھرے ہوئے طوفان کی طرح دھاڑ رہے ہیں جیسے وہ اپنے راستے میں حائل ہونے والی ہر شے کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائیں گے۔ صرف ایک ہی جستجو ہے۔ ایک ہی لگن ہے . . . . احساس کی معراج تک پہنچ جانے کا جنون۔ موسیقی کی یہ وحشی کیفیت آپ کے کانوں پر حملہ آور ہوتی چلی جاتی ہے اور پھر . . . . یکدم ایک ہی جست میں لاوا دہانے تک پہنچ کر باہر اُبل جاتا ہے . . . . بانسری کی لَے آہستہ سے دُور ہوتی جاتی ہے اور پھر خاموشی کے گہرے سمندروں میں اُتر جاتی ہے . . . . مکمل سکوت!

"خدا کرے تم سینکڑوں برس جیو . . . . مجھے بیس پسیتے دو۔"

"بولیرو" کی دُھن کے ساتھ یہ خوشگوار فقرہ بھی میرے کانوں میں اُترا۔ میں نے چونک کر سامنے دیکھا تو ایک عمر رسیدہ جپسی اپنے سُرمہ زدہ دیدے پھاڑے دونوں ہاتھ اٹھائے آسمان کی جانب ٹکٹکی باندھے یوں دیکھ رہی تھی جیسے بلاواسطہ اللہ میاں سے محوِ گفتگو ہے۔ "غرناطہ میں تو بیس پسیتے میں روسٹ مُرغ کی ایک ٹانگ خریدی جا سکتی ہے۔" میں نے سوچا اور آگے بڑھ گیا۔

"خدا کرے تمہارے درجن بھر بیٹے ہوں . . . . بیس پسیتے!"

شادی سے پہلے اس قسم کی زرخیز دُعا آپ کے پاؤں نہیں روک سکتی چنانچہ میں چلتا رہا۔

"خدا کرے تمہارے خوبصورت مکھڑے پر برکت نازل ہو۔۔۔"

اس مرتبہ میں نے اُسے بیس پسینے مانگنے کی بھی مُہلت نہ دی اور لپک کر مطلوبہ سکے اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

"گراسیا سنیور"! اُس نے بیس پسینے اپنی ٹماٹر نما کمر کے ساتھ بندھی گٹھڑی میں گرائے اور میرا کندھا تھپک کر بولی "تم مُور ہو؟"

اس ہونے یا نہ ہونے کے سوال کا جواب میرے پاس نہ تھا چنانچہ خاموش رہا۔

"قصر الحمرا دیکھنے کے لئے تمہیں مجھ سے بہتر راہبر نہ ملے گا۔۔۔" وہ سرگوشی میں بولی "مجھے اُن زیر زمین راستوں کا علم ہے جہاں مُوروں نے اپنے خزانے دفن کئے تھے۔۔۔ میں تمہیں اس بُرج میں لے جاؤں گی جہاں دو شہزادیوں کو قید کیا گیا تھا۔۔۔ اب بھی رات کے پچھلے پہر ان کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔۔۔۔ صرف سو پسینے!"

مجھے خاموش پاکر اُس نے اپنی فیس گھٹا کر اسی پسینے کر دی اور سایہ دار راہگذر کے آخر میں کھڑے پھاٹک کی جانب اشارہ کر کے کہنے لگی "یہ وہ سحر زدہ دروازہ ہے جسے باب العدل کہتے ہیں۔ اس کے گرد اُگی ہوئی جھاڑیوں میں وُہ طلسمی گھوڑا سوتا ہے جو آدھی رات کو بیدار ہو کر البیسین کے محلّوں میں اپنے سوار غرناطہ کے آخری مور بادشاہ ابوعبداللہ کو تلاش کرتا ہے۔"

"واقعی؟" میں نے خانہ بدوش بڑھیا کی داستان طرازی سے محظوظ ہوتے ہوئے ہنس کر پوچھا۔

"ہاں" وہ سر جھٹک کر رازدارانہ لہجے میں بولی "اور چاندنی راتوں میں وہ سامنے والی پہاڑی کی غاروں میں سے ابوعبداللہ اپنے ساتھیوں سمیت باہر نکلتا ہے۔ ان کے جسموں پر زرہ بکتر چمکتی ہیں ان کے عربی النسل سفید گھوڑوں کے سُمّوں کی چاپ تک سُنائی نہیں دیتی۔ جب وہ اس مقام پر آتے ہیں جہاں ہم کھڑے ہیں تو باب العدل اُن کے استقبال کے لئے خود بخود کھُل جاتا ہے۔ محافظ اپنی اپنی جگہ ساکت ہو جاتے ہیں کہ مُور ان پر سحر کر دیتے ہیں اور پھر ابوعبداللہ الحمرا کے اجڑے ایوانوں میں بیٹھ کر اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کے غم میں آنسو بہاتا ہے۔۔۔ صرف پچاس پسینے!"

"اِس سے تو بہتر ہے کہ میں تیس پسینے میں واشنگٹن ارونگ کی "قصر الحمرا کی کہانیاں" خرید کر خود ہی یہ داستانیں پڑھ لوں۔۔۔۔ بیس پسینے کی بچت!"

خانہ بدوش مائی نے پہلے تو مجھے خشمگیں نظروں سے گھورا کہ میں نے اس کی چوری پکڑ لی تھی اور پھر تمباکو سے زرد پڑتے ہوئے دانت نکال کر ہنسنے لگی "میں بھول گئی تھی کہ تم خود تو رہو ورنہ امریکی سیاح تو ایسی داستانیں سن کر میرے مرید ہو جاتے ہیں . . . . اب ایک بوڑھی جپسی کرے بھی کیا؟ جوانی میں سیکرے مانتو پہاڑی کی گپھاؤں میں رقص کرتی ہے اور اس کی کمائی پر خاوند اور بھائی گلچھرے اڑاتے ہیں ۔ میری طرح بوڑھی ہو جائے تو بیٹے الحمرا کے دروازے پر چھوڑ جاتے ہیں کہ پھول اور کاسترنات بیچو، بھیک مانگو اور ہماری شراب کا بندوبست کرو . . . چلو دس پسیتے ہی دے دو۔"

میں نے مسکرا کر دس پسیتے اس کے حوالے کر دیئے۔

"کسی شام مقدس پہاڑی کے دائیں جانب ساتویں غار میں چلے آؤ . . . . میری بیٹیاں بے حد خوبصورت ہیں اور ماریا جیسا زامبرا تو غرناطہ بھر میں کوئی نہیں ناچتا . . . ." اس نے میرے کندھے پر ایک زوردار دھپ رسید کی اور پھر میرے پیچھے آنے والے ایک جنشی سیاح کے گرد ہو گئی . . . "خدا تمہارے خوبصورت مکھڑے پر . . . ."

جبل سبیقہ پر پھیلی عمارتوں کو تین واضح حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ بلند ترین سطح پر القصبہ باحفاظتی قلعے کے سنگلاخ برج اور فصیلیں ہیں ۔ نچلی سطح پر قصرِ الحمرا کھڑا ہے اور ایک گہری کھائی کے پار جبل سبیقہ کی چوٹی پر نصری سلطانوں کی ذاتی خلوت گاہ جنتہ العریف دکھائی دیتی ہے ۔ باہر سے دیکھنے والوں کو یہ عمارتیں برجوں، فصیلوں اور جھروکوں کا ایک ایسا بے ہنگم مجموعہ نظر آتی ہیں جن میں ترتیب کا مکمل فقدان ہے اور حسنِ تعمیر سے قطعی عاری ہیں ۔ مگر بھدے اور کھردرے ظاہر کا باطن انتہائی دلکش اور اثر انگیز ہے ۔ مُوروں کے اخراج کے بعد یہ حسین قصر ابتلائے زمانہ کا شکار ہوا ۔ شاہی ایوان سنسان ہو گئے ۔ باغوں اور پوشیدہ کنجوں پر خزاں خیمہ زن ہوئی ۔ فواروں کا پانی سمٹتا ہوا انہوں میں جذب ہو گیا ۔ مقامی باشندوں نے فصیلیں ادھیڑ کر ان کی اینٹوں سے مکان بنا لیئے ۔ ویران برجوں میں چمگادڑوں اور ابابیلوں نے گھونسلے بنائے اور خاموش ایوانوں میں چوروں اچکوں اور فقیروں نے ڈیرے ڈال لیئے ۔ یہ بے مثال قصر یوں اجڑا کہ دن کے وقت بھی لوگ اس کے قریب نہ جاتے تھے ۔ فرانسیسیوں کے قبضے کے دوران اس ویرانے کا نصیب چند سالوں کے لئے چمکا ۔ در و بام کی مرمت ہوئی ۔ باغوں میں ہریاول نے سر اٹھایا اور فواروں میں پانی جاری ہوا۔

فرانسیسی شکست سے دوچار ہوئے تو الحمرا چھوڑتے وقت اس کی فصیلوں، برجوں اور ایوانوں تلے بارود کی سرنگیں بچھا کر فتیلے کو آگ لگا دی... کہ وہ الحمرا کی اولاد تو نہ تھے کہ انہیں اس کی تباہی پر قلق ہوتا۔ پہلے فصیل کا بیشتر حصہ ہوا میں اڑا اور پھر چند خوبصورت برج مسمار ہوئے مگر خوش قسمتی سے جونہی جلتا ہوا فتیلہ قصرِ الحمرا کے قریب پہنچا ہوسے نامی ایک اپاہج نے اپنی جان پر کھیل کر اسے بجھا دیا۔ فرانسیسیوں کے بعد کچھ عرصہ کے لئے گورنر غرناطہ نے اسے اپنی اقامت گاہ کے طور پر استعمال کیا مگر اس کے افسردہ ماحول سے دہشت زدہ ہو کر شہر میں منتقل ہو گیا۔

انہی دنوں الحمرا کے سب سے بڑے محسن واشنگٹن ارونگ کا غرناطہ میں ورود ہوا۔ ایک رومان پسند امریکی ادیب جو اپنی منگیتر کی موت سے دل برداشتہ ہو کر ہسپانیہ چلا آیا اور ایک مدت تک اجاڑ الحمرا کے ایک حصے میں مقیم رہا۔ اس نے کالی سیاہ راتوں میں اس غمگین عمارت کے ایوانوں میں چمگادڑوں کو چیختے سنا.... دریچوں اور جھروکوں میں سے سنسناتی ہوائیں اس کے گرد آسیب زدہ روحوں کی طرح منڈلانے لگتیں۔ سنگِ مرمر کے فرشوں پر خزاں رسیدہ پتے بکھرتے تو ان کی سرسراہٹ ارونگ کے کانوں میں سسکیوں کی طرح اترتی۔ اس ماحول میں ارونگ نے "قصرِ الحمرا کی کہانیاں" لکھیں اور پھر یورپی اقوام کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ ان کے سر دبر اعظم میں حسن کا ایک سرخ شرارہ الحمرا کی صورت میں جبلِ سبیکہ میں دبا پڑا ہے۔ لوگ ارونگ کی کہانیاں پڑھتے اور سحر زدہ ہو کر غرناطہ کا رخ کر لیتے۔ الحمرا کا مقدر تلوار کی دھار سے خاک نشین ہوا اور اسے ایک ادیب کے قلم نے گمنامی کے کھنڈروں میں سے کھود کر عظمت بخشی۔

الحمرا کا صدر دروازہ "باب العدل" یوسف اول کا تعمیر کردہ ہے۔ اس کی وسعت اور بلندی کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے اگر ایک چوکور مینار یا سرخ چٹان کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہو۔ پھاٹک کے عین اوپر ایک پنجے کا نشان ثبت ہے۔ پیش دہلیز پر ایک بہت بڑی کنجی کی شبیہہ ہے۔ پنجہ اسلام کے پانچ اصولوں کی علامت اور کنجی اقتدارِ اعلیٰ کی مظہر۔ حسبِ معمول ان دو شبیہوں کو بھی مقامی لوگ سحر کی نشانیاں گردانتے ہیں۔ روایت کے مطابق جس بادشاہ نے یہ دروازہ تعمیر کروایا وہ ایک بہت بڑا ساحر تھا۔ اس لئے الحمرا کی دوسری عمارتوں کے برعکس "باب العدل" کی ایک اینٹ بھی آج تک نہیں اکھڑی۔ جس روز پنجہ اپنی جگہ سے پھیل کر کنجی کو گرفت میں لے گا

ٹوٹ جائے گا اور پورا باب العدل" منہدم ہو جائے گا۔ ارونگ "باب العدل" کے بارے لکھتا ہے" اس کے گرد ایسے سحر ہیں کہ پہرے دار بہار کی راتوں میں قدیم نغمے سنتے ہیں اور "نا ثیر سے مدہوش ہو جاتے ہیں۔ اب اس جگہ کے گرد و پیش کے چپے چپے پہ مدہوشی اور سرمستی ی ہے"۔ ان دنوں پھاٹک کے نواح میں ہسپانوی جوڑے اس مقامی روایت کا ناجائز فائدہ تے ہیں اور جھاڑیوں میں مدہوش پڑے ملتے ہیں۔

میں اس دروازے سے اندر داخل ہوا تو ہسپانیہ میں بقیہ مورش عمارتوں کی طرح "موروں کی نحوست" نے کے لیے چوکھٹ میں حضرت مریم کے مجسمے تلے موم بتیاں روشن تھیں۔"باب العدل" اندر داخل ہوتے ہی قصر الحمرا نظر نہیں آ جاتا بلکہ فصیل کے پہلو میں بل کھاتی ہوئی ایک سڑک سامنے آتی ۔ دائیں طرف جہاں الحمرا کی جامع مسجد واقع تھی اب وہاں ایک عظیم کلیسا کھڑا ہے۔ تمام وازے بند تھے ورنہ میں اُس عمارت کا باطن دیکھ لیتا جہاں تاریخ دان ابن خلدون، فلسفی طفیل اور ابن باجا درس دیا کرتے تھے۔ نشتقندی نے اہل یورپ سے استفسار کیا تھا" کیا سب میں ابن باجا ایسا ایک بھی فلسفی اور ماہر موسیقی موجود ہے؟" ڈھلوان سڑک کے آخر میں ب الخمر کا مختصر چوکھٹا ہے۔ یہاں غیر مسلم رعایا کے لیے ٹیکس فری شراب تقسیم کی جاتی تھی۔ باب الخمر ساتھ ایک راستہ القصبہ کے حفاظتی قلعے کی جانب جاتا ہے۔ بائیں جانب وہ غیر مکمل جناتی ہے جو کارلوس پنجم نے یہ بڑ مار کر شروع کیا تھا کہ میں ایسا شاندار قصر تعمیر کروں گا جس کے "بلے میں الحمرا ماند پڑ جائے گا۔ کارلوس نے الحمرا کا ایک بڑا حصہ منہدم کر کے مسلمان رعایا پر ٹیکس "یا اور محل کی تعمیر شروع کرنے کا حکم دے دیا۔ شاید یہ الحمرا کے طلسم کا اثر تھا کہ جونہی اس نبیادوں کو نامحرم ہاتھوں نے چھُوا پورا غرناطہ ایک شدید زلزلے کی زد میں آ گیا۔ کارلوس نے سے بدشگونی جانا اور اس بھاری پتھر کو جُرم کہہ کر رکھ دیا۔ آج غرناطہ کے منچلے اس نامکمل عمارت محل کی بجائے الحمرا کا "سرونٹ کوارٹر" کہتے ہیں۔ یہ سرونٹ کوارٹر اب ٹکٹ گھر کا کام دیتا ہے بس نے پچاس پسیتے میں داخلے کا ٹکٹ خریدا تو اس پر درج شدہ نمبر کے مطابق مجھ سے پیشتر اس سال چار لاکھ ننانوے ہزار نو سو ننانوے سیاح الحمرا کی زیارت کر چکے تھے اور میں نے حساب برابر کر دیا تھا یعنی پانچ لاکھواں سیاح!

ٹکٹ خرید کر باہر نکلا تو باب الخمر کے پہلو میں براجمان فوٹو گرافروں نے گھیر لیا۔

"موروں کے بادشاہ کے لباس میں فوٹو اتروائیے .... خنجر بھی ہے، تلوار بھی ہے، نہ بھی ہے ...."

ایک زمانے میں میو ہسپتال لاہور کی بیرونی دیوار کے سائے میں فوٹو گرافروں کے غول سیاہ پردے لٹکائے چمگادڑوں کی طرح بیٹھے نظر آتے تھے۔ شوقین حضرات کے پس منظر کے طور پر منقش پردے بھی موجود تھے جن پر تاج محل اور شالیمار کے ایسے ایسے دیکھنے میں ملتے تھے کہ اصل عمارت دیکھنے کے خیال سے ہی وحشت ہوتی تھی۔ چار آنے، تاج محل کے آگے اکڑ کر اس طرح تصویر کھنچوائیے جیسے آپ ابھی ابھی اس عمارت کی فارغ ہوئے ہیں۔ یہاں بھی الحمرا کے تصویری پردوں کے آگے درجنوں سیاح عرب لباس ملبوس تصویریں اتروا رہے تھے۔ بوڑھے امریکی بڑی بڑی پگڑیاں باندھے ہاتھوں میں خنجر لئے نقلی دانت نکال رہے ہیں اور عینک بدستور آنکھوں پر جمی ہے۔ ان کی تھل تھل کرتی حرم سرا کی لونڈیوں کا سوانگ بھرے آنکھوں تلے نقاب، کندھے پر صراحی اور دیدے مٹکا رہی۔

اکثر سیاح کارلوس کے محل میں سے ٹکٹ خرید کر باب الخمر کے راستے القصبہ کی جا جا رہے تھے مگر میں ان سے الگ ہو کر سنگ مرمر کی ایک چوکھٹ کی طرف بڑھا .... کون ایسا خوش نصیب ہے، میں نے اپنے آپ سے سوال کیا .... الحمرا! جواب آیا .... الحمرا! چو "الحمرا" کی تختی آویزاں تھی۔ ماضی میں اترتا ہوا وہ غار جو صدیوں سے اپنے اندر موروں کے فن تعمیر سرخ شاہکاروں کو محفوظ کئے ہوئے تھا۔ چوکھٹ پار کی تو اپنے آپ کو ایک نیم تاریک کو میں پایا ... کونے میں سے محافظ کا سایہ حرکت میں آیا اور بظاہر ایک دیوار پر ہاتھ رکھ کر سوال کیا "الحمرا؟"

"سی۔ الحمرا" میں نے اندھیرے میں ابھرتی ہوئی دیوار پر جمے ہاتھ سے نظریں ہٹائے سر ہلا دیا۔

اس نے چپکے سے دیوار کو دھکیلا اور ایک پوشیدہ پھاٹک کھل کر میرے سامنے اس کو لے آیا جس کی چاہت نے مجھے دوسری تمام چاہتوں کو چھوڑ کر یہاں آنے پر مجبور کر دیا تھا۔

سُرخ دیواروں کے درمیان سنگِ مرمر کے ایک کٹورے میں سے پانی سرد لاوے کی مانند اُبل رہا تھا۔ سرسراہٹ میں ایک ابدی تسلسل تھا۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا.... سُرخ دیواروں کی سرحد نے نیلے آسمان کے ایک چوکور ٹکڑے کو کاٹ کر اپنے اوپر معلق کر رکھا تھا۔ جیسے آسمان کا یہ ٹکڑا ابھی اِس قصر کی طرح حال سے الگ تھلگ ہو گیا ہے.... ماضی کا ایک حصّہ بن چکا ہے۔ نو سو برس قدیم آسمان کا ٹکڑا.... اس سفید کٹورے کے پس منظر میں پتلے اور نازک ستون ایک ایسی عمارت کا بوجھ اُٹھائے ہوئے تھے جو سلاطینِ غرناطہ کا ایوانِ خاص تھی۔ میں صحن عبور کر کے اس ایوان میں گیا جس کے متعدد محرابی جھروکے قدیم غرناطہ کی جانب کھلے تھے۔ دائیں جانب کے جھروکے میں سے وُہ فصیل دکھائی دے رہی تھی جو جبلِ سبیقہ کے نشیب و فراز پر کسی چینی اژدہے کی طرح بل کھاتی ہوئی القصبہ کی بلندیوں تک چلی جاتی ہے۔ فصیل کے نیچے جبلِ سبیقہ کی سرسبز ڈھلان دریائے حدرہ کے پانیوں میں گم ہو رہی تھی۔ حدرہ کے کنارے ایک سڑک ہے جس کے پہلو میں سے البیسن کی وُہ پہاڑی سر اٹھاتی ہے جس پر قدیم غرناطہ آباد تھا.... اور اب بھی آباد ہے مگر اُن مکینوں کے بغیر جنہوں نے اِسے آباد کیا۔.. یوُں الحمرا اور پُرانا غرناطہ حدرہ کے آر پار یکساں بلندی پر واقع ایک دوسرے کی جانب رُخ کئے خاموش کھڑے ہیں۔

دیوانِ خاص میں داخل ہوتے ہی جھروکوں میں سے غرناطہ کے سفید مکان اور حویلیاں، سرو اور کھجور کے درخت یوُں دکھائی دیتے ہیں جیسے قریب آنے پر انکشاف ہو گا کہ دراصل یہ ایک جہازی سائز کی رنگین تصویر تھی جسے محراب کی صوُرت کاٹ کر جھروکے پر چسپاں کر دیا گیا تھا۔ چونکہ یہ جھروکے فرش کی سطح سے شروع ہوتے ہیں اس لئے ان کے آگے حفاظتی سلاخیں لگا دی گئی ہیں تاکہ سیاح حضرات چھت کی خوبصورتیوں میں گُم منہ اٹھائے چلتے چلتے جہانِ فانی کی جانب ہی نہ چل دیں۔

الحمرا کے ناقابلِ بیان حد تک خوبصورت حصّے پلستر کی وہ چھتیں ہیں جنہیں اگر میں صرف منقش، دیدہ زیب یا فنِ تعمیر کا شاہکار کہوں تو یہ الفاظ سینکڑوں دوسری عمارتوں پر بھی پوُرے اترتے ہیں.... تو پھر میں انہیں خوبصورتی کو بیان کرنے والے الفاظ کی مختصر دنیا میں کیسے سمیٹ لوُں؟ بس یوُں جانئے جیسے کوُزہ مصری کی ایک بہت بڑی ڈلی کو پہلے سونے کے پانی سے سینچا گیا.... یوُں سیراب کیا گیا کہ زرد پیلے پانی نے اس کے مساموں میں جذب ہو کر اس کی سفیدی

کو سنہری رنگ میں بدل دیا۔ پھر اس سنہری ڈلی کو دنیا کے عظیم ترین تخلیق کار نے برسوں کی ریاضت سے تراشا اور نازک ستونوں کی باہوں پر ڈال دیا۔ سلجوق طرزِ تعمیر کے مدرسوں اور مقبروں میں ہمیں شہد کی مکھی کے چھتے ایسے خاکے ملتے ہیں۔ الحمرا میں بھی ڈیزائن چھتوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے مگر جہاں سلجوق طرزِ تعمیر میں پتھر کے استعمال سے نقش جامد نظر آتے ہیں۔ یہاں سنہری پلستر انہیں ایک غیر مرئی اور متحرک خوبصورتی میں بہائے جاتا ہے۔ ان سنہری چھتوں کی جانب غور سے دیکھئے تو یہ ایک نامعلوم آہنگی کے ساتھ بلند تر ہوتی چلی جاتی ہیں یہاں تک کہ آپ کو احساس ہوتا ہے کہ آپ کسی بلند عمارت میں نہیں بلکہ کھلے آسمان تلے خلائی وسعتوں کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ دیواروں پر ابنِ زمارک کی شاعری اتنی نزاکت سے سانس لیتی ہے کہ پورے الحمرا پر اُس کے شعری دیوان کا گمان ہوتا ہے۔ جا بجا نصری سلطانوں کا علامتی نعرہ "ولا غالب الا اللہ" اتنی نفاست سے اُبھرتا ہے جیسے سنہری چونے کے دھاگے سے در و دیوار پر کاڑھا گیا ہو۔ کارلوس پنجم نے درست کہا تھا "وہ آدمی کتنا بدقسمت تھا جو اس عمارت سے جُدا ہو کر چلا گیا"۔ اسی دیوان میں کولمبس ملکہ ازابیلا کے سامنے دو زانو ہوا اور نئی دنیا کی دریافت کے لئے اخراجات کا طلب گار ہوا۔

دیوانِ خاص کے صحن میں پھیلے سفید پیالے کے سامنے دیوار میں ترچھے زاویوں پر نصب دو دروازے ہیں جو "کورٹ آف مارٹل" پر کھلتے ہیں۔ "کورٹ آف مارٹل" یعنی "صحن حنا"... مہندی کی ان جھاڑیوں کی نسبت سے جو مستطیل تالاب کے چاروں اور شفاف پانی میں جھانکتی ہے۔ تالاب میں الحمرا کے بلند ترین برج القمارش کا عکس تیرتا ہے۔ قمارش شہر کے معماروں کے تعمیر کردہ ۱۴۸ فٹ بلند اسی برج میں ابوالحسن نے اپنے بیٹے عبداللہ اور اس کی ماں عائشہ کو ایک بغاوت کی پاداش میں قید کیا تھا۔ کہا جاتا ہے ایک شب عائشہ نے اپنے دوپٹے کو گرہیں دے کر برج کے روزن سے لٹکایا اور عبداللہ اس کی مدد سے جبل سبیقہ پر اُتر کر فرار ہو گیا۔ برج القمارش میں ان دنوں سیاحوں کا داخلہ بند ہے۔ اس برج کے پتھریلے حجم تلے بھی دیوانِ خاص کی عمارتوں کا سلسلہ ہے البتہ تالاب کی جانب کھلتے برآمدے کو "ہال آف بوٹس" کا نام دیا گیا ہے کیونکہ اس کی چھت کی ساخت اوندھی پڑی کشتیوں سے مماثلت رکھتی ہے۔

"صحنِ حنا" اور کارلوس کے محل کو ایک ناتراشیدہ اور بےپھر بلی دیوار علیحدہ کرتی ہے ۔ یہاں رتن طرزِ تعمیر کی نفاست اور بعد کے ہسپانیہ کے بھاری بھرکم عمارتی عمل کے درمیان سنگین فرق ئی شدت کے ساتھ سامنے آتا ہے ۔ یوں لگتا ہے جیسے کارلوس کا یہ پتھر بلا زودہ الحمرا کے دایوانوں کو بُل ڈوزر کی طرح روندتا آیا اور پھر صحنِ حنا کے مہندی رچے حسن کو دیکھ کر دم بخود یہ ۔ دیوار کے ساتھ کان لگائیں تو محل میں چلنے پھرنے سیاحوں کے قدموں کی گونج سنائی ہے ۔

الحمرا کا حنائی حسن صحنِ ایوانِ خاص میں بھی متاثر کرتا ہے ۔ "صحنِ حنا" کے تالاب پر جھکی ہی کی جھاڑیوں میں بھی پوشیدہ ہے مگر... "شیروں کے صحن" میں قدم رکھتے ہی نازکی لب پتلے ستونوں کا جھاکا... سنگِ سرخ کے منقش تھال کو کندھوں پر اٹھائے بارہ شیروں کا ... فوارے میں سے اُبلتے تھال میں سے گرتے اور شیروں کے منہ میں سے جاری پانیوں ر... در و دیوار پر اُگے نقش و نگار کی باریکیاں... تھال پر کندہ ابن زمرک کا قصیدہ کہ سلطان کی ہیبت سے پتھرا گئے ہیں... انہارِ فردوس کی نمائندہ اُن چار آبی نالیوں کی نرل نرل رِل مدھر سرسراہٹ جو صحن کے گرد کھڑے ایوانوں اور برآمدوں میں بکھرے فواروں کا پانی خ شیروں کے قدموں میں ڈالتی ہیں... اور سرخ جھنوں پر سے صحن میں اُترتی دھوپ کا رُوپ... سب مجتمع ہو کر یوں وارد ہوتے ہیں کہ چشمِ شوق پلک جھپکنے میں چشمِ حیراں ہو تی ہے ۔ یقین نہیں آتا کہ یہ حیرت کدہ ذہنِ انسانی کی تخلیق سے وجود میں آیا اور کھریا مٹی چونے اور سنگِ مرمر ایسے زمینی عناصر سے تخلیق ہوا ۔

جیمز مشنر اپنی کتاب "آئی بیریا" میں لکھتا ہے "میں جب عیسائی مورخوں کی تاریخی کتب کر کے الحمرا میں جا نکلتا ہوں تو مجھے ان کے مظالم یاد نہیں رہتے... کم از کم وہ ذوقِ سلیم مالک تھے..." اسی ذوقِ سلیم کے لئے یوسف اوّل کو داد دیجئے جس نے "شیروں کا صحن" کروایا ۔ صحن کے چار اطراف ایک سو اٹھائیس صحرائی خیموں کے نیزوں کی طرح پتلے مرمریں ونوں پہ بھربھرے چونے سے تعمیر کردہ بادشاہوں کا ایوان، بحر داں بہنوں کا ایوان، بنو سراج ایوان اور شاہی حرم کی عمارت کچھ یوں معلق ہیں جیسے ہوا کے ایک ہی جھونکے سے زمیں بوس

ہو جائیں گے۔ مگر یہ چونے کا استعمال ہی تھا جس نے اس عمارت کو بے پایاں استحکام
گرمی اور بارش دو ایسے عناصر ہیں جو کسی بھی عمارت کی کمزوری اور بالآخر شکستگی کا با
بنتے ہیں۔ الحمرا میں استعمال شدہ چونے کی خاصیت یہ ہے کہ شدید گرمی میں اس
مسام کھل جاتے ہیں اور پوری عمارت سانس لینے لگتی ہے اور یوں گرمی کا اثر زائل
ہے۔ اُدھر بارش کا پانی اس کی ساخت کے زاویوں کی بنا پر مساموں کے اندر داخل
ہوتا اور اس کے آگے ایک باریک جھلی کی صورت میں تن جاتا ہے اور اس طرح عما
کو نم آلود ہونے سے بچا لیتا ہے۔

غرناطہ کے قیام کے دوران میں میرا بیشتر وقت الحمرا میں گذرتا تھا۔ یہ قصر میرے سامنے
دھوپ میں بھی چمکا۔ میں نے "صحن حنا" کو بارش میں بھیگتے دیکھا "اور شیروں کے صحن" کو بادلوں
ڈھکے آسمان تلے افسردہ بھی پایا۔ ان بدلتے موسموں میں میں نے الحمرا کے چمکنے، بھیگنے اور ا
روپ تو دیکھے مگر ایک روز جو مناظر میری آنکھوں کے سامنے بدلے وہ معجزے کی حد تک ا
تھے۔ . . . اُس صبح باب العدل کے کھلتے ہی میں الحمرا میں چلا آیا اور شیروں کے صحن میں ر
چمڑے کی ایک کرسی پر بیٹھ کر ڈائری میں اپنے تاثرات سمیٹنے لگا۔ اُس وقت تیز دھوپ تھی
پوری عمارت سفیدی میں نہائی ہوئی تھی . . . . . برف کی طرح سفید۔ پھر سیرا نوادا کی بلندیوں
بادلوں کا ایک گھنگھور جھرمٹ اُترا اور جبل سبیقہ کی تمام عمارتوں پر زور کا مینہ برسنے لگا . . . ا
اتنا گہرا ہو گیا کہ الحمرا کے محافظوں نے سیاحوں کی سہولت کے لئے محرابوں میں موم بتیاں
رکھ دیں . . . . فوارے کے تھال میں سے پانی ایک چھالر کی صورت میں گرنے لگا۔ چاروں نا
کا پانی کناروں سے اُبل کر صحن میں بچھی بجری پر پھیلنے لگا۔ مالٹے کے درختوں پر چھینٹوں کی بو
اتنی شدید تھی کہ پتوں کو سر اٹھانے کی مہلت نہ ملتی تھی۔ کبھی کبھار بجلی خاموشی سے چمکتی "اور شیرو
کے صحن" پر سے ایک سنہری سانپ کی طرح لہراتی ہوئی گذر جاتی۔ تھوڑی دیر بعد تیز اور یخ
ہوائیں الحمرا کے ایوانوں میں پاگل روحوں کی طرح چیخنے لگیں۔ سرو کے درخت دوہرے ہو کر
ہوئی سرخ چھتوں کو چھونے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے بادل چھٹ گئے۔ سورج کی کرنیں ایک
مرتبہ پھر شیروں کے صحن میں آنکلیں مگر بصد حیرت میں نے دیکھا کہ الحمرا اب سفید نہیں تھا بلکہ

عمارت سُرمئی رنگ کی تھی۔۔۔ جیسے دھواں لگا سمرقند تو بازہ کا پتھر۔۔۔ ایک انتہائی مختصر
کے بعد سرمئی رنگ بھی پھیکا پڑنے لگا جیسے مسامدار پتھر اُسے ہولے ہولے چوس رہے ہوں
اُس جگہ ہلکا گلابی رنگ الحمرا کی دیواروں میں سے پھوٹنے لگا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں
تھا۔ میں بنو سراج کے ایوان کے اندر گیا تو وہاں بھی رنگ بدل چکے تھے۔ ایوان کی
جالیاں اور دیواریں سب گلابی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ سبز پرندوں کی طرح منقّد
چھوٹے باغوں پر جھکتے ہوئے چہرہ کے بھی گلاب ہو رہے تھے۔۔۔ جوں جوں دھوپ
زت میں اضافہ ہوا توں توں گلابی رنگ بھی بکھرنے لگا یہاں تک کہ الحمرا ایک مرتبہ پھر
ی کی جانب لوٹ آیا۔۔۔ برف کی طرح سفید!
تیروں کے ضمن کے مستطیل رقبے کو اگر ذہن میں لایا جائے تو چوڑائی کے دونوں رُخ برآمدے
میں سے ایک کی چھت پر چمڑے پر منقش بادشاہوں کی تصاویر آویزاں ہیں۔ اسی مناسبت
اسے بادشاہوں کا ایوان کہا جاتا ہے۔ کسی غیر معروف مصور کی بنائی ہوئی یہ تصاویر نہایت
ہیں۔ لمبائی کی جانب بنو سراج کا وہ ایوان ہے جس کے اندر داخل ہوتے ہی گائیڈ انتہائی
یکل انداز میں قتل و غارت کے ایسے ایسے قصے بیان کرتا ہے کہ بے چارے سیاح باہر
ونت تھر تھر کانپ رہے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بنو نصر کی ایک شہزادی بنو سراج کے ایک
ن کو چوری چھپے ملا کرتی تھی۔ عبداللہ کو اس معاشقے کا علم ہوا تو بنو سراج کے خلاف اس کا
تعصب اُبل کر باہر آگیا۔ چونکہ مجرم گمنام تھا سوائے کیفیت کے اس لئے عبداللہ نے بنو سراج
م سرداروں کو الحمرا میں ایک دعوت پر مدعو کیا اور اسی ایوان میں اُن سب کو تہ تیغ کروا دیا۔
اپ کو مزید خوفزدہ کرنے کی خاطر آپ کی توجہ فوارے کے تھال پر پڑے سُرخ دھبوں کی جانب
ل کروانا ہے جو مُبینہ طور پر بنو سراج کے خونِ ناحق کے چھینٹے ہیں۔ یہ الگ بات کہ ہر چند
عد اس تھال پر کوئی کیمیائی مادہ چھڑکنے سے ہی یہ خونِ ناحق رنگ لاتا ہے۔
ایوانِ بنو سراج کے مقابل شاہی حرم کی عمارت ہے۔ یہاں سلطانہ کے محل میں فرش میں
ٹے چھوٹے سوراخ نظر آتے ہیں جن میں سے زیرِ زمین جلتے ہوئے لوبان اور اگربتیوں کی
حرم میں پہنچتی تھی۔ اسی محل میں الحمرا کا سب سے خوبصورت اور الجھاؤ کی حد تک منقش

جھروکہ ہے جو باغ لنڈ جارا پر کھلتا ہے۔ سلطانہ کے اس جھروکے میں بیٹھئے تو الحمرا کی اونچی دیواروں میں پنہاں باغ لنڈ جارا کے بلند سرو آپ کا ماتھا چھونے کو آتے ہیں۔ درمیان کا فوارہ اتنے سکون سے پانی اگلتا ہے کہ اسے مسلسل دیکھنے سے آنکھوں میں نیند اترنے

الحمرا نہ صرف اپنے صوری حسن میں یکتا ہے بلکہ اس کا فنِ تعمیر آج بھی اہلِ مغرب کو ورطہ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ پچھلے سات سو برس سے اتنی بڑی عمارت ناقابلِ یقین حد تک پتلے ستونوں پر کیسے قائم ہے؟ دراصل اندلس کے معماروں نے تعمیر الحمرا کے لئے متساوی الاضلاع تکون کو بنیاد بنایا جس میں قاعدے کے مطابق کششِ ثقل کی لہریں ایک دوسرے کو منسوخ کرتی ہیں۔ چنانچہ ستونوں پر متساوی الاضلاع محرابیں تعمیر کی گئیں اور یوں عام خیال کے برعکس پورا بوجھ نازک ستونوں پر نہیں بلکہ محرابیں اس بوجھ کو کچھ یوں تقسیم کرتی ہیں کہ یہ ستونوں میں پانی کی طرح بہہ کر زمین میں جذب ہو جاتا ہے۔ جیسے آسمانی بجلی اونچی کی گئی عمارت پر گرنے سے کو نقصان پہنچائے بغیر تار میں سے گذر کر زمین میں جذب ہو جاتی ہے۔ اس سائنسی ... باوجود ہسپانوی معماروں کا کہنا ہے کہ جواز کچھ بھی ہو اتنی بڑی عمارت ان نازک ستونوں پر دیر قائم نہیں رہ سکتی۔ اسی خوف کی بنا پر انہوں نے تمام محرابوں میں لوہے کی سلاخیں گاڑ دی ہیں۔ میرے خیال میں یہ سلاخیں عمارت کو سہارا دینے کی بجائے مزید کمزور کر رہی ہیں کیونکہ بوجھ کا کچھ حصہ ستونوں میں سے بہنے کی بجائے ان سلاخوں میں منتقل ہو جاتا ہے اور تناسب کی بنا پر بے جا دباؤ کا سبب بنتا ہے۔

الحمرا کی دیواروں پر پھیلے ہوئے نقوش اور اشعار کو دیکھ کر یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ ا... فٹ لمبے اور ایک فٹ چوڑے لکڑی کے سانچوں میں ڈھال کر پھر ٹکڑیوں میں دیواروں ... کیا گیا ہے۔ کمال یہ ہے کہ جوڑ بالکل نظر نہیں آتے۔ اس قصر کے معماروں نے چھو... چھوٹے نکتے پر بھی بے حد توجہ دی۔ مثلاً وہ حصے جو باقاعدگی سے استعمال میں آتے ہیں فرش، سنگ مرمر کے ہیں۔ ستون اور دیواریں جہاں تک ہاتھ پہنچ سکتا ہو، ملائم پتھر کے ہیں ... سے خراب نہ ہو جائیں . . . . اور اس سے بلند تر تمام سطحیں کھریا مٹی اور چونے سے بنی ... زیریں حصوں میں بھی یہی اجزا استعمال میں لائے جاتے تو الحمرا کب کا انسانی ہاتھوں کے

ہی انتہا کی منزل تک پہنچ گیا ہوتا۔

حسن انتہا کو پہنچے تو چاہنے والوں کے جلو میں ایک آدھ حاسد رُوسیاہ بھی ساتھ چلتا ہے ۔ الحمرا کا حاسد جسے رُوسیاہ تو نہیں کہہ سکتے کہ موصوف سفید فام ہیں ۔ یہودی مصنف فریڈرک برگیبور کے نام سے میرے سامنے آیا ۔ الحمرا پر تحقیق کے دوران میں مجھے برلن سے شائع کی گئی اس کی کتاب

"ALHAMRA, A CYCLE OF STUDIES ON THE ELEVENTH CENTURY MOORISH SPAIN"

پڑھنے کا اتفاق ہوا ۔ برگیبور نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ الحمرا دراصل مسلمانوں کا تعمیر کردہ نہیں بلکہ اس کی تعمیر کا سہرا غرناطہ کے یہودی وزیر ابن نغریلہ یوسف کے سر بندھتا ہے ۔ مصنف نے اپنے ضخیم مقالے کی بنیاد ابن گبرول کی ایک نظم کے مندرجہ ذیل دو شعروں پر رکھی ہے ۔

"الحمرا خدا نے الاحمر کو دیا . . . .
اور اس نے اس میں پانی جاری کیا
پھر یوسف نے یہاں ایک محل تعمیر کیا . . . .
جو عبداللہ سے بہت بہتر تھا"

برگیبور کا موقف یہ ہے کہ ابن گبرول کی یہ نظم اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ الحمرا کو الاحمر نے تعمیر نہیں کیا تھا بلکہ یہ قصر اسے ورثے میں ملا اور اس نے صرف اس میں پانی جاری کیا ۔ وہ لکھتا ہے کہ الحمرا کا اصل بانی اگرچہ عبداللہ نامی ایک شخص تھا مگر بعد میں یوسف کے ہاتھوں اس کی دوبارہ تعمیر ہوئی ۔ اپنے دعوے کے استدلال میں برگیبور کہتا ہے کہ بارہ شیروں کا فوارہ دراصل ہیکل سلیمانی میں واقع اس فوارے کی نقل ہے جسے بارہ بیل اسی طور کندھوں پر اٹھائے کھڑے تھے اور ہیکل سلیمانی کی نقل صرف ایک یہودی النسل ہی کر سکتا ہے . . . برگیبور کے بعید از قیاس تھیسس میں سب سے بڑا سقم یہ ہے کہ شیروں کے فوارے کا تھال اپنے کناروں پر ابن زمرک کا قصیدہ نقش کئے ہے جس میں واضح طور پر الحمرا کے معمار الاحمر کا ذکر ملتا ہے ۔ اب یہ تو ناممکن ہے کہ فوارے کے لئے شیر تو یوسف نے بنوائے اور ان پر تھال یوسف اول نے بنوا کر نصب

کر دیا۔ چنانچہ اپنے مقالے میں اس واضح شگاف کو پُر کرنے کے لئے برگیبور نے یہ بہانہ بنایا کہ شیروں کے فوارے کا اصلی تھال علیحدہ کر کے ایوان بنو سراج میں رکھ دیا گیا تھا اور اُس کی جگہ مسلمانوں نے ایک اور تھال تراش کر شیروں کے کندھوں پر جڑ دیا... اور اس لئے شیروں کے قد اور تھال کی چوڑائی میں کوئی مناسبت نہیں... ایوان بنو سراج کے درمیان میں رکھے تھال کو میں نے برگیبور کے مقالے کی روشنی میں پرکھا۔ اوّل تو اس کی پشت پر کوئی ایسا نشان نہیں جس سے ظاہر ہو کہ کسی زمانے میں یہ شیروں کے کندھوں پر سوار تھا اور دوم اس کا سائز اتنا مختصر ہے کہ اگر اسے ایوان بنو سراج میں سے اٹھا کر شیروں کے فوارے پر رکھ بھی دیا جائے تو یہ ان کے حجم میں نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔ فرض کیجئے برگیبور کا استدلال درست ہے، شیروں کا فوارہ یہودی وزیر یوسف کا تعمیر کردہ ہے تو پھر اس صحن کے دونوں اطراف کھڑے ان ایوانوں کو کیا کیجئے گا جو چھت سے فرش تک قرآنی آیات اور "ولا غالب الا اللہ" سے اٹی پڑی ہیں۔ بہر حال میں نے برگیبور کی کتاب انتہائی دلچسپی سے پڑھی اور میں یقیناً اس کی دیدہ دلیری کا معترف ہوں۔

قصر سلطانہ کے پہلو میں ایک تنگ دروازہ جبل سبیقہ کے ساتھ پُرخطر انداز میں چمٹی ہوئی ایک شکستہ بالکونی پر کھلتا ہے... اکثر سیّاح اس بالکونی پر قدم رکھنے سے گریز کرتے ہیں اور ایک ایسے شخص کی رہائش گاہ دیکھنے سے محروم رہتے ہیں جس کے قلم نے انہیں پہلی مرتبہ الحمرا کے وجود کا پتہ دیا۔ واشنگٹن ارونگ کے کمرے کی کھڑکیاں قدیم غرناطہ کی جانب وا ہوتی ہیں۔ ایک حجرہ کا اونچی دیواروں میں گھرے ایک چوکور پاٹیو پر کھلتا ہے جس کے درمیان میں صرف ایک سرو کا درخت اس نیند خانے میں سے نکلنے کے لئے سر اٹھائے کھڑا ہے۔ پاٹیو میں دیکھئے یوں لگتا ہے کہ آپ ایک ایسے کنوئیں میں جھانک رہے ہیں جس کے کائی زدہ پانی میں سے ایک سرد فوارے کی طرح پھوٹ رہا ہے۔ کھڑکی میں سے مولے حسن کی چوٹی دکھائی دیتی ہے اور الحمرا کے قدموں تلے بسے غرناطہ کا شور و غل، بچوں کی آوازیں، ... کا بھاؤ اور گٹار کی رُکی رُکی دھنیں وقفوں کے بعد آپ کے کانوں میں پہنچتی رہتی ہیں۔ ایسی جگہ پر اگر انسان ارونگ کی طرح حقیقت سے دور ہوتا چلا جائے اور تصوراتی مہم جوئی پر کمر باندھ لے تو یہ قابلِ فہم ہے۔ میں چاہتا تھا کہ کچھ وقت ان دو کمروں میں بھی گزاروں۔ شاید اس ماحول کی تاثیر سے میرے ذہن میں بھی اُس طلسم کا ایک ذرہ اٹک جائے جو

رنگ کے قلم میں سے بے پناہ روانی سے بہتا چلا آتا ہے۔ بدقسمتی سے یہ کمرے فرنیچر سے بالکل ری ہیں اور ننگے فرش پر بیٹھ کر میں دوسرے سیاحوں کے لئے دلچسپی کا سامان نہیں بننا چاہتا ۔ آتش داں کے اوپر ایک سادہ تختی پر حسب ذیل عبارت رقم ہے۔

"ان کمروں میں ۱۸۲۹ء میں واشنگٹن ارونگ نے "الحمرا کی کہانیاں" لکھیں"۔

ارونگ کی رہائش گاہ دیکھنے کے بعد میں نے زیر زمین شاہی حمام کی عمارت دیکھنے کے لئے ا۔ یہاں رنگوں کا امتزاج بے حد پرسکون تھا۔ گہرا نیلا، ہلکا سبز، کہیں کہیں سنہری۔ انہیں دیکھ کر ..نا کی رضائی کے دھیمے رنگ یاد آتے ہیں۔ گنبد میں سوراخوں پر رنگدار شیشے جڑے ہیں حمام .. بھاپ کی لپیٹ میں آتا ہوگا تو غسل کرنے والوں کو یہ شیشے یقیناً دھند میں ڈبڈباتے ستاروں طرح دکھائی دیتے ہوں گے۔

شاہی حمام میں سے نکل کر میں ایک مرتبہ پھر سلطانہ کے محل میں آیا اور واپس شیروں کے . کی جانب چل دیا۔ یہاں مجھے ابن قشقند کے تراشے ہوئے بھدے شیروں کی ایک اداس ملاحت نظر آئی۔ اگر کسی بھی ایوان میں سے صحن کا رخ کریں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سامنے کے تین شیر فوارے کے تھال سے علیحدہ ہو کر آپ کی جانب بڑھ رہے ہیں۔

شیروں کے صحن میں صبح کے برعکس اس وقت سیاحوں کی ریل پیل تھی... گائڈ حضرات .. شدہ تاریخی معلومات کا چارہ ان صابر بھیڑوں کے آگے ڈھیر کر رہے تھے اور اس سے پیشتر کہ یہ صابر جانور اسے منہ ماریں "خواتین و حضرات فوٹو لیجئے" کا نادر شاہی حکم نازل ہو جاتا۔ بھیڑوں کے گلے میں سے کیمروں کی کلک کلک کی آوازیں برآمد ہوتیں اور وہ پورے چالیس سیکنڈ میں شیروں کے صحن کو بھگتا کر کسی اور جانب نکل جاتا۔ ایک جرمن نوجوان بادشاہوں کے ایوان میں فرش پر لیٹا ٹیلی فوٹو لینز کی مدد سے چھت پر کندہ عبارتوں کی تصاویر بنا رہا تھا۔ الحمرا میں جب بھی آنا ہوتا، یہ جرمن کسی نہ کسی کونے کھدرے میں ہمیشہ الٹ پلٹ زاویوں میں معلق ملتا۔ دائیں آنکھ بند بائیں پر لمبی تھوتھنی والا کیمرہ ثبت۔ جیسے اللہ میاں نے آنکھ کے سوراخ میں آنکھ لگانے کی بجائے کیمرہ فٹ کر کے اسے اس دنیا میں بھیج دیا ہو۔ کبھی پورا چہرہ دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا۔ ایک روز علیک سلیک ہوئی تو کہنے لگا "پچھلے تین ماہ میں قصر الحمرا کی چار ہزار تصاویر اتار چکا ہوں۔ اگلے ماہ تک

اس مُورِش محل کا ایک ایک کونہ میری قلم پر محفوظ ہو جائے گا . . . . اس کے بعد الحمرا اپنے نہ ر سے شیطان اٹھا لے جائے مجھے پروا نہیں . . . میں ان تصاویر کی مدد سے جرمنی میں ل نیا الحمرا تعمیر کر سکتا ہوں"۔

شیروں کے صحن میں سے نکلا تو حفاظتی فصیل کے ساتھ اُن بے مثال ایوانوں کی نشانیا ملیں جو اب مٹ چکے ہیں۔ جو کبھی شیروں کے صحن کے پہلو بہ پہلو جبل سبیقہ کے آخری سرے پھیلے ہوئے تھے۔ ایک شکستہ ایوان بھی نظر آیا۔ ٹوٹا ہوا جھروکا جو حسب معمول ندیم غرناطہ کی جا بدن دریدہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سلطان کی ذاتی مسجد تھی۔ اس کھنڈر کے سامنے صحن حنا کی مانند ا خوبصورت تالاب اب بھی موجود ہے جس میں الحمرا کے پتھروں ایسی سرخ مچھلیاں تیرتی ہیں . کے قریب پھولوں کے چند تختے ہیں جن کی ناہموار سطح سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نیچے کیا ہوں گی جو لالہ و گل میں ہمارے سامنے نمایاں ہو رہی ہیں۔ اس باغ کے عقب میں الحمرا کے محا اور بالیوں کے رہائشی کوارٹر ہیں۔ مسجد کے کھنڈر سے پرے ایک وسیع میدان ہے جس میں ا. . بکھری پڑی ہیں۔ جا بجا ملبے کے ٹیلے ہیں اور کریر کی طرح کی جنگلی جھاڑیاں ہیں۔ الحمرا کی فصیل کی دیواروں کو سہارا دیتی ہوئی نکلتی ہے اور پھر متعدد برجوں میں سے گذرتی اس اجاڑ میدان کے گ لپٹی باب العدل تک چلی جاتی ہے۔ یہاں سے جبل سبیقہ کی آخری بلندیوں پر ایستادہ جنت العارفیہ کے باغات اور عمارتیں نظر آنے لگتی ہیں۔

الحمرا کی فصیل اور جنت العریف کے درمیان گہری کھائی ہے چنانچہ وہاں پہنچنے کے لئے . . قصر سے گذر کر باب العدل کے راستے باہر آیا اور تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد سینکڑو سرو کے درختوں میں گھری اُس راہگذر پر آنکلا جسے "سرو کے درختوں کا راستہ" کہا جاتا ہے ۔ ا درختوں میں سرو کا وہ درخت بھی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے نیچے بنو نصر کی شہزا بنو سراج کے ایک نوجوان کے ساتھ سرگوشیاں کرتی پائی گئی تھی اور یوں بنو سراج کے چھتیس سردا اس ندیم سرو تلے پروان چڑھنے والے رومان کی پاداش میں تہ تیغ ہوئے۔

اگر قصر الحمرا وسیع کینوس پر پھیلی ہوئی ایک شاہکار تصویر ہے تو جنت العریف ان تمام رعنا کو سمیٹے ہوئے ایک منیچر پینٹنگ کی طرح ہے۔ مختصر، جاذب اور گہرائی لئے ہوئے۔ موسم گرما میں سلا . .

کی خنک جائے پناہ بنا رنگی اور لیموں کے شگوفوں کی مہک میں ڈوبا ہوا یہ مختصر قصر اتنا خاموش
سکون ہے کہ اس کے صحن اور ملحقہ باغوں میں مچلتے فواروں کا مدھم شور بھی کانوں پر گراں گزرتا ہے
۔ ارونگ نے اپنی داستانوں میں ایک ایسے نصری شہزادے کا ذکر کیا ہے جسے سلطان نے
میں ہی صرف اس لئے جنت العریف میں پابند کر دیا تھا کہ وہ کہیں عشق کے جذبے سے روشناس
جائے ۔ لیکن اسے یہاں بھی محبت کے لمس نے چھو لیا کہ لفظ اور رنگ کسی کو روشن نہ دیکھے تا
ں تو تنہائی اور خاموشی بھی محبت کی زبانیں ہیں۔"

جنت العریف کا اکلوتا صحن "پاتیو دے لا ریا" یا باغِ شاہی کہلاتا ہے ۔ ایک مختصر برآمدے
اگے مستطیل تالاب میں سے درجنوں فوارے چھوٹ کر دیواروں سے بھی بلند ہو جاتے ہیں ۔ باغِ شاہی
پہلو میں سے مختصر آبشاروں اور پوشیدہ جھرنوں کے درمیان پتھریلی سیڑھیاں بلندی کی طرف جاتی
۔ ایک مقام پر یہ سیڑھیاں یکلخت ختم ہو جاتی ہیں ۔ ان سے پرے چوٹی پر ایک کھنڈر ہے ۔
ہیں جن دنوں غرناطہ کے عوام ابو عبداللہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تو وہ پہروں اس بلند مقام پر
کڑھتا رہتا تھا اور اسی مناسبت سے اسے "مور کی کرسی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔

جب میں جنت سے نکلا تو شام ہو رہی تھی ۔ بائیں ہاتھ پر کھائی کے پار قصرِ الحمرا جنار
تنے کی صورت جبل سبیقہ پر چھایا سورج کی آخری کرنوں سے یوں سرخ ہو رہا تھا جیسے ان کرنوں
اگر ذرہ برابر مزید حدت ہوتی تو سلگنے لگتا ۔ نیچے قدیم غرناطہ کے گلی کوچے ابھی سے تاریک ہو رہے
.. باب العدل کے قریب پہنچا تو شام گہری ہو چکی تھی ۔ الحمرا کے جھرنوں اور فواروں کی آواز جھینگروں
شور کی طرح ہر سو گونج رہی تھی ۔ جس طرح ربول کی دھن کے اختتام پر بنسری کی لے دور ہوتی چلی
تی ہے ۔ اسی طرح یہ شور بھی الحمرا اور میرے درمیان بڑھتے فاصلوں کی مناسبت سے مدھم پڑتا گیا اور
یہ لے، یہ روتے پانیوں کا شور خاموشی کے گہرے سمندروں میں اتر گیا ۔۔۔ مکمل سکوت!

مرسیڈس

فالا کے گھر کے قریب پہنچا تو ڈھلوان سڑک کے پہلو میں کھڑی دیواروں میں نصب لالٹینیں روشن ہو گئیں۔ ایک موڑ پر چند بچے لچھے دار رُوٹی بیچنے والے کے گرد کھڑے شور مچا رہے تھے اور ڈبے میں سفوف چھڑک کر تیزی سے ہینڈل گھما رہا تھا۔ قریب ہی ایک خمیدہ کمر بوڑھا کے شربت کی صراحی اُٹھائے، انگلیوں میں گُتھے کانسی کے پیالوں کو آپس میں ٹکرا کر راہگیروں متوجہ کرنے میں مصروف تھا۔ پتھریلی سڑک پر روشنی کا ایک شہتیر پڑا تھا جو ایک قہوہ خا کھلے دروازے میں سے آ رہی تھی ...... بے فکری آوازیں اور گِٹار کی ڈوبتی، ابھرتی دھنیں! مکا کی آہنی بالکونیوں میں براجمان بوڑھی عورتیں سڑک پار کسی دوسری بالکونی میں بیٹھی ہمسایوں سے باآوازِ بلند محوِ گفتگو تھیں۔

جونہی میں پلازا نووا میں پہنچا جدید غرناطہ نے جیسے میرے تھکے ہوئے جسم اور ذہن جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ الحمرا کے رواں پانیوں کا طلسم ٹوٹ کر گرا اور اِس کی جگہ ٹرام کاروں کی گڑگڑا ط اور ٹریفک کے شور نے لے لی۔ جھرنوں کی سرگوشیوں کی بجائے فٹ پاتھ پر گھسٹتے بوٹوں کی رگڑ کانوں میں اُتری۔ پلازا نووا جہاں کھڑے ہو کر یقین ہی نہیں آتا کہ اِن آنکھوں میں چبھتی ہوئی نیون روشنیوں اور سکائی سکریپروں سے صرف پندرہ منٹ کے فاصلے پر صدیوں پُرانے الحمرا کا وجو ہے۔ جدید کافی باروں کے اندر "لا پیٹلز" کی برقی گٹاریں گونج رہی تھیں۔ ایک سینما گھر کے ماتھے پر ہسپانویوں کے پسندیدہ اداکار "لا برانڈو" کی تازہ ترین فلم کا اشتہار روشن تھا۔ اس ہلچل ا اور گہما گہمی نے یک لخت اُس تھکن کا پُورا بوجھ مجھ پر لاد دیا، جسے میرا جذبۂ شوق چھ سات میل کی آوارہ گردی کے باوجود اب تک دبائے ہوئے تھا۔ میں اپنی پانسیاں کی جانب جاتی ہوئی شاہرا

لیے کا تھولیکا پر ہو لیا...... ایک مقام پر سڑک عبور کرنے کو تھا کہ یک دم ٹریفک سگنل سرخ ہو۔ رکی ہوئی کاریں ایک جھٹکے سے یوں حرکت میں آئیں جیسے کسی عالمی کار ریس کا افتتاح ہو۔ فراٹے بھرتی ہوئی کاروں کا ریلا میرے سامنے سے گذرنے لگا...... اطالیہ فیئٹ...... سویڈن کی والوا......... فرانس کی سِتراں......... اور پھر میں مسکرائے بغیر رہ سکا۔ اسے شاید میری کور ذوقی پر محمول کیا جائے لیکن میری حس رومان جرمنی کی مرسیڈیس دیکھ کر بیدار ہوئی تھی......."سیون اپ فار دی ایکشن" ایسا سر جھٹکنے والی اشبیلیہ مرسیڈیس کے لیے۔ پچھلے دو روز سے الحمرا کی مقناطیسی قوت نے مجھے اپنی جانب یوں رکھا تھا کہ راستے میں پڑتی ہوئی نسوانی رعنائیوں کی کشش زائل ہو گئی تھی۔

میں نے ڈائری نکال کر پتہ دیکھا تو "ہوسٹل دے میدیکوس" بیبارمبلا کے نواح میں واقع یعنی میری پانسیاں کے آس پاس!

ہال کے وسط میں ایک زرد رُو راہبہ بھاری ڈیسک کے پیچھے ایک پاکٹ سائز بائبل کے ت بڑی لے دلی سے اُلٹ رہی تھی...... وہ سر جھکائے یوں بیٹھی تھی جیسے بیحد انکسار پسند ہو مگر حقیقتاً اس کے گلے میں لٹکی بھاری صلیب کا بوجھ اُسے سر اُٹھانے نہیں دیتا تھا...... کب مجھ ناتواں سے اُٹھتی ہے۔ میں اُس کی بائبل خوانی میں مخل ہُوا اور مرسیڈیس پُوچھا۔

اُس نے بائبل سے نگاہیں اُٹھائے بغیر دراز میں سے ایک طویل فارم نکال کر میرے آگے رکھ دیا اور کلیسا میں پڑھی جانے والی دُعاؤں کے انداز میں بڑبڑانے لگی "نام...... پتہ...... مذہب...... پیشہ...... باپ کا نام...... دادا کا......"

"صرف ملنا چاہتا ہوں شادی نہیں کرنا چاہتا......"

"میرا وقت مت ضائع کرو۔ خاموشی سے فارم پُر کر دو۔" اُس نے ناگواری سے حکم دیا۔ میں نے چپکے سے وصل کا یہ فارم مکمل کیا اور اس کے آگے رکھ دیا۔

"ہونہہ...... اُس نے چونکتے ہو کر مذہب کے خانے پر اُنگلی جما دی "مسلمان؟"

"بس! پاسپورٹ پر یہی درج ہے ......" میں نے خوشامدانہ لہجے میں کہا" ورنہ نزدیک تو تمام مذاہب ......"

"بہر حال پروٹسٹنٹ تو نہیں ہونا؟" وہ منہ بنا کر بولی "لوتھر کے ان چیلوں کو" مریم خود جہنّم کی آگ میں بھُونے گی ......"

"بے شک" میں فوراً ایمان لے آیا۔

اس اطمینان بخش جواب کے بعد اس نے عینک اُتار کر بائبل کے بیچ رکھی۔ فون کا اُٹھا کر نمبر گھمایا اور زیرِ لب سرگوشیاں کرنے لگی۔

"سینیورینا مرسیڈس کہہ رہی ہے کہ وہ اس نام کے کسی شخص کو نہیں جانتی ......" ما نے چونگے پر ہتھیلی جما کر مجھے یُوں گھُورا جیسے میں کوئی اشتہاری مجرم ہُوں۔

"اُسے کہیے فلیمنکو آیا ہے ......" مَیں نے فوراً کہا۔

"فلیمنکو ......؟ اُس کے ہاتھ سے چونگا گرتے گرتے بچا۔ "آدے ماریا" گلے میں لٹکی صلیب بمشکل اُٹھا کر اُسے ایک طویل بوسہ دیا اور پھر رُندھی ہوئی آواز میں ... کہہ کر فون بند کر دیا ......

"کیا تمھاری وارڈن سارا دن بائبل کے مطالعے میں مصروف رہتی ہے؟" ہوسٹل کی سیڑھیو سے اُترتے ہوئے میں نے مرسیڈس سے پُوچھا۔

"ہاں! بائبل کے نیچے گو. میں وکھے نلمی رسالے کے مطالعے میں مصروف رہتی ہے ...." وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

آج مرسیڈس اپنی کوتاہ قد نہیں لگ رہی تھی۔ بعد میں معلوم ہُوا کہ یہ تو میکسی کے نیچے کوئی چھ چھ انچ کے پلیٹ فارم شُوز تھے جو سرو قد بننے میں بے حد معاون ثابت ہو رہے تھے۔ شاید اسی مصنوعی بلندی کا اثر تھا کہ اُسے ہلکا ہلکا زکام ہو رہا تھا۔

"پہلے النفیساریہ چلتے ہیں ......" وہ ناک سکیڑ کر بولی "مجھے کچھ ہیئر پن اور رُومال خریدنا ہیں ......"

القیساریہ یعنی "بازارِ ریشم" مُورش عہد میں اُندلس بھر میں مشہور تھا۔ دکانوں کے دروازے اب بھی محراب نما ہیں مگر اب یہاں ریشم کی مصنوعات کی بجائے نائلون کی زنانہ جرابیں اور انڈر ویئر فروخت ہوتے ہیں۔ خواتین کے ساتھ خریداری کرنا میرے لیے ہمیشہ سوہانِ رُوح بن جاتا ہے۔ دکاندار نے سو روپیہ قیمت بتائی تو اطمینان سے بیس روپے سے آغاز کر دیں گی۔ میرا خیال تھا کہ مرسیڈس ایک نسبتاً ترقی یافتہ ملک کی خاتون ہونے کے ناطے سے خاصی مہذب ہو گی مگر وہ تو کشمیری بازار میں بھاؤ تاؤ کرتی تِسّل کاک برقعوں میں خیمہ زن دیہاتی عورتوں سے بھی گئی گذری تھی۔ سو پیسیتے کے رُومال کی پانچ پیسیتے قیمت لگاتی۔

"کم از کم میں نے عربوں کے بازارِ ریشم کی چالیس دکانوں کی زیارت تو کر لی" القیساریہ سے باہر نکلتے ہوئے میں نے مرسیڈس سے کہا جو اپنی اکلوتی خریداری یعنی دس پیسیتے کے ایک رومال کو ناک پر پیلیٹے شُوں شُوں کر رہی تھی۔ اُس نے ناک سے رُومال ہٹا کر اس کا بغور معائنہ کیا۔

"دو پیسیتے زیادہ دے آئی ہوں۔ آٹھ کا ہے!"

القیساریہ کے پھاٹک کے قریب کیتھڈرل رائل کی عمارت کھڑی تھی جس کے محراب نما دروازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ صلیب کا بوجھ اُٹھانے سے پیشتر یہ غرناطہ کی جامع مسجد تھی۔

"اس کلیسا میں فاتحین غرناطہ کے تابوت ہیں!" مرسیڈس نے کسی پیشہ ور گائڈ کی طرح بیان داغ دیا۔

"فاتحین غرناطہ؟"

"ہاں انھوں نے غرناطہ دوبارہ فتح کیا تھا!" وہ جلدی سے بولی۔

"پہلے کس نے فتح کیا تھا؟"

"تمھیں اچھی طرح معلوم ہے پہلے کس نے فتح کیا تھا!" اُس نے جھلّا کر رُومال میں ایک اور لمبی شُوں کر دی۔

میں نے جیب میں سے ڈائری نکالی اور اس میں فراہم شدہ معلومات درج کرنے لگا۔ مرسیڈس نے ایڑیاں اُٹھا کر ڈائری میں جھانکا اور سر جھٹک کر کہنے لگی۔ "اس میں یہ بھی لکھ لو کہ کیتھڈرل کے سامنے والی عمارت القصر مدرسہ کہلاتی ہے..... موروں کے عہد

ہیں غرناطہ کی یونیورسٹی تھی۔ صدر دروازے پر الحمرا کی طرح شیروں کے مجسمے تھے اور اُن پر تحریر تھا "یہ دنیا چار چیزوں پر قائم ہے۔ داناؤں کے علم پر، عظیم آدمیوں کے انصاف پر۔ نیکوکاروں کی پارسائی پر اور بہادروں کی شجاعت پر .... اور یہ سامنے والی گلی الحمرا بنیاد رکھنے والے سلطان کے نام پر بن احمر کہلاتی ہے۔"

"تمھیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟" میں نے اس کی وسیع معلومات پر حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"پچھلے دو روز سے غرناطہ کی گائیڈ بک کا مطالعہ کر رہی ہوں۔" وہ مسکرا دی "ایسے معلوم ہوا۔"

"میں تو سیاحت کے دوران پیشہ ور گائیڈوں سے منہ چھپاتا پھرتا ہوں۔ پیسے بھی بٹور لیتے ہیں اور تصوراتی داستان طرازی سے بھیجہ الگ چاٹتے ہیں۔"

"اِس گائیڈ کی تمام خدمات بلاقیمت ہیں۔"

"تمام خدمات؟"

"ہاں!" اس نے سر جھٹکا مگر فوراً ہی اُس پر اِس اثبات کے مخفی پہلو آشکارا ہو گئے اور دیدے پھاڑ کر بولی "تقریباً تقریباً تمام خدمات!"

کیتھڈرل رائل کے چوک میں سے نکل کر ہم نے کالیے کا تھولیکا کو عبور کیا اور کالیے لاپانو کی تنگ گلی میں پوشیدہ اس عظیم حویلی کے سامنے آ نکلے جو بادس بن حبوس نے تعمیر کروائی تھی۔ ایک عرصہ تک یہ شاندار عمارت کوئلے کے گودام کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔ اِن دنوں اِس کے شکستہ کمروں اور دالانوں میں مفلوک الحال کنبوں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ میں نے لکڑی کے بڑے پھاٹک میں سے اندر جھانکا۔ سہ منزلہ عمارت کے تاریک صحن میں سنگِ مرمر کا ایک فوارہ جو سیاہ ہو چکا تھا منہ کھولے پیاسا سا کھڑا تھا۔ پھاٹک کے پہلو میں ایک قدیم ہسپانوی قہوہ خانے کی کھڑکیاں کھلی تھیں۔ ہم ہسپانوی مزاج کے مطابق رات کے کھانے کے لیے فٹ پاتھ پر لگی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"تم تو شاید اُس روز کی طرح تربوز کھانا پسند کرو گی؟" مجھے اشبیلیہ سے غرناطہ تک کا سفر

یاد آگیا جب مرسیڈس بس میں بیٹھی کچر کچر تربوز کھا رہی تھی۔

"مجھے صرف چوری کیے ہوتے تربوز پسند ہیں" وہ آنکھیں جھپک کر بولی اور میز پر دھرے پیالے میں سے ایک زیتون اُٹھا کر منہ میں ڈال لیا۔ مرسیڈس ہوسٹل سے نکلنے کے بعد اب تک مسلسل آنکھیں جھپکائے چلی جا رہی تھی، جانے کیوں؟'

میں نے بھی سرکے میں بھگویا ہُوا زیتون چکھا۔ کچے بیروں ایسا مزہ تھا۔

کھانے کے چناؤ کا مسئلہ موٹے ویٹر پر چھوڑ دیا گیا جو مجھے مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے مسلسل مرسیڈس کے گرد جھول رہا تھا۔

"پالواسادو" یعنی ہسپانوی بُھنا ہُوا مُرغ ہم نے پاکستانی طریقے سے ڈبل روٹی کے نوالوں کے ساتھ ہاتھوں سے کھایا۔

خاصی دیر سے مجھے اپنے گرد ایک خاص قسم کی بُو کا احساس ہو رہا تھا جیسے میں کسی ہسپتال میں آنکلا ہوں۔ مرسیڈس سے ذکر کیا تو اُس نے فوراً اپنے لباس کی لمبی آستین میری ناک کے آگے لہرا دی۔ کلوروفارم کی بُو اسی میں سے آ رہی تھی۔

"یہ میری پیشہ ورانہ خوشبو ہے" وہ دوسری آستین سُونگھ کر کہنے لگی "یقین کرو اگر لیبارٹری سے نکل کر نیا لباس بھی پہن لوں پھر بھی یہ خوشبو میرے ساتھ ساتھ چلتی ہے..... پیشہ ورانہ نقصان سمجھ لو....... تمہیں گزارا کرنا پڑے گا۔"

"میرا خیال ہے جب بھی تم کسی لڑکے کو ملنے جاتی ہو جان بوجھ کر لباس پر یوڈی کلون کی بجائے کلوروفارم چھڑک لیتی ہو۔ یعنی اگر وہ غریب تمہارے خوبصورت چہرے کو دیکھ کر حواس نہ کھو بیٹھے تو فوراً آستین ہلائی اور اُسے بیہوش کر دیا......"

"یا پھر......" اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں شرارت کے چھینٹے تھے "اگر وہ لڑکا خرمستی پر اُتر آئے اور زیادہ قریب آنے کی کوشش کرے تو خود بخود بیہوش ہو جائے....... حفاظتی تدابیر!"

"ویسے تمہارے نام کی مناسبت سے تو کلوروفارم کی بجائے پٹرول کی بُو آنی چاہیئے......"

مرسیڈس نے ایک مرتبہ میری طرف "تم بھی بروٹس" نظروں سے دیکھا اور پھر خاموشی سے کافی پینے لگی۔ مجھے فوراً احساس ہو گیا کہ اُسے روزانہ اسی قسم کے فقرے سننے پڑتے ہیں اور اب وہ اُن کے مزاح سے لطف اندوز ہونے کی بجائے بُجھ جاتی ہے۔ میں نے حسب مقدور معذرت کی مگر وہ کچھ کہنے کی بجائے سر جھکائے کافی پیتی رہی۔ میں کچھ دیر تو حویلی کے پھاٹک پر اُبھری ہوئی عربی عبارت پڑھنے کی کوشش کرتا رہا اور پھر میرے ذہن میں ہسپانوی کا وہ فقرہ تیر گیا جو مرسیڈس اور میرے درمیان رابطے کا ذریعہ بنا تھا۔

"توس انوس سون پیراسیوس!"

"نادا" مرسیڈس نے بے اختیار سر جھٹک دیا "تم جھوٹ بول رہے ہو"

اب معلوم ہُوا کہ بار بار آنکھیں جھپکانے میں حسنِ طلب پنہاں تھا۔

"نہیں میں جھوٹ نہیں کہہ رہا تمھاری آنکھیں واقعی بیحد پیراسیوس ہیں" میں نے پلیٹ سے ایک زیتون اُٹھا کر منہ میں پھینکا جو حلق کے راستے سیدھا معدے میں جا گرا۔ "آہم........" کھانستے کھانستے بُرا حال ہو گیا۔

"جھوٹ بول رہے تھے نا........ اس لیے!" مرسیڈس نے مسرت سے اعلان کیا جب میں نے اُسے بتایا کہ اس فقرے کے شدید ردِعمل سے ہراساں ہو کر میں نے کس طرح "ہسپانوی بول چال" دیکھ کر فوراً اس بات کا اطمینان کر لیا تھا کہ کہیں غلطی سے "میں کپڑے بدلنا چاہتا ہوں آپ کمرے سے باہر چلی جائیں" والا فقرہ تو نہیں بول گیا ہوں۔ مرسیڈس اتنے زور سے کھلکھلا کر ہنسی کہ موٹا ویٹر فوراً باہر آ کر بلائیں لینے لگا۔ میں نے اُسے بیس پسیتے کا نوٹ تھمایا اور سگرٹ خریدنے کے لیے بھیج دیا۔

"تم اس شب کیمپنگ الفیمبرا پہنچ گئے تھے نا؟" مرسیڈس نے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"پہنچ تو گیا تھا مگر غرناطہ کی خنک رات کی تاب نہ لا سکا چنانچہ اب مقدس پہاڑی کے ایک آرام دہ غار میں رہائش پذیر ہوں........ خانہ بدوش بھائیوں کے ہمراہ........"

"فلیمنکو........ ہُوں!" وہ سنجیدہ ہو کر کہنے لگی "آج سارا دن کہاں گذارا؟"

"الحمرا" میں نے اپنے بوٹوں کی جانب دیکھا جن پر ابھی تک سُرخ مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی۔

"اِسی لیے میں نے شکایت نہیں کی کہ تم مجھے پچھلے دو روز سے کیوں نہیں ملے"

وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی" لوشیں میں نے الحمرا کا ذکر کیا تھا تو تمھاری آنکھوں میں عجیب سی چمک عود کر آئی تھی...... مجھے معلوم تھا تم الحمرا دیکھنے کے بعد ہی مجھ سے ملنے آؤ گے"

"ہاں........ میں اپنی طویل مسافتوں کے نکتۂ اختتام پر پہنچ جانا چاہتا تھا...... اب میرے اندر امن ہی امن ہے۔ ... میں پُرسکون ہوں اور اب میرا جو قدم بھی اُٹھے گا میرے اور گھر کے درمیان فاصلوں کو مختصر کرتا چلا جائے گا......"

"پھر تم فلیمنکو تو نہ ہوئے نا...... خانہ بدوشوں کا تو کوئی گھر نہیں ہوتا!"

"میں پارٹ ٹائم خانہ بدوش ہوں"

اتنی دیر میں موٹا ویٹر سگرٹ لے کر آ گیا۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔

"سنیور نیا......" اس نے سگرٹ تو مجھے پیش کیے مگر کمر تک جھکا مرسیڈس کے سامنے جب تک کہ اُس نے ایک عدد "شکریہ" مسکراہٹ کے ہمراہ اس کے حوالے نہ کر دیا اس پر بھی اس کی تسلّی نہ ہوئی اور وہ مسکراتا ہوا میری کُرسی کے پیچھے کچھ اس طور تعینات ہوا کہ مجھے ہر لمحہ یہی خطرہ رہتا تھا کہ ابھی وہ مرسیڈس کو محظوظ کرنے کی خاطر مجھے گدگدی کرنے لگے گا۔ چنانچہ میں نے وہاں سے اُٹھنے میں ہی عافیت جانی۔

"مقدس پہاڑی پر روشنیاں ٹمٹما رہی ہیں......" گلی میں سے نکلتے ہی مرسیڈس کی نگاہیں سیکرے مانتو کی جانب اُٹھ گئیں" وہاں خانہ بدوشوں کے غاروں میں سامبرا رقص ہو رہا ہو گا، چلو گے؟"

"الحمرا نوردی کے بعد اب مجھ میں مقدس پہاڑی پر چڑھنے کی سکت نہیں...... کل سہی! البتہ مجھے یہ معلوم ہے کہ باب العدل کے باہر بھیک مانگنے والی خانہ بدوش بڑھیا کی بیٹی ماریا لیا سامبرا غرناطہ بھر میں اور کوئی نہیں ناچتا!"

ماریا کا نام سُن کر مرسیڈس نے رُومال میں ایک زور کی شُوں کی اور پھر ناک میں بولی۔

اور یقین رکھو کہ وُہ خرانٹ بڑھیا بھی دوسری خانہ بدوش ماؤں کی طرح ہر صبح اپنی بیٹی کو نصیحت کرتی ہو گی۔ماریا بیٹی! لاچہ بچاتے رکھنا یعنی کسی بھی مرد کو قریب نہ آنے دینا۔ایک خانہ بدوش لڑکی کا اِس سے بڑا سرمایہ اور کوئی نہیں........اب جا کر دیکھو کہ تم آس پاس کے گھروں سے کیا چُرا سکتی ہو! اور ہاں لاچہ بچاتے رکھنا......"

"بہت خوب! یعنی یہ خانہ بدوش بھی اپنے ہاں کی طرح لاچہ باندھتے ہیں۔"

"لاچہ لڑکی کی عصمت کو کہتے ہیں......" مرسیڈس نے منہ بھینچ کر کہا "بہرحال باب البیرہ یہاں سے قریب ہی ہے وُہ دیکھ لیتے ہیں۔"

ہم غرناطہ کی مُورش فصیل کے سائے میں چل رہے تھے اور مرسیڈس گائڈ بک سے حفظ شدہ تفصیلات نہایت سنجیدگی سے دُہرا رہی تھی۔کالیے البیرہ کے اختتام پر باب البیرہ کا عظیم دروازہ سر اُٹھائے کھڑا تھا۔پہلوؤں میں سے نکلتی ہوئی فصیل کا بیشتر حصہ منہدم ہو چکا تھا۔چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹی یہ حفاظتی دیوار شہر کے مختلف حصّوں میں یوں ظہور پذیر ہوتی ہے جیسے لاک نیس کے روائتی عفریت کا بھاری بھرکم جسم جھیل کی پُرسکون سطح پر جابجا اُبھرتا ہے۔اِسی باب البیرہ کی بلند محراب کے نیچے سے غرناطہ کا جری سپہ سالار موسیٰ زرہ بکتر اور بھاری تلوار کے بوجھ تلے دبے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ویگا کے وسیع میدانوں میں داخل ہُوا تھا۔میرے قدموں تلے بچھے اِنہی پتھروں پر اس کے سُم شرارے اُڑاتے ہوئے گذرے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر باب البیرہ کے پھاٹک پر ہاتھ رکھ کر دوسری جانب دیکھا۔وہاں مُوسیٰ کی بے مثال شجاعت کا امین ویگا میدان جدید عمارتوں اور شاہراہوں کے نیچے مُورش ماضی کی طرح رُوپوش تھا۔دریائے شنیل کے وہ چمکیلے پانی بھی نظروں سے اوجھل تھے جنھوں نے اُس چاندنی رات میں جب تنِ تنہا موسیٰ دشمنوں کے درجنوں سپاہیوں کو تہہ تیغ کرنے کے بعد زخمی ہو کر گرا تھا اپنے عظیم فرزند سے جُدا ہونے کی بجائے اس کے جسد خاکی کو اپنی آغوش میں لے لیا۔اور یُوں دُوسرے مسلمانوں کی طرح جلا وطن ہونے کی بجائے مُوسیٰ اب بھی شنیل کے گہرے پانیوں میں دفن اپنے وطن کے سینے پر لیٹا ہے۔

غرناطہ تو نہیں چھن گیا؟

اُس صبح شاید میں پہلا شخص تھا جو باب العدل کے راستے جبل سبیقہ پر ایستادہ تاریخی عمارتوں کے گرد پھیلے باغوں میں داخل ہوا۔

فصیلِ الحمرا کے پہلو میں گھنے درختوں میں سے آتی ہوئی ہوا ابھی تک خنکیٔ سحر سے بھیگی ہوئی تھی۔ سورج کی کرنیں زیریں غرناطہ کے گلی کوچوں میں بتدریج پھیل رہی تھیں۔ باب العدل کی بالائی منزل سے الحمرا کے چند محافظ وردیوں کے بٹن بند کرتے ہوئے اُترے اور حوض کے کنارے بیٹھ کر دھوپ سینکنے لگے۔ باب الخمر کے قریب ایک فوٹوگرافر سیاہ پردے کے آگے رکھی کرسی پر براجمان اخبار پڑھ رہا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ سن کر اُس نے اخبار کا نصف حصّہ اپنی آنکھوں کے آگے سے گرایا اور بولا "صبح بخیر موسیو... موروں کے بادشاہ کے لباس میں تصویر کھنچوایئے گا... خنجر بھی ہے..."

"تلوار بھی ہے، دستار بھی ہے..." میں نے مصرع مکمل کر دیا۔

وہ مسکرا کر اخبار کے پیچھے روپوش ہو گیا۔

قصر الحمرا کے دروازے پر ایک نظر ڈال کر میں بائیں جانب باب الخمر میں سے گذر کر القصبہ کی بلندی کی طرف ہو لیا۔ فصیل سے چمٹی ہوئی ایک تنگ پگڈنڈی اوپر کی طرف جا رہی تھی۔ دائیں جانب گہری کھائی میں درختوں کے جھنڈ بکھرے ہوئے تھے۔ ان درختوں کے درمیان ایک شکستہ مورِش دروازہ نظر آ رہا تھا جس کی سرخ اینٹوں پر دھوپ آہستہ آہستہ اُتر رہی تھی۔ ایک چھوٹے سے تالاب میں فصیل کے جسم میں سے پھوٹنے والے چشمے کا پانی گر رہا تھا۔ تالاب پر ابھی تک صبح کی

ہلکی دُھند معلق تھی ۔ پگڈنڈی کے خاتمے پر فصیل میں پوشیدہ ایک دروازہ سامنے آیا جہاں سے القصبہ کے بلندترین بُرج "تاور ڈی ول" یا بُرج الغفر تک سیڑھیاں جاتی ہیں ۔۔

سیڑھیاں طے کر کے میں اس بُرج کے وسیع میدان میں آنکلا جو جبل سبیکہ پر کچھ یوں پھیلا ہوا ہے کہ اس کے تین اطراف تو شہر غرناطہ کے بام و در پر نظر پرواز کرتی ہے اور چوتھی جانب قصر الحمرا جو نئے کے بنے ہوئے ایک نمائشی ماڈل کی طرح دکھائی دیتا ہے ۔ اگرچہ تمام سیاح ٹکٹ خرید کر سب سے پہلے القصبہ کا رُخ کرتے ہیں مگر میں الحمرا اور جنت العریف دیکھنے کے بعد ہی ادھر آنا چاہتا تھا کہ ان عمارتوں کا تاریخی تسلسل اسی انداز میں بنتا ہے ۔۔۔۔ اس بُرج پر ۔۔۔۔ غرناطہ کی بلندترین عمارت پہ ۔۔۔ اس سامنے والی دیوار پہ جہاں اب ایک گھڑیال لٹک رہا ہے عیسائی پادری اور سپہ سالار آئے ۔۔۔۔ باب العدل میں سے گذر کر ۔۔۔ باب الخمر میں سے گذر کر ۔۔۔ فصیل سے ملحق پگڈنڈی پر چل کر ۔۔۔ انہی تنگ سیڑھیوں کو طے کر کے ۔۔۔ وہ اس بُرج کی چوٹی پر پہنچے ۔۔۔۔ اس میدان میں آئے اور جہاں میں کھڑا تھا ، یہیں کھڑے ہو کر آٹھ سو چھ برس سے سربلند ہلال کو نوچ کر اس کی جگہ صلیب گاڑ دی ۔۔۔ چاندی کی وہ صلیب جس نے مورش تہذیب کے آسمان کو یوں چھپایا کہ اس پر چمکتے ستارے آنِ واحد میں ٹوٹ کر گر گئے اور یہ آسمان تاریک خلاؤں میں بدل گیا ۔

غروبِ غرناطہ کے تاریک المیے میں آٹھ ایسے کردار ہیں جن کی پرچھائیاں تاابد تاریخ کے صفحوں پر منڈلاتی رہیں گی ۔

اندھا اور بیمار مولا علی ابوالحسن جس نے فرڈیننڈ کے سفیر کو مزید خراج دینے سے انکار کرتے ہوئے کہا " اپنے آقا سے کہہ دینا جو سلاطینِ غرناطہ اسے خراج دیتے تھے وہ مر چکے ۔ ہماری ٹکسالوں میں اب سکوں کی بجائے تلواریں ڈھلتی ہیں ۔"

ابوالحسن کا بھائی اور مالاگا کا حاکم جو اپنی بے پناہ شجاعت کی بنا پر "الزغل" کے لقب سے جانا گیا ۔

ابوالحسن کی سازشی بیوی عائشہ اور اُس کا کمزور دل حریص بیٹا عبداللہ جو بُرج القمارش کی قید سے بھاگ نکلے تھے ۔

عبداللہ کا سپہ سالار موسےٰ جس نے زوال کی گھڑی میں اپنی شعلہ بیانی سے عرب غیرت کے

اُن شراروں کو ہوا دی جن کی رمق عبداللہ ایسے بزدل شخص میں بھی موجود تھی۔

اور پھر فرننالیبہ کا فرڈیننڈ اور آراگان کی ازابیلا جن کی شادی سے یہ دو عظیم عیسائی سلطنتیں یکجا ہوئیں اور اُنھوں نے مذہب کے نام پر اپنے وطن کی خاطر ایک مقدس جنگ کا آغاز کر دیا۔

ابوالحسن نے نہ صرف خراج دینے سے انکار کر دیا بلکہ غرناطہ کی فصیلوں سے نکل کر ظاہرہ پر حملہ آور ہوا اور عیسائیوں کو شکست دے کر شہر پر قابض ہو گیا۔ عیسائیوں کے خلاف ایک اور مہم کے دوران جب وہ شہر الحامہ کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا، عائشہ نے عبداللہ کو سازش پر ابھارا اور اس بے برکت بیٹے نے تخت پر قبضہ کر لیا۔ بوڑھا ابوالحسن دل برداشتہ ہو کر اپنے بھائی الزغل کے پاس مالاگا چلا گیا۔ عبداللہ جانتا تھا کہ ایک ایسے وقت میں جب کہ اُس کا باپ منہدم ہوتی ہوئی آخری مورش سلطنت کو سہارا دینے کی سعی کر رہا تھا اُس نے اُس کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔

غرناطہ کے عوام عبداللہ کو سخت ناپسند کرتے تھے اور وہ شاذ ہی الحمرا سے باہر قدم رکھتا۔ ایک مرتبہ اپنی گرتی ہوئی ساکھ کو سہارا دینے کی خاطر عبداللہ فوج لے کر عیسائیوں کے مقابلے پر نکلا مگر بزدلی کی بنا پر لوسینہ میں گرفتار ہو گیا۔ عیسائیوں نے اس قیدی کی صورت میں اُس خواب کی تعبیر دیکھی جسے وہ پچھلے آٹھ سو برس سے حقیقت میں بدلنے کی سعی کر رہے تھے۔ قرطبہ میں عبداللہ کا شاندار استقبال ہوا۔ اپنے چچا الزغل کے خلاف امداد کے بدلے میں عبداللہ کے غلام بیوں نے غرناطہ عیسائیوں کے حوالے کر دینے کا اقرار کر لیا۔ معاہدہ طے پا گیا۔ غرناطہ واپسی پر اہلِ شہر نے اُسے قبول لینے سے انکار کر دیا اور ابوالحسن کو بلا کر تخت پر دوبارہ بٹھا دیا۔ عبداللہ باپ کے خلاف سینے میں زہر چھپائے المیریا چلا گیا۔ اسی دوران ابوالحسن انتقال کر گیا۔ غرناطہ کے علماء نے خانہ جنگی اور بیرونی خطرات کے پیشِ نظر فیصلہ دیا کہ عبداللہ حدرہ کے پار البسین میں شمالی حصے پر حاکم رہے اور الزغل دوسری جانب الحمرا پر قابض رہے۔

الزغل کے لئے یہ صورتِ حال انتہائی حوصلہ شکن تھی۔ ایک جانب اُس کا سازشی بھتیجا اُس کے پہلو میں خنجر کی نوک کی طرح چبھ رہا تھا اور دوسری طرف عیسائی افواج انتہائی نپی تلی منصوبہ بندی کے تحت غرناطہ کے گرد و نواح کے قصبوں اور حصاروں پر یلغار کر رہی تھیں۔ غرناطہ جسے عرب شاعر

سرخ انار سے تشبیہ دیتے تھے دانہ دانہ ہو کر بکھرنے لگا۔ ۱۴۸۶ء میں لوشہ اور مالاگا ایسے اہم شہر عیسائیوں کے ہاتھوں میں چلے گئے۔ المیریا کا بھی یہی حشر ہوتا اگر الزغل اپنی جرأت و شجاعت بروئے کار لا کر اسے بچا نہ لیتا مگر یہ ایک عارضی کامیابی تھی۔ قشتالیہ اور آراگان کی فاتح افواج ثابت قدمی سے آگے بڑھتی رہیں۔ پھر ایک وقت ایسا آگیا کہ مسلمان شہسواروں کو عیسائی فوجوں سے مقابلے کے لیے شہر پناہ سے زیادہ دور نہ جانا پڑتا۔ وہ پھانسی کے سکڑتے پھندے کی طرح نزدیک تر ہو رہے تھے۔ اس دور کا الزغل ایک ایسا جری سلطان تھا جس نے تن تنہا سر توڑ کوشش کی کہ کسی طرح پھانسی کے اس پھندے کی رسی ڈھیلی پڑ جائے اور وہ آخری مسلمان ریاست کو اس میں سے نکال لے۔ مگر اس کا کیا کیجئے کہ جب کبھی اسے تھوڑی بہت کامیابی نصیب ہوتی اس کا بھتیجا عیسائیوں کے ساتھ مل کر اس کی شکست کا سبب بن جاتا۔ عیسائیوں کے خلاف ایک مہم سے واپسی پر جب الزغل غرناطہ کے قریب پہنچا تو شہر کے تمام دروازے بند تھے۔ خنجر اس کے پہلو میں اتر چکا تھا۔ عبداللہ نے الحمرا پر قبضہ کر کے اپنی مکمل بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا۔ الزغل اس زخم کو برداشت نہ کر سکا اور افریقہ چلا گیا جہاں فیض کے سلطان نے کسی دیرینہ رقابت کی بنا پر اسے اندھا کر دیا۔ آخر عمر میں غرناطہ کا جری سلطان فیض کی گلیوں میں بھیک مانگ کر گذر اوقات کرتا تھا۔ اس کی قبا کے پیوندوں پر ایک بڑا سا سرخ پیوند تھا جس پر "یہ اندلس کا بے بس بادشاہ ہے" کے الفاظ کاڑھے ہوئے تھے۔

اس اثنا میں فرڈیننڈ نے پانچ ماہ کے محاصرے کے بعد بازا شہر کو بھی ختم کر دیا۔ اب عیسائی فوجوں اور غرناطہ کی فصیلوں کے درمیان کوئی ایسی عمارت نہ تھی جہاں سے ایک تیر بھی نکل کر ان کے راستے میں پیوست ہوتا۔ الزغل کا کانٹا بھی نکل چکا تھا چنانچہ فرڈیننڈ نے معاہدے کی رو سے عبداللہ کو ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا۔ موت کی زردی کسی دوست چہرے پر نظر آنے لگے تو بھی دکھ کی اس شدت کا احساس نہیں ہوتا جو انجام کار موت کی آمد سے کلیجے کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ عبداللہ کو معلوم تھا کہ اس کی سرطان زدہ سلطنت ہوتے ہوتے تباہی کی جانب رواں ہے مگر فرڈیننڈ کے حکم کے بعد اسے پہلی مرتبہ شکست اور ابدی جلاوطنی کے عفریتوں کے قرب کا اذیت ناک احساس ہوا۔ اس نے تمام معاہدے توڑ کر آخری دم تک لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ موسیٰ نے الحمرا کے دیوان خاص میں عبداللہ کے تخت کے پاس کھڑے ہو کر فرڈیننڈ کے سفیر سے کہا "فرڈیننڈ کو کہنا اگر وہ ہمارے ہتھیار

بنا سے نو خود آ کر ہم سے چھین لے۔

۱۴۹۱ء کے موسم گرما میں فرڈیننڈ اور ازابیلا پچاس ہزار فوج کی معیت میں غرناطہ کے سامنے ویگا میدان میں داخل ہوئے۔ عبداللہ نے دیوان خاص میں سے دھول کے وہ بادل اٹھتے دیکھے جو اس کی سلطنت کو لپیٹ میں لینے کو تھے۔ فرڈیننڈ نے الحمرا کے روبرو ایک پہاڑی پر سانتافی نامی ایک شہر دس روز کے اندر اندر تعمیر کیا اور عیسائی فوج نے حلف اٹھایا کہ جب تک غرناطہ فتح نہیں کر لیتے اسی شہر میں قیام کریں گے اور گھروں کو واپس نہیں لوٹیں گے۔ غرناطہ کے گرد پھیلے ہوئے تمام باغوں اور فصلوں کو آگ لگا دی گئی اور دیہات مسمار کر دیئے گئے۔ تاریک راتوں میں عبداللہ اور اس کے رفقاء الحمرا کے جھروکوں میں سے ویگا میں بلند ہونے والے ان شعلوں کو بے بسی سے دیکھتے جو ان کی خوراک کی ترسیل کو خاک کر رہے تھے۔ موسم سرما کے اوائل میں ہی شدید سردی کے ساتھ برفباری شروع ہو گئی۔ باہر کی دنیا کے ساتھ تمام راستے مسدود ہو گئے اور خوراک کی قلت کے باعث شہری آبادی بھوکوں مرنے لگی۔

قلیل تعداد کی وجہ سے مسلمانوں کے لئے یہ تو ہرگز ممکن نہ تھا کہ وہ فصیل سے باہر نکل کر باقاعدہ جنگ کا آغاز کریں مگر دشمن کو یوں نظروں کے سامنے خیمہ زن پا کر غرناطہ کے فرزندوں کے لئے دعوت مبارزت نہ دینا بھی باعث شرم تھا۔ چنانچہ ہر صبح ایک مسلمان شہسوار آہنی زرہ بکتر میں ڈھکا تلوار سونتے باب البیرہ یا باب پوئیتو سے باہر نکلتا اور دشمن کے خیموں کے سامنے کھڑے ہو کر دعوت ضرب دیتا۔ مقابلہ ہوتا اور اکثر اوقات غرناطوی شہسوار کامران لوٹتا۔ جونہی وہ شہر کے اندر آتا ایک اور سپاہی گھوڑا دوڑاتا عیسائیوں کے قلب میں جا کر انہیں جنگ کی دعوت دیتا۔ موسیٰ اور عبداللہ بھی متعدد بار بھیس بدل کر عیسائیوں کے خیموں کے آگے گئے اور ہمیشہ فاتح لوٹے۔ مقابلے کا یہ طریقہ فرڈیننڈ کے لئے سود مند ثابت نہ ہوا اور ایک ایک کر کے اس کے بے شمار بہترین سالار موت کے گھاٹ اتر گئے۔ ایک شب ایک عرب شہسوار گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا اور فرڈیننڈ کے خیمے کے باہر نیزہ گاڑھ کر بحفاظت واپس شہر میں چلا گیا۔ کہتے ہیں کہ جب فرڈیننڈ خیمے سے باہر آیا تو زمین میں گڑا نیزہ ابھی متحرک تھا۔

اس حادثے کے بعد فرڈیننڈ نے اپنی سپاہ کو مسلمانوں کی دعوت مبارزت قبول کرنے

سے منع کر دیا اور عبداللہ کو پیغام بھجوا دیا "اگر تم نے ہتھیار نہ ڈالے تو میں غرناطہ کی پوری آبادی تہ تیغ کر دوں گا اور شہر کو جلا کر راکھ کر دیا جائے گا۔ اس میں الحمرا بھی شامل ہو گا۔" یہ پیغام الحمرا کے در و دیوار نے سُنا۔ عبداللہ نے حالات سے مجبور ہو کر دو ماہ کی مُہلت مانگی۔ اس مدت کے خاتمے پر اگر اسے افریقہ اور ترکی سے کمک نہ پہنچی تو وہ مندرجہ ذیل شرائط پر ہتھیار ڈال دے گا۔

۱۔ سلطان اور رعایا قشتالیہ کے بادشاہ کی اطاعت کریں گے۔

۲۔ عبداللہ الحمرا چھوڑ کر البشارت کے مقام پر جلاوطن کیا جائے گا۔

۳۔ مسلمانوں کو اپنے مذہب اور قانون پر عمل کرنے کی پوری آزادی ہو گی۔

جس روز ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ ہوا اُس شب مُوسےٰ تن تنہا باب البیرہ میں سے نکلا اور دشمن سے لڑتا ہوا شنیل کے پانیوں میں اُتر گیا۔ وہ مسلمان اندلس کے نزاع میں اٹھنے والا آخری ہاتھ تھا اور اپنے وطن کی سرزمین میں دفن آخری مُسلمان۔

۲ جنوری ۱۴۹۲ کی صُبح کو معینہ مُدت ختم ہو گئی اور کمک نہ پہنچی۔ الحمرا کے اُن جھروکوں میں سے جہاں پہلے روز بچوں کا شور اور حدرہ کا مدھم بہاؤ سُنائی دیا تھا عبداللہ کے کانوں میں غلامی سے دوچار اہل غرناطہ کی آہ و فغاں اور سسکیوں کی آوازیں آئیں۔ اس نے جبل سبیقہ میں دفن اپنے آباؤ اجداد کی ہڈیاں سمیٹیں اور ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد پچاس رفقائے کے ہمراہ بن سہ پہر الحمرا کے باب الجدور میں سے باہر نکلا۔ سنسان گلیوں میں سے گذر کر وہ اُس مسجد کے قریب پہنچا جو اِن دنوں کلیسا سان سباشنیان کے نام سے جانی جاتی ہے۔ معاہدے کی رُو سے یہاں نصرانی تاجدار اور اُن کی افواج عبداللہ کا انتظار کر رہی تھیں۔ عبداللہ نے تعظیماً گھوڑے سے اُترنا چاہا مگر فرڈیننڈ نے جو یقیناً ایک عظیم انسان تھا ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا اور مصافحہ کر کے شہر کی کنجی لے لی۔ فرڈیننڈ نے غرناطہ کی کنجی ملکہ ازابیلا کے ہاتھ میں تھما دی۔ ملکہ نے اسے ولی عہد کی طرف پھینک دیا۔ ولی عہد نے یہ کنجی سپہ سالار کاؤنٹ ٹیوڑلا کے حوالے کر دی۔

عبداللہ ہمیشہ اپنے آپ کو "بدقسمت" کے نام سے یاد کرتا تھا اور اس تاریخی لمحے دُنیا بھر میں کوئی اور شخص اس لقب کا حقدار نہ ہو گا۔ اُس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اپنے بزرگوں کے شہر غرناطہ اور جبل سبیقہ پر سُنسان پڑے الحمرا کی طرف دیکھے بغیر پورٹا مالینو سے باہر نکلا

شہر سے باہر ایک موڑ پر اس نے بے اختیار پیچھے مڑ کر دیکھا۔

"اے مخاطب دیکھو اور جب تو دیکھے گا

کہ قصرِ الحمرا سے نجد تک گل و لالہ کا سلسلہ قائم ہے۔

یہ وہ ملک ہے جس کے گھروں میں حسن رچ گیا ہے!"

"اللہ اکبر" عبداللہ نے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر لشہ نے نفرت سے کہا "جس شے کی تم مردوں کی طرح حفاظت نہیں کر سکے، اس کے چھن جانے پر عورتوں کی طرح آنسو کیوں بہا رہے ہو۔"

ادھر اسی وقت کاؤنٹ ٹیوڑلا اور پادری آ رہے تھے۔ باب العدل میں سے گذر کر۔۔۔ باب الخمر میں سے گذر کر۔۔۔ فصیل سے چھوٹی پگڈنڈی پر چل کر۔۔۔ انہی تنگ سیڑھیوں کو طے کر کے وہ اس برج کی چوٹی پر پہنچے۔ اس میدان میں آئے جہاں میں کھڑا تھا۔۔۔ کاؤنٹ ٹیوڑلا کے ہاتھوں میں قشتالیہ کا پرچم تھا اور ایک پادری صلیب اٹھائے ہوئے تھا۔۔۔ جونہی صلیب بلند ہوئی نیچے میدان میں جمع فرڈیننڈ اور اس کی افواج زمین بوس ہوئے اور مقدس مریم کی شان میں نغمے گانے لگے۔۔۔ غرناطہ کے جن گھروں میں حسن رچ گیا تھا، اُن کے دروازے اور کھڑکیاں بند تھے اور مکین آہ و زاری اور گریہ میں نڈھال ہو رہے تھے۔

عبداللہ چند برس تک البشارت کی سنسان ریاست میں قیام پذیر رہا مگر پھر تنہائی سے تنگ آ کر افریقہ چلا گیا جہاں بعد میں اس کی اولاد نے کاسۂ گدائی دراز کر کے بھیک مانگنا سیکھ لیا۔

غرناطہ ختم ہو گیا مگر البشارت کے پہاڑوں میں روپوش ہزاروں مسلمانوں نے پچاس سال تک ہتھیار نہ ڈالے۔ اس کے بعد دیگا کے مسلمان کسانوں نے بغاوت کر دی اور غرناطہ پر قابض ہو کر ایک دھوبی محمد بن امیّہ کو اپنا سلطان چن لیا۔ امیّہ کے قتل پر عبداللہ بن ابو سلطان نامزد ہوا۔ عیسائیوں نے ایک طویل جدوجہد کے بعد اس بغاوت پر قابو پایا اور بن ابو کا سر کاٹ کر باب البیرہ پر رکھ دیا۔

کچھ عرصہ تک عیسائیوں نے فتح کی خوشی میں مسلمانوں کو مُورز کی بجائے مُورسکو یعنی حقیر مُور کہنے پر ہی اکتفا کیا۔ پھر رفتہ رفتہ مُورش تہذیب کے زمین بوس درخت کی سوکھی جڑیں بھی کھود

ڈالی گئیں۔ کارڈینل سسروس نے تمام عربی تصانیف اور لائبریریوں کی کتب کو نذرِ آتش خود ہسپانوی بھی اسے ایک ناقابلِ تلافی تاریخی جرم گردانتے ہیں۔ ۱۵۵۶ء میں فلپ دو نے تمام مسلمانوں کو اپنا مذہب تبدیل کر دینے کا حکم دیا اور ۱۶۰۹ء میں فلپ سوم نے بقیہ ما، لاکھوں مسلمانوں کو ہسپانیہ سے نکال دیا۔ اِن میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو مجبوراً عیسائی اختیار کر چکے تھے۔ کیسا بھیانک اتفاق ہے کہ ۹۲۳ برس پیشتر جس جبل الطارق کے سامنے مسلمان بطور فاتحین لنگر انداز ہوئے تھے، وہیں سے اُن کی اولاد کو جہازوں میں ٹھونس افریقہ دھکیل دیا گیا۔

بُرج الغفر کی وسیع چھت پر اب دھوپ چمک رہی تھی۔ دیوار پر جہاں آج سے چار سنتر برس پیشتر صلیب بلند ہوئی تھی، لوہے کے فریم میں ایک وزنی گھڑیال لٹک رہا تھا۔ گھڑیال ہر سال دو جنوری کو غرناطہ کی دوبارہ فتح کی خوشی میں بجایا جاتا ہے۔ اس سانحے کی بنا کی جاتی ہے جس کی سوگوار کسک آج بھی مراکو اور تیونس میں بسنے والے ان عربوں کے دلوں اٹھتی ہے جنہیں غرناطہ سے جلاوطن کیا گیا تھا۔

سیڑھیوں میں سے چند نوجوان لڑکیاں ہنستی ہوئی برآمد ہوئیں اور ادھر اُدھر دیکھے بھاگتی ہوئی گھڑیال کے قریب چلی گئیں۔ پہلے ان سب میں سے عمر میں بڑی لڑکی نے گھڑیال بھاری بھرکم حجم پر ہتھیلیاں جما کر اُسے دھکیلنا چاہا مگر ناکام رہی۔ پھر دوسری نے قسمت آزمائی مگر وہ بھی لوہے کے اس دیو کو حرکت نہ دے سکی، اس کے بعد سب نے مل کر زور لگایا اور ا زور دار "ٹن" گھڑیال میں سے گونج کر غرناطہ کی گہرائیوں میں گم ہو گئی۔ غرناطہ میں روایت ہے کہ ا کوئی نوجوان لڑکی برج کے اس گھڑیال کو بجانے میں کامیاب ہو جائے تو ایک سال کے اندر اندر اس کی شادی ہو جاتی ہے۔ چونکہ ان ہسپانوی لڑکیوں نے یہ شرط اجتماعی طور پر پوری کی تھی، اس لئے اب وہ آپس میں اس بات پر بحث کر رہی تھیں کہ گھڑیال کو بجانے میں سب سے زیادہ کس کا ہاتھ ہے تاکہ سطے کیا جا سکے کہ شادی کا سفید لباس اس برس کس کے جسم پر سجے گا۔ میں اُنہیں اس خوشگوار بحث میں اُلجھا چھوڑ کر سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔

الحمرا کے وہ محافظ جنہیں میں باب العدل کے قریب تالاب کے کنارے دھوپ سینکتا

وڑ گیا تھا ابھی تک وہاں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ یہ حوض غرناطہ کے پہلے گورنر کاؤنٹ ٹلا نے فتح کی یاد میں تعمیر کروایا تھا۔ یادگاری تختی پر حسب ذیل عبارت لاطینی میں تحریر ہے۔

"فرڈیننڈ اور ازابیلا شاہ وملکہ نے یہ سلطنت اور شہر غرناطہ بزور شمشیر فتح کیا تھا اور جس کے منتے مسلمان سلطان مولائے حسن (عبداللہ) اپنی سلطنت اور الحمرا سے بتاریخ ۲ جنوری ۱۴۹۲ء بردار ہوا۔ اہل عرب کو بدستور ان کے مکانات ومواضعات میں رہنے کی اجازت دی گئی۔"

آج قصر الحمرا میں سیاحوں کا غیر معمولی ہجوم تھا۔ ایک ایسی عمارت جو بنیادی طور پر صرف بند افراد کی رہائش کی مناسبت سے تعمیر کی گئی تھی، ہجوم کے باعث بے حد مختصر لگ رہی تھی۔ ن فوٹوگرافر حسب معمول فوارے کے ایک شیر کے منہ میں کیمرہ دیئے تصویریں بنا رہا تھا۔

یں ایوانوں میں سے نکل کر اس وسیع میدان میں آگیا جہاں صرف کھنڈر تھے یا الحمرا کی فصیل سے ملتے ہوئے پندرہ سرخ برج۔ برج القمارش کے ساتھ بل کھاتی فصیل میں برج الاسلحہ، برج ستعظیم، برج السیف، برج النبات، برج القندیل اور برج ہفت منزلہ نظر آرہے تھے۔ میں اس استے کا تعین کرنا چاہتا تھا جہاں سے گذر کر عبداللہ باب الجدور کے راستے الحمرا سے باہر نکلا تھا۔ جاتا ہے کہ جونہی عبداللہ باب الجدور سے باہر نکلا، اس تاریخی گذرگاہ کو اس کی خواہش کے مطابق اینٹوں سے پُر کر دیا گیا تھا۔ ایک دشوار گذار راستے سے گذر کر جب میں اس مقام پر پہنچا، جہاں نقشے کے مطابق باب الجدور ہونا چاہیے تھا تو وہاں خاردار جھاڑیوں اور چند اینٹوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ عبداللہ کی بدنامی کے اس داغ کو فرانسیسی فوج نے غرناطہ سے پسپائی کے وقت بارود سے دھو دیا تھا۔ سرخ بھربھری مٹی پر اگی ہوئی چھدری گھاس کے درمیان کہیں کہیں منقش اینٹیں ابھری ہوئی تھیں۔

باب الجدور کے ملبے کے قریب فصیل میں ایک دروازہ تھا جس میں سے گذر کر میں نے سیڑھیاں طے کیں اور فصیل کے اس حصے پر آنکلا جو باب العدل کی جانب واقع ہے اور جس کے قدموں میں چناروں کے درخت ہیں۔ اس امید پر کہ آخری سرے پر کسی اور راستے سے نیچے اتر جاؤں گا میں نے فصیل کی چوڑی چھت پر چلنا شروع کر دیا۔ دھوپ بے حد تیز تھی اور چند قدم اپنے

کے بعد میں پسینے سے تر ہو گیا۔ فصیل کی لمبائی میرے اندازے سے کہیں زیادہ تھی۔ خدا خدا کر باب العدل کے قریب پہنچا۔ سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا تو دروازہ بند تھا چنانچہ پھر واپس مڑا اور ایک مرتبہ پھر یہ طویل فاصلے طے کر کے بمشکل باب الجدید تک آیا۔

الحمرا کے اس ویران حصے میں سیاحوں کے علاوہ محافظ بھی کم ہی آتے ہیں۔ اس آزادی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے کسی ماہر قدیمہ کی طرح کھنڈروں میں اِدھر اُدھر تانک جھانک شروع کر دی۔ کہیں کوئی پرانی اینٹ یا ٹائل کا ٹکڑا خاک میں دبا نظر آتا تو اُسے کھود کر نزدیکی تالاب میں دھوتا اور اس پر کندہ نقوش سے اندازہ لگاتا کہ یہ کس قسم کی عمارت کا حصہ ہو سکتا ہے۔ اگر قانونی پابندیاں حائل نہ ہوتیں تو میں الحمرا کے یہ خوبصورت تاریخی ٹکڑے اپنے ہمراہ وطن لے آتا۔

ایک مقام پر جہاں سے باغوں میں گھری جنت العریف کی عمارتیں روبرو نظر آتی ہیں۔ الحمرا کی فصیل ایسی دو شاخوں میں بٹ گئی تھی جنہیں ایک گہری کھائی ایک دوسرے سے علیحدہ کرتی ہے اس کھائی کو عبور کرنے کے لئے فصیل کے دونوں حصوں پر لکڑی کا ایک شہتیر دھرا ہوا تھا۔ میں اس لرزتے ہوئے پل پر سے گذر کر دوسرے حصے پر پہنچا۔ آخری سرے پر ایک شکستہ برج کی عمارت کھڑی تھی۔ دروازے کا ایک کواڑ چوکھٹ سے علیحدہ ہو کر سیڑھیوں میں پڑا تھا۔ میں اندر چلا گیا۔ سیڑھیاں بھی انتہائی مخدوش حالت میں تھیں۔ جا بجا کھلے شگافوں میں سے ہوا سرسراتی ہوئی اندر آ رہی تھی۔ ان میں سے کھائی میں بل کھاتے دریائے حدرہ کا پانی چمکتا نظر آ رہا تھا۔

دیواروں کی اینٹوں میں سے سرخ گارا سفوف کی صورت میں سیڑھیوں پر گر رہا تھا۔ میں شگافوں سے بچتا بچاتا بڑی آہستگی سے قدم اٹھاتا اوپر چڑھنے لگا۔ سیڑھیوں کے اختتام پر ایک اور بند دروازہ تھا جس پر لکڑی کا ایک تختہ میخوں سے گاڑا ہوا تھا۔ زنگ آلود میخوں سے ظاہر تھا کہ یہ دروازہ ایک مدت سے بند پڑا ہے اور الحمرا کے بقیہ برجوں کے برعکس یہاں عرصے سے کسی ذی روح نے قدم نہیں رکھا۔ پہلے سوچا واپس چلا جاؤں کہیں ایسا نہ ہو کہ دروازہ کھولنے کی کوشش میں پورا برج منہدم ہو جائے اور میں اس کے ملبے میں دفن دریائے حدرہ میں غرق ہو جاؤں یا زندہ بچ نکلنے کی صورت میں گارڈ یا سول مجھے قصر الحمرا مسمار کرنے کے جرم میں دھر لے۔ پھر نامعلوم کو جاننے کی وہ قدرتی حس جو ہر سیاح کا خاصہ ہے مجھ پر غالب آئی اور میں

ایک اینٹ اُٹھا کر تختے کی میخوں کو اکھاڑنا شروع کر دیا۔ میخیں تو خیر کیا اکھڑتیں البتہ بوسیدہ سال خوردہ مٹی اینٹ کی چند ضربوں سے ہی ٹوٹ کر بکھر گئی۔ میں نے زور لگا کر کواڑ دھکیلے اور بُرج کے اندر داخل ہو گیا۔ سیڑھیوں کی طرح بُرج کی اندرونی حالت بھی بے حد مخدوش تھی۔ فرش اکھڑا ہوا۔ الحمرا کی جانب کھلنے ایک جھروکے کا مکمل ملبہ فرش پر اس انداز میں پڑا تھا جیسے کسی نے بعد احتیاط سے اُسے وہاں لٹا دیا ہو۔ دو کھڑکیوں میں لکڑی کے تختے چنے ہوئے تھے چھت تلے پرندوں کے گھونسلے ہوا کے زور سے گھنٹیوں کی طرح ہل رہے تھے۔ ان میں سے گرتے ہوئے پَر اور تنکے بُرج میں اڑ رہے تھے۔ میں نے بُرج کی تمام دیواروں کو چھُو کر اطمینان کر لیا کہ از کم میرے غرناطہ کے قیام کے دوران یہ مسمار نہیں ہو گا اور پھر فرش پر نقشہ پھیلا کر سگریٹ سلگا لیا۔ یہ بُرج جو غالباً برج النبات کے نام سے مشہور ہے الحمرا کے ایک ایسے دُور دراز اور سنسان حصّے میں واقع ہے جہاں کسی سیّاح یا محافظ کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک جھروکے میں سے قصر الحمرا اور القصبہ دکھائی دے رہے تھے اور دوسری طرف کھائی کے پار جنت العارفین اپنی تمام تر رعنائیوں سے جلوہ گر تھی۔ اس بُرج میں اکیلے بیٹھے ہوئے میرے ذہن میں ایک نہایت غیر معمولی اور بظاہر احمقانہ خیال آیا.... الحمرا سے کٹے ہوئے اس سنسان بُرج میں اگر ایک شب بسر کی جائے تو....

روزمرہ کی نارمل روٹین میں جکڑا انسان ایسے انوکھے تجربات کا تصوّر کبھی کرے تو وہ اپنے مقید ذہن کے تحت نکتۂ اعتدال سے ہٹا ہوا جان کر ان کا ذکر کرتے سے گریز کرے گا۔ لیکن ایک آوارہ گرد یا محتاط الفاظ میں ایک سیّاح معمول کی زنجیر کے حلقوں سے اپنا ناطہ توڑ کر ایسے ہی غیر معمولی تجربات کی چاہت میں گھر سے نکلتا ہے۔ مثلاً مختصر سوچ رکھنے والا ایک ذہن اس تجربے کو نہایت بے مقصد گردانے گا کہ الحمرا کے کسی ویران بُرج میں ایک شب بسر کی جائے لیکن میرے نزدیک سیّاحت کے انگوروں کے رس میں روحِ شراب تبھی حلول کرتی ہے اگر اسے بظاہر بے مقصد تجربات کی بھٹی پہ آنچ دی جائے۔ مشہور شہر اور تاریخی عمارتیں دیکھ لینے سے سیّاحت کی پورٹریٹ کا صرف خاکہ ہی بنتا ہے۔ اس میں شوخ و شنگ رنگ ان غیر معمولی تجربات ہیں سے گذر کر ہی بھرے جا سکتے ہیں۔ میرے پاس سلیپنگ بیگ موجود تھا۔

خوراک کا انتظام بھی ہو سکتا تھا چنانچہ میں اپنی پانسیان کے کمرے کی بجائے بآسانی اس دیر برج میں شب بسر کر سکتا تھا۔ ۔ ۔ صرف معمول سے ہٹ کر غیر معمول کے ذائقے سے آشنائی کی خاطر۔ ۔ ۔ بہرحال میں نے برج کی سیڑھیوں سے نیچے اُترتے وقت اور پھر دونوں فصیلوں پر رکھے شہتیر کو عبور کرتے ہوئے واپسی کے راستے کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔ الحمرا سے باہر آ کر میں بس پر سوار ہو گیا جو ڈھلوان پر اُتر کر مجھے بیبارمبلا تک لے گئی۔

کوئے یار کا مسافر

اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جانے کو تھا کہ برابر کے کمرے میں سے گاردیا سول کے دو سپاہی شکار سے لوٹتے کامیاب شکاری کا تکبر چہرے پر پھیلائے باہر آئے اور راہداری میں فوجی انداز سے چلتے پانسیان کی سیڑھیوں سے نیچے اُتر گئے۔ پھر اُسی کمرے میں سے کون چپتیا اور رومالاگر وسا تتلیوں کی طرح ہتھیلیاں ہوا میں لہراتیں سرہلاتی نکلیں، اور ان کے پیچھے پانسیان کا مالک انتہائی مضطرب چہرہ لیے برآمد ہُوا۔

"میں ایک شریفانہ قسم کا ہوٹل چلاتا ہوں...... اب کسی کے چہرے پر تو نہیں لکھا ہوتا کہ وہ لٹیرا یا انقلابی ہے...... ہمیشہ سے جنرل ازمو فرانکو کا حامی رہا ہوں" وہ بڑبڑاتا ہُوا چلا گیا۔

میرا تجسس بڑھا اور میں نے آگے بڑھ کر کمرے کے کھلے دروازے میں سے اندر جھانکا...... ایک ادھیڑ عمر شخص انتہائی عجلت کے عالم میں کمرے میں بکھرے کپڑوں اور کتابوں کو اُٹھا اُٹھا کر ایک ٹوٹے ہوئے سوٹ کیس کے کھلے ڈھکنے میں پھینک رہا تھا...... آہٹ سُن کر وہ چیتے کی طرح پھرتی سے مڑا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا "چلا جاتا ہوں...... ایک لٹیرے کو بھی سامان پیک کرنے کے لیے تین چار منٹ درکار ہیں۔"

اُس کے گھنے بال برف کی طرح سفید تھے۔ چہرے پر بڑھی ہوئی داڑھی گندم کے تازہ کٹے ہوئے کھیت کی مانند سخت اور کھردری نیم وا سیاہ آنکھوں پر پپوٹوں کا عمر رسیدہ گوشت ڈھلک رہا تھا۔

مجھے خاموش پا کر وہ قریب آگیا۔ سیاہ آنکھوں کی چمک نے سر سے پاؤں تک میرا

جائزہ لیا۔" میری بینائی دن بدن کمزور ہو رہی ہے۔ میں سمجھا پانسیان کا مالک پھر آگیا ہے
......" کون ہو؟"

"ایک پاکستانی سیّاح ...... اُندلس میں اجنبی ہوں!"

"میں بھی ایک سیّاح ہوں...... اپنے ہی وطن کی سیّاحت کر رہا ہوں...... اُندلس کا رہنے والا ہوں مگر پھر بھی اُندلس میں اجنبی ہوں............" وہ زیرِ لب بڑے دُکھ سے کہہ رہا تھا۔

"میں پچھلے تین روز سے اس پانسیان میں مقیم ہوں مگر اس سے پیشتر آپ سے ملاقات نہیں ہوئی......" میں نے پوچھا۔

"اس لیے کہ مجھے غرناطہ اور اس پانسیان میں آئے ہوئے صرف تیس منٹ ہی گذرے ہیں۔" اُس نے ہسپانوی شاہکار تصویروں کی ایک کتاب سُوٹ کیس میں ٹھونستے ہوئے تلخی سے کہا۔ "اور گارڈیا سول...... فاشسٹ فرانکو کی قہرانگیز گاردیا سول نے اگلے تیس منٹ کے اندر اندر مجھے غرناطہ چھوڑ دینے کا حکم دیا ہے۔"

پیکنگ سے فارغ ہو کر وہ کھڑکی پاس جا کھڑا ہُوا اور ایک تُڑامُڑا سگرٹ سُلگا کر بے حد اطمینان سے باتیں کرنے لگا: "میرا قصور یہ ہے کہ میں نے اپنے وطن کی آزادی کے لیے جد وجہد کی...... فاشسٹوں کی بجائے عوام کا ساتھ دیا مجھے فخر ہے کہ میں دفاعِ میڈرڈ کے اگلے مورچوں میں تھا۔"

اب مجھے معلوم ہُوا کہ اس شخص کی موجودگی ہوٹل میں گاردیا سول کی آمد کا باعث کیوں بنی تھی۔ ہوٹل کا مالک اس بے ضرر کرایہ دار کو اپنی چھت تلے جگہ دینے سے کیوں انکاری تھا...... یہ بوڑھا ہسپانوی خانہ جنگی کا ایک شکست خوردہ کردار تھا۔ ایک ہارا ہُوا انسان جس کا پیچھا فاتح کا قانون ایک شکاری کتّے کی طرح کر رہا تھا۔

"میرے شہر لاہور میں بھی ایک جلاوطن ہسپانوی مدّت تک مقیم رہا۔ وہ بھی خانہ جنگی میں شامل تھا۔"

"اِسے خانہ جنگی مت کہو......" اس کے نتھنے غصّے سے پھڑکنے لگے "یہ تو پورے

یورپ کی فاشسٹ قوّتوں کے خلاف ہم ہسپانویوں کی تاریخی جدوجہد تھی۔ ہماری سچائی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ یورپی دنیا کے دانشوروں اور شاعروں نے نہ صرف ہمارے مؤقف کی حمایت کی بلکہ ہمارے شانہ بشانہ شریکِ جنگ بھی رہے۔ انٹرنیشنل برگیڈ میں شامل ادیب کاڈویل، کارن فورڈ، جولین بیل اور جارج آرویل ہمارے ساتھی تھے.......“

”کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس خانہ جنگی....... جنگِ آزادی میں نصف ہسپانیہ کو بقیہ نصف ہسپانیہ نے ہلاک کر ڈالا.......“

”وہ جھوٹ کہتے ہیں“ بوڑھا سپاہی کھڑکی سے ہٹ کر میرے قریب آ گیا۔ ”دیکھنا یہ ہے کہ وہ نصف حصہ کون سا ہے جس نے بقیہ نصف حصے کو ہلاک کر ڈالا...... وہ فاشسٹوں کا حصہ تھا... لیکن اس جنگ کے انجام نے ثابت کر دیا کہ فتح ہمیشہ حق کی نہیں ہوتی۔ شکست کے بعد میں فرانس کے راستے فرار ہو کر برازیل چلا گیا جہاں میں کسی کالج میں پڑھانے کی بجائے پچھلے تیس برس سے گوشت پیک کرنے کی ایک فیکٹری میں کام کرتا ہوں۔ مجھے وہاں ہر طرح کا آرام میسّر ہے مگر جس وطن کی خاطر میں جلا وطن ہُوا اس کی کسک مجھے پھر واپس کھینچ لائی ہے۔ دس سال کی مسلسل تگ و دو کے بعد مجھے فرانکو نے ہسپانیہ میں داخل ہونے کی اجازت دی ہے اور تم جانتے ہو انھوں نے مجھے کتنی مہلت دی ہے؟..... صرف دس روز! میں اپنے آبائی گاؤں لوٹا گیا...... میری بیوی مر چکی تھی۔ بچے جانے کہاں گئے۔ آج غرناطہ آ گیا۔ اس خیال سے کہ کم از کم اس مقام کو تو دیکھ لوں جہاں انھوں نے ہمارے دوست لورکا کو قتل کیا تھا..... مگر یہاں بھی میرا وہی حشر ہوا جو اس سے پیشتر میڈرڈ، قرطبہ اور بارسلونا میں ہوا تھا۔ قانون کے مطابق مجھے شہر میں آمد پر اپنی رہائش کی اطلاع قریبی پولیس سٹیشن کو دینا ہوتی ہے اور جب گارڈ یا سول ہوٹل میں آ کر میری رپورٹ تیار کرتے ہیں تو ہوٹل کا مالک خائف ہو کر مجھے بلا تامّل باہر نکال دیتا ہے..... ادھر گارڈ یا سول اس بہانے کہ میرے پاس رہائش کا انتظام نہیں ہے مجھے فوراً شہر سے چلے جانے کا حکم دے دیتے ہیں......... یہاں ایک انقلابی کسی چور لٹیرے سے زیادہ خطرناک سمجھا جاتا ہے۔“ اس نے بے بسی سے سر جھٹکا

اور سگرٹ کا آخری کش لگا کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"اب آپ کہاں جائیں گے؟"

"ابھی تین روز باقی ہیں...... بس سٹیشن پر جا کر کسی بھی سمت کو جاتی ہوئی بس پر سوار ہو جاؤں گا۔ منزل کا تعین کیے بغیر کہ مقصد صرف اپنی بینائی سے محروم ہوتی ہوئی آنکھوں کو آخری مرتبہ اپنے پیارے وطن کے دُھندلے نقش و نگار دکھانا ہے۔ اپنے بوڑھے جسم سے اس دھرتی کو چھُونا ہے جس میں میرے دوستوں میرے پیاروں کا خون جذب ہے..... اُن خوشبوؤں سے تجدید محبت کرنا ہے جو پردیس میں مجھ تک نہیں پہنچ پاتیں......"

وہ سُوٹ کیس اُٹھانے لگا تو میں نے آگے بڑھ کر پیشکش کی "لائیے میں آپ کو بس سٹیشن تک چھوڑ آتا ہوں!"

"نہیں...... اس نے بوڑھی آنکھیں کھڑکی پر جما دیں "ہوٹل کے باہر سیکیورٹی کا کوئی نہ کوئی کارندہ سادہ کپڑوں میں ضرور موجود ہوگا...... تم خواہ مخواہ اُن کی نظروں میں آجاؤ گے۔"

اُس کے بوڑھے بازوؤں نے جب سُوٹ کیس کا بوجھ اُٹھانے سے انکار کر دیا تو اس نے اسے سٹریپ سے پکڑا اور گھسیٹتا ہُوا کمرے سے باہر لے گیا۔

"اس سُوٹ کیس میں اگر کپڑوں کی بجائے اتنے ہی وزن کے ہینڈ گرینیڈ بھرے ہوتے تو آج بھی میرے بازوؤں کو یہ پرندے کے پر سے بھی ہلکا محسوس ہوتا" وہ ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے مسکرا دیا اور پھر کچھ سوچ کر آہستہ سے بولا "نوجوان...... کیا تم میرے لیے ایک چھوٹا سا کام کر سکتے ہو؟"

"خوشی کے ساتھ...... فرمائیے؟"

"اگر ہو سکے تو اُس مقام پر جانا جہاں اُنھوں نے گارسیا لورکا کو ہلاک کیا تھا......" اُس کے ڈھلکے ہوئے پپوٹوں تلے نم یادیں تیرنے لگیں "...... بس کہہ دینا ایک دوست ملنے کے لیے آیا تھا...... اگر ہو سکے تو......" وہ جلدی سے پیچھے مڑا اور پھر فرش پر گھسٹتے ٹین کے سُوٹ کیس کی رگڑ یُوں گونجی جیسے تیس برس بیشتر چلنے والی تمام مشین گنوں کی آواز نے ایک بار پھر پورے ہسپانیہ کو لپیٹ میں لے لیا ہو۔

اور ماریا زامبرا ناچ رہی تھی

غرناطہ کے سب سے بڑے کلیسا کیتھڈرل رائل کے ایک کونے میں چیپل رائل کی مختصر عمارت ہے۔ دروازے کے عین اُوپر کسی غیر معروف مصوّر کی معروف تصویر کیتھولک فرمانرواؤں کے حضور شہر غرناطہ کی دست برداری "آویزاں ہے۔

ایک نیم تاریک اور بنیادی طور پر سرخ ماحول میں کیتھولک بادشاہ فرڈیننڈ سرخ لبادے اور ٹوپی میں ملبوس سُموں تک آراستہ گھوڑے پر سوار۔ پہلو میں ملکہ ازابیلا سفید گھوڑے پر براجمان دیگر درباریوں کے جلو میں۔ شاہی گھرانے کے افراد اور دیگر درباریوں کے چہروں پر ایک تحقیر آمیز مسکراہٹ۔ ملکہ اور بادشاہ کے گھوڑوں کی باگیں تھامنے والے ملازم بھی فتح کے نشے میں سرشار...... اُدھر آخری تاجدارِ غرناطہ عبداللہ ایک سیاہ گھوڑے پر سوار اس فاتح گروہ کی جانب بڑھ رہا ہے۔ شکست خوردہ اور شان و شوکت سے عاری۔ پیچھے متعدد درباری احساسِ ندامت تلے دبے سر جھکائے کھڑے ہیں۔ موسیٰ خوش قسمت تھا کہ مفتوحین کے اس گروہ میں کھڑے ہونے کی ذلت سے بچ گیا۔ سیاہ ریش بدقسمت عبداللہ آہنی خود پہنے ہوئے بائیں ہاتھ میں پکڑی ایک بڑی چابی فرڈیننڈ کی جانب بڑھا رہا ہے۔ پس منظر میں قصرالحمرا اور غرناطہ کے سوگوار مکان نظر آرہے ہیں....

چیپل رائل کے درمیان ایک آہنی پھولدار جنگلے میں شاہی افراد کے چار تابوت دھرے ہیں جن پر اُن کی شبیہیں اُبھری ہوئی ہیں۔ یہ بُت ان کے ڈیتھ ماسک سے تیار کیے گئے تھے...... فاتح فرڈیننڈ سینے پر ہاتھ باندھے سو رہا ہے۔ پہلو میں ازابیلا بھی اُسی حالت میں بسترائی ہوئی ہے۔ مگر بُت تراش نے میاں بیوی کے ناخوشگوار تعلقات

کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ازابیلا کا چہرہ فرڈیننڈ سے ہٹا ہُوا تراشا ہے۔ ازابیلا کے ساتھ ان کی پاگل بیٹی جُوآنا لیٹی ہوئی ہے جسے اس کے خوبرو مگر ظالم خاوند فلپ اوّل نے مصلوب کر دیا تھا۔ جُوآنا کا قاتل خاوند بھی اُس کے پہلو میں خوابیدہ ہے۔ یہ چار نمائشی تابوت آہنی جنگلے میں سطحِ زمین سے دو فٹ کی بلندی پر رکھے ہیں۔ جنگلے کے ساتھ نیچے تہ خانے تک سیڑھیاں جاتی ہیں جہاں تانبے کے بنے ہوئے سادہ تابوتوں میں ان کی لاشیں مقیّد ہیں۔

فرڈیننڈ اور ازابیلا کو ان [illegible]ت کے مطابق پہلے الحمرا میں دفن کیا گیا تھا، جہاں اُن کے کتبے پر "یہاں وہ کیتھولک بادشاہ آرام کر رہے ہیں جنہوں نے ہسپانیہ میں محمدؐ کی بدعت کو ختم کیا" ایسے مذموم الفاظ کندہ تھے۔ بعد میں اہلِ غرناطہ نے جن کے نزدیک یہ پیروں کا درجہ رکھتے ہیں قبریں کھود کر تابوت چیپل رائل میں منتقل کر دیے کہ کافر مُوروں کے محل الحمرا میں یہ مقدس ہستیاں چین سے نہ سو سکیں گی۔ تہ خانے میں معدودے چند افراد ہی اُترتے ہیں مجھے یہاں کھڑے ہو کر تاریخ کے اُس بے رحم انصاف کی قوّت کا اندازہ ہُوا جسے موت بھی زائل نہیں کر سکتی۔ فاتح فرڈیننڈ اور ازابیلا اپنے وطن قشتالیہ اور آراگان کی بجائے ایک مفتوح شہر میں محوِ خواب ہیں اور شکست خوردہ عبداللہ اپنی جائے پیدائش غرناطہ کی بجائے افریقہ کے صحراؤں میں گمنام سوتا ہے۔

چیپل سے ملحقہ ایک مختصر عجائب گھر میں کیتھولک بادشاہوں کے نوادرات رکھے ہیں۔ ازابیلا اور فرڈیننڈ کے چوبی مجسّمے حالتِ عبادت میں دو زانو۔ اُن کے گالوں پر سُرخ رنگ یوں لگایا گیا تھا جیسے ایک دیہاتی عورت میک اپ استعمال کرتے وقت گالوں پر غازہ تھوپ لیتی ہے۔ میں ان مجسّموں کے قریب کھڑا تھا کہ حسبِ معمول ایک گائیڈ بھنبھنے کی طرح وارد ہُوا اور نوادرات کی تفصیل بتانے لگا۔

"یہ فرڈیننڈ کا عصا ہے اور یہ ہے اس کا تاجِ شاہی۔۔۔۔۔"

تاجِ شاہی دو تین سنہری پتریوں اور چند نگین پتھروں پر مشتمل تھا۔ عصا بھی واجبی سائز کا تھا۔

"یہ ملکہ ازابیلا کا ذاتی آئینہ ہے جسے وہ بوقتِ آرائش استعمال کرتی تھیں۔"

"مجسمے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ موصوفہ آئینے کے بغیر ہی غازہ لگایا کرتی تھیں"۔

"اور یہ دعاؤں کی وہ مقدس کتاب ہے جسے ازابیلا نے پڑھا اور ان کی برکت سے غرناطہ دوبارہ فتح ہوا"۔

"یعنی ازابیلا وہ پہلی ملکہ تھی جس نے اس مقدس کتاب کو پڑھا ورنہ غرناطہ کب کا فتح ہو چکا ہوتا.........."

اب کے گائڈ قدرے چوکنا ہوا اور کھانس کر بولا "سیاحوں کی حس مزاح......... بہرحال یہ فاتح غرناطہ کی وہ نادر تلوار ہے جس کی دھار مُوروں کے پلید خون سے آلودہ ہوئی........."

"تلوار خاصی مختصر ہے......... خیر فرڈیننڈ ٹھگنے قد کا ہوگا"

گائڈ کے کان کھڑے ہو گئے اور ترشی سے بولا "آپ مذاق کر رہے ہیں؟"

میں نے بیس پسیتے کا ایک نوٹ اس کی جیب میں اُڑس کر پوچھا "کیا خیال ہے؟"

"آپ یقیناً مذاق ہی کر رہے تھے" اس نے جیب تھپتھپا کر اعلان کیا اور کسی اور شکار کی تلاش میں نکل گیا۔

کیتھڈرل رائل کے چوک المطرانیہ میں مرسیڈس ایک خانہ بدوش لڑکی کے ساتھ ایک ایسی گڑیا کا بھاؤ تاؤ کرنے میں مشغول تھی جس کا ناک نقشہ اور لباس اتنا مکمل تھا کہ وہ اپنی خالق خانہ بدوش کی ننھی ایجر کاپی لگ رہی تھی۔ گزشتہ شب میں نے مرسیڈس کے ساتھ اس چوک میں ملاقات کا وقت طے کر لیا تھا، کیونکہ میں فلمی رسالوں کی شوقین ہوسٹل کی راہبہ سے دوبارہ مڈبھیڑ کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں قریب پہنچا تو وہ گڑیا کا سکرٹ اٹھائے اُس کے گڑیا ہونے کی تصدیق کر رہی تھی۔

"کم از کم گڈا نہیں ہے........." میں نے جھانکتے ہوئے تسلی دی۔

مرسیڈس نے جھینپ کر سکرٹ نیچے کر دیا اور مسکرا کر کہنے لگی "ایک مُور غرناطہ

کے کلیسا میں کیا کر رہا تھا؟"

"غرناطہ کو اُس سے چھین لینے والے اکابرین کے مقابر کی زیارت کر رہا تھا اور اُن کے مجسمے دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ موصوف غازہ بھی استعمال کرتے تھے ..... "

منہ بنا کر بولی "کومو استا اُستد؟"

"موئے بیان ..... ٹھیک ہوں!"

"تم فلیمنکو کے فلیمنکو ہی رہے ...... مجسّمے کے گالوں پر سرخی انھیں برگزیدہ ظاہر کرنے کے لیے لگائی جاتی ہے ....."

"اپنے ہاں ایک کہاوت ہے کہ اگر دوسروں کی صحت اچھی ہو تو اپنا چہرہ پیٹ پیٹ کر سُرخ نہیں کر لینا چاہیے ....."

"ہمارے نزدیک فرڈیننڈ اور ازابیلا پہنچے ہوئے بزرگ تھے" وہ تقدّس کے لہجے میں بولی اور گڑیا مجھے تھما دی "یہ تمھارے لیے ہے ...... سوونیئر!"

میں بے دھیانی میں گڑیا کا سکرٹ اُٹھا کر دیکھنے لگا تو مرسیڈس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ "دِے نادا"

خانہ بدوش لڑکی جو ابھی تک ہمارے پاس کھڑی تھی میری اس حرکت سے محظوظ ہو کر کھلکھلا کر ہنس دی ...... لمبی دھڑک اور آزاد ہنسی۔ اس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ اوپر کیا تو پلاسٹک کی چوڑیاں اور منکے کہنی کے قریب اُس کے گداز پنڈے پر چھناک سے آ گرے۔ انگلیوں میں پروئے کاسترنات کو اس نے جھٹک کر بجایا اور پھر ہاتھ نیچے کر لیا۔ چوڑیاں واپس کلائی پر آ گریں "صرف پچاس پسیتے"

میں نے مطلوبہ رقم خانہ بدوش کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھی اور کاسترنات خرید کر مرسیڈس کے حوالے کر دیے "تمھارے لیے سوونیئر ......"

اس نے لکڑی کے بنے ہوئے ان ٹھیپوں کو انگلیوں میں ڈال کر ایک دو مرتبہ ہلایا مگر مشین گن کی رُکی ہوئی ٹک ٹکاٹک کی بجائے عجیب بے سُری ڈھب ڈھب قسم کی آواز برآمد ہوئی۔

"مجھے تو بجانے بھی نہیں آتے ...." وہ روہانسی ہو کر بولی۔

"آج ہم خانہ بدوشوں کی غاروں میں چلیں گے اُنھی سے سیکھ لینا..."

مرسیڈس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر ایک ترچھی نظر ڈالی "اطلاعاً عرض ہے کہ مقدس پہاڑی پر اس وقت ہُو کا عالم طاری ہوگا اور تمام خانہ بدوش اپنی اپنی ایئر کنڈیشنڈ غاروں میں سو رہے ہوں گے .... زامبرا کا ہنگامہ تو بجے شب کے بعد شروع ہوتا ہے۔"

"اتنے میں ہم البیین کا مُورِش محلہ دیکھ لیں تو کیا حرج ہے؟"

"کوئی حرج نہیں ...." مرسیڈس نے آج پہلی مرتبہ "فارورڈ ایکشن" انداز میں سر جھٹکا اور ساتھ ہی پیراسیوس آنکھیں بھی جھپکا دیں .... یہ ہر دو انداز اپنی اپنی جگہ بھی نہایت دلکش تھے۔ مگر ان کا یکجا استعمال میرے جیسے کمزور دل انسان کے لیے نہایت مہلک ثابت ہو سکتا تھا۔ اس خدشے کا اظہار میں نے مرسیڈس سے بھی کر دیا جس نے حسب عادت "وے ناوا ....." کہہ کر موضوع بدل دیا۔ شائد مجھے مرسیڈس کو دیکھنے کی عادت ہوگئی تھی، کیونکہ اب مجھے اس کی کوتاہ قامتی کا احساس تک نہیں ہوتا تھا بلکہ آج تو وہ خصوصاً اُن تمام خصوصیات کا مرقع نظر آرہی تھی جو الخطیب نے "اخبارِ غرناطہ" میں اس زمانے کی بیگماتِ غرناطہ سے موسوم کی ہیں۔ وہ کہتا ہے "یہاں کی بیگمات کا حُسن شہرۂ آفاق ہے۔ وہ نازک اندام، گیسو دراز، دُر دنداں، عنبر فشاں، سُبک رفتار، خوش گفتار اور نیک کردار ہوتی ہیں۔ اور شاذ و نادر ہی ان کا قد دراز ہوتا ہے۔ اب ان کے زیب و زینت کی بو قلمونی انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ رنگین پوشاک، زرّیں ملبوسات اور اقسام کے زیورات کی نمائش اور مقابلہ کی حد ختم ہو چکی ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ انھیں زمانے کی نظرِ بد سے محفوظ رکھے۔" حالانکہ اگر بیگمات مندرجہ بالا تمام خصوصیات کی حامل ہوں تو انھیں زمانے کی نظرِ بد سے محفوظ رکھنا خاصا دشوار امر ہوگا۔

بلا زانو دا سے نکلتے ہی ایک دیوار سامنے آتی ہے۔ نیچے جھانکیے تو زیر زمین بہتا ہوا حدرہ ایک محراب نما غار میں سے جبل سبیقہ کے قدموں میں پہلی مرتبہ سورج کی روشنی میں نکلتا ہے۔ بائیں ہاتھ ایک مُورِش حمام کی عمارت کھڑی ہے اور اس کے سامنے

حدرہ پر دو پُل جبل سبیقہ کے دامن میں واقع قدیم مکانوں تک پہنچتے ہیں۔ کنارے پر غرناطوی خواتین بالکل دیسی طریقے سے کپڑوں کو ڈنڈے سے پیٹ پیٹ کر دھو رہی تھیں۔ ان کے قریب ایک بوڑھا ماتسکی حدرہ کے پانیوں پر جھکا اپنا مشکیزہ بھر رہا تھا۔ حدرہ کے دوسرے کنارے سے جبل سبیقہ ایک سکائی سکریپر کی طرح اُٹھتی ہے۔ یہاں تک کہ القصبہ اور الحمرا کی عمارتیں اس کی راہ میں حائل ہو جاتی ہیں۔ سرخ دیواروں میں زندان جھروکے اور روزنیے چشمِ حیرت کی طرح کھلے نظر آتے ہیں۔ جبل سبیقہ کے روبرو ساکرے مانتو یعنی مقدس پہاڑی سر اٹھاتی ہے جس پر خانہ بدوشوں کی غاریں اور البیزن کا محلہ واقع ہیں۔ البیزن قدیم غرناطہ کا دل کہلاتا تھا۔ شہر بازا جب عیسائیوں کے ہاتھوں تباہ ہوا تو اس کے باشندے غرناطہ کے اس حصے میں آ بسے اور آبائی شہر کی نسبت اسے البازین یعنی چھوٹا بازا کہا۔ الخطیب اسے شاہینوں کا مسکن کہتا ہے۔ البازین........ جہاں بازوں کے گھونسلے ہیں۔

مرسڈس اور میں ڈیل جاہنبر کی سڑک پر مڑ گئے جو خانہ بدوشوں کی غاروں اور البیزن تک پہنچتی ہے۔ ناتراشیدہ پتھروں کی راہ گذر پر سوائے چند ایک خچر سواروں کے جو بڑی بڑی صراحیوں میں حدرہ سے پانی بھر کر لا رہے تھے، ٹریفک نام کو نہ تھی۔ ایک چھوٹا سا لڑکا جو تازہ قلعی شدہ کو تلے سے جدید مصوری کی مشق میں مشغول تھا خچروں کو دیکھتے ہی بھاگ کر سڑک پر آیا اور چھڑی سے خچروں کو "اولے اولے" کہہ کر شتکارنے لگا.... خچر سوار بوڑھے ماتسکی نے جب اونگھتے ہوئے رفتار میں قدرے تیزی محسوس کی تو اس نے مڑ کر بچے کی ماں کی شان میں کچھ دیدہ زیب الفاظ کہے۔ جس پر وہ دانت نکالتا ہوا واپس چلا گیا اور دیوار پر بنے شاہکار کو آخری شکل دینے لگا۔ سڑک کے دونوں اطراف متعدد ہسپانوی کرسیوں پر یا دروازوں کی چوکھٹ میں بیٹھے ڈھلتی دھوپ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ دنیا میں کوئی طبقہ ایسا نہیں جو کچھ نہ کرنے اور کچھ نہ کر کے جینے کا ڈھنگ ہسپانیہ کے غریب طبقے سے بہتر جانتا ہو۔ یہ بھی درست ہے کہ ایک ہسپانوی کو گرمیوں میں سایہ اور سردیوں میں

دھوپ اور اس کے علاوہ تھوڑی سی ڈبل روٹی۔ چند قطرے شراب کے، ایک پیاز، ایک پرانا فرغل اور ایک گِٹار دے دیجیے۔ اس کے بعد اسے کوئی غرض نہیں کہ دنیا کدھر جا رہی ہے۔

ایک کوٹھڑی نما گھر کے دروازے میں آٹھ نو سال کی ایک خانہ بدوش لڑکی روایتی لباس میں ملبوس کولہوں پر ہاتھ رکھے بڑی دلچسپی سے ہماری جانب دیکھ رہی تھی۔ مرسیڈس نے مسکرا کر کاستنزات بجائے تو وہ لپک کر میرے راستے میں آ کھڑی ہوئی۔ اس نے بولیرو رقص کے انداز میں ایک ہاتھ کولھے پر رکھا، دوسرا فضا میں لہرا کر چہرے پر بڑی بوڑھیوں ایسی سنجیدگی طاری کر کے بولی:

"فوتو سینیور!"

میں نے صرف اس کا دل رکھنے کی خاطر کیمرے میں آنکھ لگا کر ایک تصویر اُتار لی۔ آگے بڑھنے کو تھا کہ اس بچّی نے پیچھے سے میرے کیمرے کا سٹریپ پکڑ کر اس زور سے جھنجھوڑا کہ میں گرتے گرتے بچا۔

"کیا ہے؟" میں نے جھنجلا کر پوچھا۔

"فوٹو کے بیس پیسیتے......." اس نے آنکھیں نکال کر جواب دیا۔

خانہ بدوش چھوٹے بڑوں کو شاید بیس کے علاوہ اور کوئی ہندسہ یاد نہ تھا۔ الحمرا کے باہر بڑھیا نے بھی بیس پیسیتے مانگے تھے۔ اور یہاں بھی بیس کا ہی تقاضا ہو رہا تھا۔

"فوٹو کے بیس پیسیتے....... فوٹو کے......." وہ ناگہانی بلا باقاعدہ چلّانے لگی۔

"بیس پیسیتے دے دو" مرسیڈس نے خوفزدہ ہو کر جلدی سے کہا۔ "ورنہ ابھی اس کے ماں باپ جو کواڑ کے پیچھے کھڑے ہیں یہاں آ کر ہنگامہ کر دیں گے۔"

وہ درست کہتی تھی متعدد دروازوں میں سے کالی سیاہ آنکھیں گھور رہی تھیں میں نے مطلوبہ رقم اُس کا یاں جیسی کی بچّی کی ہتھیلی پر رکھی اور سوچا۔ اگر آٹھ برس کی ہی

اتنی خونخوار ہے تو اٹھارھویں برس تک پہنچتے پہنچتے کیا حشر کرے گی۔

ڈیل چاپنر کے اختتام پر بائیں ہاتھ کچی دیوار میں ایک دروازہ خانہ بدوشوں کے غاروں کی جانب کھلتا تھا۔ میں اندر جانے لگا تو مرسیڈیس نے کاسترنات بجا دیئے "میں نے تمھیں بتایا بھی تھا کہ تمھارے بھائی بند اس وقت سو رہے ہوں گے...... البیسن کا راستہ دوسری طرف ہے......"

"ایک نظر ویسے ہی دیکھ لینے میں کیا حرج ہے ؟"

"ہاں کیا حرج ہے" اس نے لاپروائی سے سر جھٹکا۔

چاک کی سفید پہاڑیوں میں ناگ پھنی اور خاردار جھاڑیوں کی اوٹ میں خانہ بدوشوں کے درجنوں غار دکھائی دے رہے تھے۔ سڑک پر کھلتے ان غاروں کے آگے مختصر باغیچے تھے جن میں رنگ برنگے گملے اور پیتل کے برتن سجے تھے۔ سفید دیواروں سے بُگن ولیا کی بیلیں لٹک رہی تھیں۔ غاروں کے دہانوں پر خوشنما آہنی دروازے تھے جن پر موٹی موٹی میخیں جڑی ہوئی تھیں۔ سڑک سے بلند غاروں تک کھدی ہوئی دیدہ زیب سیڑھیاں جا رہی تھیں۔ پوری پہاڑی پر اُگے ناگ پھنی کے پودوں پر خانہ بدوشوں کے رنگا رنگ لباس سُوکھ رہے تھے۔ لیکن خانہ بدوشوں کے یہ مکن صرف کہنے کو غار تھے ورنہ ان کی سجاوٹ اور خوبصورتی غرناطہ کے عام گھروں کی نسبت کہیں بہتر تھی اور ان کے ستھرے ذوق کا پتہ دیتی تھی۔ پہاڑی میں نصب چند ایئر کنڈیشنر پوشیدہ غاروں میں خوابیدہ بے چارے خانہ بدوشوں کی غربت کے مظاہر تھے۔

غرناطہ کے یہ رنگین باسی پچھلے چار سو برسوں سے ان غاروں میں رہائش پذیر ہیں۔ اس سے پیشتر یہاں عربوں کا ایک محلہ تھا۔ ۱۵۶۹ء میں بغاوت کی پاداش میں ان کا قتلِ عام ہُوا اور ان کے گھروں کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ آگ اور دھواں ختم ہُوا تو ان سوختہ کھنڈروں میں خانہ بدوشوں نے ڈیرے ڈال دیے۔ اب یہ پانچ سو افراد حکومت کے حفاظتی قانون کی چھاؤں میں جوانی میں ناچتے ہیں اور سیاحوں کو

لوٹتے ہیں اور بڑھاپے میں الحمرا کے باہر بھیک مانگتے ہیں اور اُنہی سیّاحوں کی آل اولاد کی جیبیں ٹٹولتے ہیں۔

یورپ کے تقریباً تمام ملکوں میں بالخصوص مشرقی یورپ میں خانہ بدوشوں کی ایک بڑی تعداد حرکت میں رہتی ہے۔ ان کا پڑاؤ عموماً آبادی سے باہر سنسان جگہوں پر ہوتا ہے۔ عورتیں کرسٹل کے گولوں میں جھانک کر قسمت کا حال بتاتی ہیں، اور روزی کماتی ہیں۔ مرد گھوڑوں کی خرید و فروخت میں اتنے ماہر ہوتے ہیں کہ ہسپانیہ میں کوئی دہقان کسی خانہ بدوش سے مشورہ کیے بغیر گھوڑا خریدنے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔ جیب تراشی، بچّے اغوا کرنا اور عصمت فروشی صرف سائڈ بزنس کے طور پر اختیار کرتے ہیں۔ خانہ بدوش یورپی نسل سے تعلق نہیں رکھتے۔ اُن کا اصل وطن کونسا ہے؟ اس کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔ مگر ان کا مشرقی ہونا مسلّم ہے۔ سید امیر علی نے "ہسٹری آف سارا سنز" میں لکھا ہے "دریائے دجلہ کے کنارے ہندوستانی قبیلے جاٹ کے افراد جنھیں عرب تاریخ داں ذات لکھتے ہیں، کشتیوں میں سوار ہندوستان سے فرار ہو کر پہنچے۔ ان کی تعداد ستر ہزار کے قریب تھی۔ ان کی عورتوں کے لباس اتنے دیدہ زیب تھے کہ انھیں سپاہیوں نے گرفتار کرکے خلیفہ معتصم کے دربار میں پیش کر دیا۔ بعد ازاں معتصم کے حکم پر انھیں کلیسیا میں آباد کیا گیا۔ چند سالوں کے بعد یونانیوں کے آئے دن کے حملوں سے ہراساں ہو کر یہ ہندوستانی یورپ کے مختلف حصّوں میں پھیل گئے" اس تاریخی حوالے کو اگر درست مان لیا جائے تو یہ اپنے ہی بھائی بند ٹھہرتے ہیں۔ یعنی گجرات کے نہ سہی غرناطہ کے..... جاٹ! یوں اس بات کا قوی امکان تھا کہ کل کلاں کوئی خانہ بدوش گنار بجاتے بجاتے مجھ سے بغل گیر ہو کر اپنا تعارف کروا دیتا۔ "مستنصر تارڑ آپ سے مل کر بے حد مسرت ہوئی۔ بندے کو گرگجو تارڑ کہتے ہیں" اور اس طرح مرسیڈس بھی مجھے فلیمنکو کہنے میں حق بجانب ٹھہرتی تھی۔ ایک غار کے آگے ایک بوڑھی خانہ بدوش تانبے کے طرح طرح کے برتنوں کا ڈھیر لگائے انھیں دھونے میں مصروف تھی۔ پانی ڈھلوان سے بہہ کر پوری

سڑک پر پھیل رہا تھا۔ میں نے بے حد احتیاط سے اس کی توجہ مبذول کیے بغیر دُور سے ہی ایک تصویر اتار لی...... اس لیے کہ اگر آٹھ برس کی جپسی نے ایک تصویر کے پیسے دھروائے تھے تو اسّی برس کی خانہ بدوش تو معاوضے کے طور پر میری جیبیں اُلٹوا لیتی۔ ویسے مرسیڈس درست کہتی تھی، سوائے اِس بوڑھی جپسی کے سڑک بالکل سنسان تھی اور تمام غار بند پڑے تھے۔

پہاڑ کے سفید چونے میں جڑی ایک آہنی پھولوں سے مزّین کھڑکی میں سے گٹار اور دف کی ہلکی ہلکی آواز باہر آرہی تھی۔ خوامخواہ اندر جھانکنے کو جی چاہا۔ پیتل کے برتنوں سے سجے کمرے میں ایک خانہ بدوش ہاتھ میں دف لئے چیتھڑوں میں ملبوس محوِ رقص تھی۔ فرش پر ایک تیرہ چودہ سالہ بچہ نہایت مہارت سے گٹار بجا رہا تھا۔ سلاخوں کے پیچھے میرا چہرہ دیکھ کر وہ رک گئی۔

"ہے لا تورستا......" اس نے دف پر ایک دھپ جما کر شور مچا دیا۔

میں ہراساں ہو کر فوراً پیچھے ہٹا اور مرسیڈس کے قریب آگیا جو سڑک کی دیوار پر کہنیاں ٹکائے الحمرا کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"ہے لا تورستا......" اس نے کھڑکی کی سلاخوں میں سے دف نکال کر پھر مجھے پکارا۔

"تمہیں منع بھی کیا تھا کہ یہاں یوں تانک جھانک نہیں کیا کرتے......" مرسیڈس دفاعی انداز میں میرا بازو تھام کر کھڑکی میں ہنستی خانہ بدوش کو دیکھتے ہوئے غصّے سے بولی۔ سانولے چہرے میں سفید دانت سرِ شام چھوٹتی مہتابی کی طرح چمک رہے تھے۔

"ہے لا تورستا......" خانہ بدوش نے بدستور دف لہراتے ہوئے کہا "سُو تیس اس کو جر لا مو مبا......"

مرسیڈس اِس فقرے پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ "کہہ رہی ہے تمہارا رنگ بھی میرے جیسا ہے...... اندر آجاؤ!"

"چلا جاؤں......" میں نے پوچھا۔

"ہاں چلے جاؤ......" وہ تنک کر بولی "...... اور میں واپس ہوسٹل چلی جاتی ہوں۔"

"رشتہ داری کا معاملہ تھا بہرحال........" میں زیرِلب بڑبڑایا اور ہم آگے چلنے لگے۔ ابھی صرف پانچ بجے تھے اور بقول مرسیڈس زامبرا کا ہنگامہ نو بجے شب کے بعد شروع ہوتا تھا اس لیے ہم نے بقیہ وقت البیبن کے گلی کوچوں کی آوارہ گردی میں گزارا۔ چند گلیاں تو اتنی تنگ تھیں کہ آمنے سامنے رہنے والے کھڑکیوں میں کھڑے ہو کر باآسانی مصافحہ کر سکتے تھے۔ بالکل لاہور کی طرح جہاں اندرون شہر خواتین بڑے اطمینان سے گلی کے آرپار بچوں کا لین دین کرتی ہیں۔ قدیم غرناطہ کی گلیوں کو یوں تعمیر کرنا ایک حفاظتی اقدام بھی تھا........ اتنی تنگ گلی میں دشمن کے نیزہ بردار سپاہیوں کا گذرنا ناممکن تھا۔

ایک بازار میں سے گذر ہوا۔ فٹ پاتھ پر ایک خوش لباس نوجوان دیوار کے ساتھ اوندھا پڑا تھا۔ راہگیروں میں سے کوئی بھی متوجہ نہ ہوتا۔

"یہ نوجوان بیمار ہے کیا؟" مجھے تشویش ہوئی۔

"بیمارِ عشق ہے" مرسیڈس نے اطلاع دی "اسے "گیٹراس" یعنی بلّی کے سوراخ والا عشق ہو گیا ہے........ پرانے مکانوں کی دیواروں میں بلیوں کی آمد و رفت کے لیے سڑک کی جانب ایک سوراخ چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اگر کوئی خوبصورت دوشیزہ اس مکان میں رہتی ہو تو پھر ہر نوجوان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اس سوراخ میں سے ڈسا جائے، چنانچہ طالبِ محبت سوراخ کے ساتھ منہ لگا کر فٹ پاتھ پر اوندھا لیٹ جاتا ہے اور اظہارِ عشق شروع کر دیتا ہے۔ اگر وہ دوشیزہ کو نوجوان پسند ہو تو وہ بھی دوسری طرف کمرے میں لیٹ کر دل کے افسانے سوراخ کی زبان سے کہنے لگتی ہے......"

"اور اگر دوشیزہ کو نوجوان ناپسند ہو تو؟"

"تو سوراخ میں بلّی چھوڑ دی جاتی ہے۔"

"تمہیں دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ اشبیلیہ میں تمہارے گھر کی دیوار میں درجنوں سوراخ ہوں گے۔"

"دے ناوا" اُس نے سر جھٹکا "وہاں بالکونی کے نیچے کھڑے ہو کر اظہارِ عشق کیا جاتا ہے۔"

البسین بقیہ شہر کی نسبت انتہائی پرسکون اور خاموش ہے۔ وہ حصہ جہاں مسلمان امرا کی حویلیاں تھیں اب بھی مُورش عہد میں ڈوبا نظر آتا ہے۔ مجھے متعدد ایسے مکان نظر آئے جن کی چار دیواری پر الحمرا کی فصیل کا دھوکہ ہوتا تھا اور ان کی بالائی منزل بُرجِ قمارش سے مشابہت رکھتی تھی۔ میں نے ایک حویلی کے ماتھے پر "کارمن دے ابن اُمیہ" کے الفاظ عربی میں کندہ دیکھے یعنی ابنِ اُمیہ کی باغوں میں گھری حویلی۔ سلاخوں میں سے ڈھلوان باغیچہ اور اس کے روبرو الحمرا اتنے تواتر سے نظر آتے تھے کہ جیسے ان کے درمیان حدرہ کی وادی سرے سے موجود ہی نہیں۔ دروازے پر ایک پوسٹ بکس کی موجودگی اس خیال کی نفی کر رہی تھی کہ یہ منظر آج سے پانچسو برس پیشتر ساکت ہو گیا تھا۔

سرِ شام ہم علی عطار چوک کے نزدیک ایک قہوہ خانے میں گئے۔ غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب مالک نے دیوار کے ساتھ ایک پردہ اُٹھا کر مرسیڈس کو زنان خانے میں داخل کر دیا اور مجھے پردے کے قریب مردانے میں بٹھا دیا۔ معلوم ہُوا کہ البسین کے چند قہوہ خانوں میں ابھی تک مُورش رواج کے مطابق خواتین کو علیحدہ بٹھا دیا جاتا ہے۔ مرسیڈس شاید پہلی مرتبہ اس قسم کے باپردہ قہوہ خانے میں آئی تھی چنانچہ وہ سارا وقت پردے کے پیچھے کا سنترانت بجا بجا کر اس جُدائی پر احتجاج کرتی رہی۔ گفتگو اس قسم کی ہوئی۔

"مُور بے حد ظالم تھے جو یوں عورتوں کو چھپا کر رکھتے تھے......"

"اور عیسائی اُن سے بھی بڑھ چڑھ کر کہ قہوہ خانے کے مالک نے مجھے پردے کے پیچھے بیٹھی ہوئی ہسپانوی لڑکیوں سے چھپا رکھا ہے۔"

"اِدھر جس قسم کی لڑکیاں براجمان ہیں اُنھیں دیکھ لو تو اگلے دو روز تک سو نہ سکو۔ سب سے کم سِن ساٹھ برس کی ہے......"

"آج تمھارے لباس میں سے کلوروفارم کی بُو نہیں آرہی۔ کیا میں اُمید کر سکتا ہوں کہ اس طرح مجھے آج شب قریب آنے کی دعوت دی جا رہی ہے؟"

"زیادہ قریب نہیں کیونکہ ایمرجنسی کے لیے میری جیب میں کلوروفارم کی پوری بوتل موجود ہے ......"

"کیا کر رہے ہو؟"

"تمہاری دی ہوئی گڑیا کا سکرٹ درست کر رہا ہوں .... بھئی یہ تو گندا ہے!"

خاموشی!

رات نو بجے جب ہم سیکرے مانتو کی مقدس پہاڑی کے دامن میں پہنچے تو خانہ بدوشوں کی غاروں میں اُن تمام چیزوں کی بہتات تھی جن کا تقدس سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ رقصِ زامبرا دبولیرو۔ موسیقیٔ گٹار و دف اور شراب انگور و جو۔ ماحول کسی دیسی بازارِ حسن کا سا تھا۔ تماشائی ہر غار میں جھانک کر اشیائے صرف کی کوالٹی کا اندازہ لگا رہے ہیں۔ سازندے غار کے دہانے میں کھڑے ہو کر گٹاریں بجا رہے ہیں اور باقی جی کڑے کیے پر ہاتھ رکھے گاہکوں کے انتظار میں جمائیاں لے رہی ہیں۔ گاہک ہسپانوی ہو تو زبانی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی اور اگر لا تورستا یعنی کوئی سیاح قریب سے بھی گزرے تو اُسے سازندے دبوچ کر اندر لے جا رہے ہیں۔ دروازہ بند کیا اور ہلا گلا شروع کر دیا۔ وہ غریب لاکھ منتیں کرے کہ میں تو قرطبہ سان کرسٹوبل کلیسا میں رات کی عبادت کے لیے جا رہا تھا مگر اُسے پانچ منٹ میں بھگتا کر دام کھرے کر لیے جاتے۔ میرا بھی یہی حشر ہوتا اگر مرسیڈس بطور باڈی گارڈ میرا دفاع نہ کرتی۔ قدم قدم پر ایجنٹ حضرات راستہ روکے کھڑے تھے۔

"تین خانہ بدوشوں کا زامبرا...... پچاس پسیتے ..... شراب کا گلاس مفت! کلاسیکی بولیرو غیر کلاسیکی انداز میں .... ساٹھ پسیتے! ہماری غار میں جیب کٹنے کا امکان نہیں۔"

وہ راستہ جہاں آج دوپہر بھوت ناچ رہے تھے اب تماشائیوں سے ٹھسا پڑا تھا اور بھوت خانہ بدوش لڑکیوں کے روپ میں غاروں کے اندر ناچ رہے تھے کھلے

دہانوں میں سے موسیقی اور تالیوں کی بوچھاڑ ایک سیلاب کی صورت بہہ رہی تھی۔ اپنے بزرگ قاضی ولی محمد غرناطہ آئیں اور یہ تماشۂ رنگ و بُو نہ دیکھیں۔ بڑے میاں مذہبی ضرور تھے مگر سینے میں دلِ جوان رکھتے تھے۔ چنانچہ ان گلیوں میں بھی آئے۔ لکھتے ہیں "جنوبی اسپین میں ایک مضبوط و توانا و تندرست خانہ بدوش قوم جپسی نامی اکثر دیکھنے میں آتی ہے۔ معمولی دستکاری، رقص و سرود اور عصمت فروشی سے گذر اوقات کرتی ہے۔ غرناطہ میں یہ لوگ پہاڑ پر بکثرت آباد ہیں۔ گائیڈ ناچ دکھانے کے لیے ترغیب دیتے ہیں، لیکن ہمیشہ ہوٹل کے ذریعے انتظام کرنا چاہیے۔ اگر پانچ چار مسافروں نے مل کر انتظام کیا تو پانچ چھ حصّہ رسدی میں پڑیں اور تماشہ اطمینان سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ورنہ تنہا جانے میں یا انجان رہبر کی رہبری میں ہمیشہ کھٹکا لگا رہتا ہے۔"

شور و غوغا اور گہما گہمی سے دور خانہ بدوشوں کی آبادی کے خاتمہ پر سڑک سے ہٹ کر ایک آہنی دروازہ نصب تھا۔ دروازے میں سے پتھریلی سیڑھیوں کا سلسلہ پہاڑی کے وسط میں واقع ایک غار تک جا رہا تھا۔ ہم اُوپر پہنچے تو دو سرو کے درمیان لالٹین کی ناکافی روشنی کے تلے "ماریا دے زامبرا" کا بورڈ جھول رہا تھا۔ تاریکی میں سے سگرٹ کا ایک روشن دائرہ مدھم پڑھتا یکدم سُلگتا ہوا جانب بڑھا اور پھر اس کے پیچھے چلتا ہوا ایک کڑیل خانہ بدوش ظاہر ہوا۔

"سینیور! سینیوریتا!" اس نے پہاڑی میں پنہاں غار کا دروازہ کھول دیا......

اندر ماریا زامبرا ناچ رہی تھی! خانہ بدوشوں کا والہانہ جذبات سے بھرپور رقص۔ یہ ایک نیچی چھت کا تاریکی اور روشنی کے درمیان جھلملاتا کمرہ تھا۔ کونوں میں موم بتیاں روشن تھیں۔ چھت کے دبیز شہتیروں سے تانبے کے برتن، گٹاریں اور کپڑے کے بنے ہوئے پھول لٹک رہے تھے۔ در و دیواریں غار کا تاثر قائم رکھنے کے لیے نیم تراشیدہ ہی چھوڑ دی گئی تھیں۔ چاک کی بھربھری مٹی میں تیل سے جلنے والی دو لالٹینیں نصب تھیں۔ ایک طرف لکڑی کے رانگلے پیڑھے رکھے ہوئے تھے جن پر میخوں اور رکیبوں سے آرائش کی گئی تھی۔ ان پیڑھیوں پر چھ سات ہسپانوی اور

سیّاح دیوانگی کے عالم میں تالیاں پیٹ رہے تھے اور ماریا زامبرا ناچ رہی تھی۔ رقص ختم ہُوا تو ماریا ایک کوبرے کی طرح فرش پر پھسلتی ہوئی آئی اور ہمارے قریب بیٹھ گئی، نہ صرف کاروباری نکتہ نظر سے مفید ہے بلکہ ایک خانہ بدوش لڑکی کے لیے قابلِ تعریف ،اگراس کی حرکات اُٹھنے بیٹھنے کے انداز اور شکل وصورت سے شہوت ٹپکتی ہو۔ ماریا ایک قابلِ تعریف لڑکی تھی۔

"اس سے پوچھو کیا یہ وہی ماریا ہے جس کی والدہ محترمہ الحمرا کے باہر سیّاحوں کو عائیں دیتی ہے اور بھیک مانگتی ہے۔"

مرسیڈس نے میرا سوال ایک واضح طنز میں لپیٹ کر ہسپانوی میں دُہرا دیا۔

"آئی سپیک انگلِش........" ماریا نے لپ سٹک سے سیراب ہونٹ سکیڑے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "ماما کا دماغ چل گیا ہے۔ میں نے بہت مرتبہ سمجھایا ہے مقدّس مریم کی برکت سے اس مقدّس پہاڑی نے مجھے بہت کچھ دیا ہے تم بھیک مانگنا چھوڑ دو۔ مگر وہ کہتی ہے مجھے کسی پر بار بننا گوارا نہیں........ مصیبت یہ ہے کہ ہرا یرے غیرے کو بتا دیتی ہے کہ میں اُس کی بیٹی ہوں۔"

"ہرا یرے غیرے کو؟" میں نے جھینپ کر کہا اور مرسیڈس مسکرا دی۔

"ہاں اور کیا......" وہ میرے کندھے پر لطیف سا بوجھ ڈال کر اپنا "قابلِ تعریف" چہرہ میرے قریب لے آئی "ویسے تم تو ہیرا سیوس ہو!"

ماریا ضرورت سے زیادہ مہربان ہو رہی تھی۔ یعنی کم از کم مرسیڈس کی موجودگی میں، ورنہ ان معاملوں میں تو زیادتی ہی بھلی لگتی ہے۔

"اب رقص نہیں ہوگا کیا؟"

"ہوگا...... لیکن کمرہ تو بھر لینے دو۔ ورنہ تم دونوں کے سو پیسے سے تو موم بتیوں کا خرچ بھی پورا نہیں ہوگا۔"

یعنی شو صرف ہاؤس فُل ہونے کی صورت میں ہی شروع کیا جاتا تھا۔

"کلنتو......" ماریا نے سازندوں کے قریب کھڑے جپسی کو پکارا "وینو......"

کلنتو کلانچیں بھرتا ہُوا پچھلے کمرے میں گیا اور وِینو کے تین مگ لاکر ہمارے سامنے تپائی پر رکھ دیے۔

"تم سے باتیں ہوں گی...... ماریا نے مرسیڈس کو مکمل طور پر نظرانداز کرتے ہوئے آنکھ دبائی اور اُٹھ کھڑی ہوئی "اگلے رقص کے لیے لباس تبدیل کر آؤں۔"

ماریا کے جاتے ہی مرسیڈس نے پہلے سر درد کی شکایت کی پھر کمرے میں دھوئیں پر ناک بھوں چڑھائی اور بالآخر الٹی میٹم دے دیا "میری رگوں میں ہسپانوی خون دَوڑ رہا ہے...... یہ دو ٹکے کی خانہ بدوش کون ہوتی ہے۔ تمہارے ساتھ یوں کُھلم کُھلا فلرٹ کرنے والی...... بھکارن کی بچّی۔"

"دے نادا" میں نے مرسیڈس کے انداز میں سر جھٹکا اور مگ اُٹھا کر اُس کے سامنے رکھ دیا "بالکل نہیں ہوتی...... لو یہ تھوڑی سی وِینو پی لو سر درد غائب ہو جائے گا۔"

آہستہ آہستہ کمرہ بھرنے لگا۔ مقررہ نشستیں پُر ہونے پر گِٹار نواز نے تاروں کو ایک نہایت ازرانہ میں چھیڑا۔ جُونہی اس نے تاروں سے اُنگلیاں ہٹائیں۔ ماریا ہال تھا فرش پر تیرتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ ناخنوں پر نیلی پالش کے علاوہ وہ سر تا پیر سُرخی لپٹی ہوئی تھی خانہ بدوشوں کی اصطلاح کے مطابق وہ صرف قابلِ تعریف ہی نہیں بلکہ جسم کے رونئیں رونئیں سے پھوٹتی شہوت کی بنا پر ناقابلِ تعریف!

وہ تماشائیوں کے درمیان بے حس و حرکت کھڑی ہے ایک سرو کی طرح اُس کا لمبا لباس پیروں کو ڈھانپے ہوئے اس کے گرد فرش پر بکھرا پڑا ہے۔ ساز ند سازوں کو چھیڑ کر سُر درست کر رہے ہیں۔ کچھ لوگ گنگنا رہے ہیں۔ چند ایک آہستہ آہستہ تالیاں پیٹ رہے ہیں۔ کلنتو نے جواب، نک ویٹر کے فرائض انجام دے رہا تھا سازندوں کے قریب کھڑے ہو کر ایک لمبی تان لگائی۔

"الیینا دسیلویس دے می متر نتے..."

"یہ حضرت کیا کہہ رہے ہیں؟" میں نے مرسیڈس کے کان میں سرگوشی کی۔

"فلیمنکو ہو کر نہیں معلوم ......" وہ ہنس دی "یہ خانہ بدوشوں کا ایک قدیم گیت ہے۔
اور موت کے بارے میں...... میں ساتھ ساتھ ترجمہ کرتی جاؤں گی"

"یہاں تک کہ
موت کے بازؤں میں جانے کے بعد بھی
میں تمہاری چاہت میں گرفتار رہوں گی"

پہلے وہ وہاں کھڑی ہے ایک ایسے پھول کی مانند جو سورج کی شدت سے نیم خوابیدہ محسوس کر رہا ہے۔ فضا میں اُٹھے ہوتے سپید بازو تالاب میں تیرتے کنول لمبے ڈنٹھل کی مانند ہیں۔ ایکدم کاسترنات کی ٹک ٹکا ٹک غار نما کمرے میں گونجتی ہے۔ ماریا کانپتی ہے۔ اُس کے دل کے نہاں خانوں میں ایک بھرپور جذبہ ہے جس کی اُسے کھلنے میں مدد دے گی۔ پورا بدن ایک انجانی لذت سے بے قابو ہو کر تھرتھرا ۔ جذبات کی بھرپور لہریں اس کے اندر طلاطم برپا کر رہی ہیں...... اب وہ اُس ب کی مانند ہے جس نے طلوع آفتاب پر اپنی نازک پتیوں پر بکھری شبنم کو جھٹک کر آپ کو آزاد کر لیا ہے۔ اُس کا سر کندھوں پر جھکا ہے اور وہ جاگ رہی ہے۔ سترنات کی رس بھری آواز نے نیند کا طلسم توڑ دیا ہے۔ اس کے ہونٹ دھیرے ے وا ہو رہے ہیں جیسے وہ کسی غیر مرئی محبوب کے بوسے کا انتظار کر رہی ہے۔

"ہم مر کر بھی ایک دوسرے کو پیار کریں گے۔
کیونکہ میں تم سے محبت کرتی ہوں
اور روح کبھی نہیں مرتی ..."

گٹار کی دھڑکن پر۔ تالیوں کی تال پر۔ کاسترنات کی دھن پر...... ایک ایسا ںص جس میں خوشی کا پہلو اتنا نمایاں نہیں۔ جیسے یہ رقص مسکراہٹوں کی بجائے آنسوؤں ڈھلنے کا آرزومند ہے۔ ایک ایسا ناچ جس میں ہاں کمر وار سر، بازو اور انگلیاں ادا کر رہی ہیں۔ پاؤں کم ہی حرکت میں آتے ہیں۔

"موت کے بعد
میں نے عرش کی بلندیاں طے کیں اور فریاد کی

"میں اس سے محبت کرتی ہوں"
خدا نے کہا "اُسے بھول جاؤ"

میں نے جواب دیا

"یہ میرے بس کی بات نہیں کہ تب میں سچ مچ مر جاؤں گی"
اور اب زندگی نے اُسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا ہے اور کسی انجانی قوت نے اس کا سر پیچھے کو جھکا دیا

وہ محبوب کو اپنے اُوپر جھکا دیکھتی ہے اور اپنے لٹکے ہوئے بازو سمیٹ کر اسے اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔ ہونٹ۔ اس کے ہونٹ غیر مرئی بوسے کی لذت سے دَب جاتے ہیں، پس جاتے ہیں۔ ساکن قدموں پر گھٹنے جھکائے بغیر وہ اپنا جسم گھما کر محبوب کے لمس کا پیچھا کر رہی ہے۔ پہلے پہل وہ نہایت سنجیدگی سے رقص کرتی ہے، اپنے بازوؤں میں اجنبی کو لپیٹتے ہوئے۔ اس کی جانب جھکتے ہوئے۔ اُسے پا لینے کی خا... اس میں تڑپ بھی ہے، پیاس اور شدت بھی اور آہ بھی۔ بے چین ایسے کہ اُس کی رُوح پنجرے میں پھڑپھڑا رہی ہے۔ باہر نکلنا چاہتی ہے۔ اُس کا سانس اور سینے کا زیر و بم تیز سے تیز تر ہو رہا ہے۔ وہ آنکھیں بند کرنے سے قاصر ہے اور اُس کا منہ کھلا ہے۔ انتظار کی کیفیت۔ بوجھل جیسے یہ سُرخ گلاب گرنے کو ہے...... اور یکلخت وہ اپنے پورے جسم کو جھنجھوڑ کر اس خوابیدہ سحر سے آزاد ہو جاتی ہے۔ اب اس کی ہر حرکت، ہر جنبش سے مسرّت و اطمینان کے چشمے اُبل رہے ہیں۔ آزادی کی لذّت سے ہمکنار ہوتے ہی اس کے منہ سے ہلکی ہلکی چیخیں رُکی رُکی آہیں نکلتی ہیں جیسے وہ بچے کی پیدائش کے تکلیف دہ مگر مسرّت آمیز مرحلے میں سے گذر رہی ہے۔ تالیوں کا ہلکا سا شور برپا ہوتا ہے جس میں یہ آہیں اور چیخیں دبنے لگتی ہیں۔

"ایک ایسے شخص کو پیار کرنا جو تمھیں نہ چاہتا ہو

پیار ہے!

ایک ایسے انسان کو چاہنا جو تمھیں بھی چاہتا ہو

صرف کاروبار ہے

اور ایسا تو ہر کوئی کر سکتا ہے"

آہستہ آہستہ وُہ ڈھلنے لگتی ہے۔ اُس کا انگ انگ دُکھ رہا ہے۔ پپوٹے سیسے کی طرح بھاری ہو رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے رو دے گی۔ ابھی گر جائے گی...... وہ ایک دم بالکل ساکت ہو گئی...... خاتمہ! انجام! تالیوں کی گونج! مرسیڈس بھی اپنی سابقہ دشمنی فراموش کر کے تالیاں بجاتے بجاتے بے حال ہو رہی تھی۔

ماریا کی غار سے نکلتے ہی الحمرا کا ایک ایسا ناقابلِ فراموش منظر میری نظروں کے سامنے اُٹھا جس کا تصوّر آج بھی میرے تن بدن میں ایک نامعلوم سنسنی دوڑا دیتا ہے۔ تاریک شب میں، اردگرد پھیلے سناٹوں میں سربلند، روشنی میں نہایا ہوا، ایک طلسمی محل میرے رُوبرو تھا۔ فصیلوں اور بُرجوں میں سے سُرخ روشنی پھوٹ رہی تھی جیسے ایک گلرنگ انارے چھوٹے اور شفق رنگ شرارے تاریکی میں منجمد ہو جائیں۔ در و دیواریوں جھلملا رہے تھے جیسے الاحمر ابھی تک شعلوں کی روشنی میں اپنا سُرخ قصر تعمیر کروا رہا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ یہ روشن قصر صرف چند لمحوں کے لیے جبلِ سبیقہ پر اُترا ہے رات گہری ہو گی تو اوجھل ہو جائے گا۔

الحمرا میں ایک رات

شاعر مچادو کے پوشیدہ روتے پانیوں کی بے نام سرسراہٹ ہمارے تلوؤں تلے ہمک رہی تھی۔ الحمرا کے فواروں اور تالابوں میں سے باہر نکلتے والا پانی زیرِ زمین پانیوں میں سنسناتا ہمارے قدموں تلے رواں دواں تھا۔ ایک ہفتہ پیشتر کی اس خوشگوار صبح کی طرح جب پہلی مرتبہ انہی کوچوں میں میرے قدم الحمرا کی جانب اٹھ رہے تھے۔ تمام قدرتی خوبصورتیوں کی طرح ان ابلتی آوازوں کا تاثر بھی انسان کے جذبات کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ ان بہتے پانیوں کے شور میں اس روز مسرت آمیز سرگوشیاں تھیں مگر آج جب کہ میں مرسیڈس کے ہمراہ آخری مرتبہ الحمرا جا رہا تھا ان پانیوں میں رکی رکی سسکیوں کا بہاؤ تھا اور ساتھ یہ آبی موسیقی پہلے روز سے کہیں مدہم سنائی دے رہی تھی۔ شاید میرے کان اس پس منظر کے عادی ہو چکے تھے اس لئے... آج غرناطہ میں میرا آخری دن تھا۔ کل صبح نو بجے مجھے ساحلِ سفید (COSTA BLANCA) پر واقع شہر علی کانت چلے جانا تھا۔

بس کی نشست مخصوص کروانے کے لئے مرسیڈس میرے ہمراہ سٹیشن تک گئی اور اب وہ مجھے الحمرا کے اس برج تک چھوڑنے جا رہی تھی جس کی چھت تلے میں غرناطہ میں آخری شب بسر کرنا چاہتا تھا۔ پانسیان سے چلتے وقت میں سیلپنگ بیگ، رات کے کھانے کے لئے ڈبل روٹی، خشک گوشت اور چند موم بتیاں بھی ساتھ لے آیا تھا۔ فالا کے گھر کے قریب سے گذرے تو مجھے گارسیا لورکا یاد آ گیا۔ خانہ جنگی میں شکست خوردہ جلاوطن بوڑھے کا دوست، ہسپانیہ کا عظیم شاعر لورکا۔

"مرسیڈس! میں الحمرا میں جانے سے پیشتر اس مقام پہ جانا چاہتا تھا جہاں نا شسٹوں نے گارسیا لورکا کو قتل کیا تھا۔"

مرسیڈس کے چہرے کا رنگ اتر گیا۔" یہ جھوٹ ہے کہ اسے فاشسٹوں .... میرا مطلب ہے نیشنلسٹوں نے ہلاک کیا تھا.... وہ ذاتی مخاصمت کی بنا پر مارا گیا تھا...."

" میرے لئے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ اسے کس نے موت کے گھاٹ اتارا تھا' میں تو صرف...."

" نہیں ....." مرسیڈس نے تیزی سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں گہرا خوف تھا" تمہیں غرناطہ میں لورکا کا ذکر نہیں کرنا چاہئے .... لیکن تم کیوں پوچھتے ہو؟"

" میں تو صرف ایک پیغام پہنچانا چاہتا تھا' کہنا تھا اس کا ایک دوست ملنے کے لئے آیا تھا...."

باب العدل کے پاس پہنچے تو پچھلے پہر کا سورج بالائی منزل کی سرخ اینٹوں پر غروب ہو رہا تھا خانہ بدوش بڑھیا جو چارلس کے تعمیر کردہ چشمے کی منڈیر پر پھسکڑا مارے بیٹھی خیرات کے سکوں کو انتہائی انہماک سے گن رہی تھی ہمیں دیکھتے ہی اٹھ بیٹھی۔

"...... خدا کرے تمہارے خوبصورت مکھڑے پر برکت نازل ہو۔"

میں نے اس فقرے کا طے شدہ خراج میں پسیتے فوراً ادا کر دیا۔

"..... اور بیٹی خدا کرے تمہارے درجن بھر بیٹے ہوں .... بیس پسیتے۔" اس نے مرسیڈس کا بازو پکڑ کر دعا دی۔

مرسیڈس نے دس پسیتے کا ایک سکہ اس کی ہتھیلی پہ رکھ دیا" میرے لئے چھ بیٹے کافی ہوں گے۔"

باب الخمر کے قریب پہنچ کر میں نے داخلے کی ٹکٹوں کی کھڑکی میں سے جھانکا تو ٹکٹ فروخت کرنے والا خانہ بدوش بڑھیا کی طرح دن بھر کی آمدن کا حساب کر رہا تھا" الحمرا پندرہ منٹ میں بند ہونے کو ہے اس لئے ٹکٹوں کی فروخت ختم ہو چکی ہے۔"

مرسیڈس نے یہ خبر سن کر اطمینان کا سانس لیا۔ وہ آج دوپہر سے اصرار کر رہی تھی کہ میں برج میں شب بسر کرنے کا ارادہ ترک کر دوں اور اس کی بجائے ہم یہ آخری شام البیسن میں گذاریں۔

" سینیور...." میں نے بے حد بے چارگی سے درخواست کی" غرناطہ میں یہ میرا آخری دن ہے صرف چند تصاویر اتارنا چاہتا ہوں۔ دس منٹ میں باہر آ جاؤں گا۔"

اس نے یوں کندھے اچکائے جیسے کہہ رہا ہو کہ دس منٹ کے لئے اگر ایک سو پسیتے حکومت ہسپانیہ

کے خزانے میں جمع کروانا ہی چاہتے ہو تو تمہاری مرضی اور وہ ٹکٹ میرے حوالے کر دیجئے۔

الحمراء کے محافظ نے بھی ٹکٹ چیک کرتے ہوئے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ انگلی سے ہونٹوں کو کھجایا اور پھر کچھ سوچ کر دیوار میں پوشیدہ دروازہ کھول دیا۔

دیوانِ خاص کے صحن میں سُرخ دیواروں کے درمیان سنگ مرمر کے کٹورے میں سے پانی سرد لاوے کی مانند اُبل رہا تھا۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو سُرخ دیواروں میں کنا نوسو برس قدیم آسمان کا ٹکڑا پھیلتی ہوئی شب میں سرمئی ہو رہا تھا۔ صحنِ حنا میں سے گذرے تو تالاب میں بُرج قمارش کا شفاف عکس دُھندلے سائے میں بدل رہا تھا۔ الحمرا کے محافظ سیٹیاں بجا بجا کر مختلف ایوانوں اور غلام گردشوں میں گھومتے سیاحوں کو خبر کر رہے تھے کہ قصر بند ہونے کو ہے۔ ہم دونوں باہر نکلتے ہوئے سیاحوں کے غول میں سے گذرتے شیروں کے صحن میں آ گئے جہاں جرمن فوٹوگرافر اپنے متعدد لینز اور کیمرے چمڑے کے ایک تھیلے میں رکھ کر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ شیروں کے صحن میں سے نکل کر کھنڈروں کا میدان آیا اور ہم تیز تیز چلتے اس مقام تک پہنچ گئے جہاں سے فصیل دو شاخوں میں بٹ جاتی تھی۔ میں نے نیچے جھانک کر اطمینان کر لیا کہ دونوں شاخوں کو ملانے والا شہتیر بدستور اپنی جگہ پر موجود ہے۔

”مجھے افسوس ہے میں تمہیں اپنے بُرج میں رات گذارنے کی دعوت نہیں دے سکتا، صرف بیڈ کا ہے۔“ میں نے مرسیڈس سے خوراک کا تھیلا لیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

مرسیڈس نے انتہائی سراسیمہ ہو کر شکستہ بُرج کو ایک نظر دیکھا ”اس ویران بُرج میں پوری شب بسر کرو گے؛ ڈر نہیں لگے گا؟“

”بنیادی طور پر میں انتہائی ڈرپوک شخص ہوں۔“ میں نے مرسیڈس کا خنک ہاتھ تھام کر کہا ”سینما کا آخری شو دیکھنے کے بعد گھر لوٹتا ہوں تو تاریک سیڑھیوں کو اندھا دھند بھاگ کر طے کرتا ہوں مبادا کسی کونے میں دبکا کوئی بھوت یا اس قسم کا بھوت پریت مجھے دبوچ نہ لے..... لیکن سفر پہ نکلتے ہی خوف کی یہ حس قصۂ پارینہ بن جاتی ہے۔“

الحمرا کے ایوان خالی ہو چکے تھے۔ باب الجدور کا ٹیلا اور اس کے گرد پھیلے ہوئے کھنڈر ویران ہو چکے تھے۔ کبھی کبھار کسی محافظ کی تیز سیٹی کی آواز ان کھنڈروں پہ تیر جاتی۔ مرسیڈس خاموشی سے بُرج کی جانب دیکھ رہی تھی۔

"تمہارا زکام کیسا ہے؟" میں نے اس کی ناک کو چھوا اور پھر اس کے مختصر سراپے کو اتنے قریب کر لیا کہ میرے سینے پر اس کے سانسوں کا زیر و بم دستک دینے لگا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے چہرہ اٹھا کر اپنی پیرا سیوس آنکھیں جھپکائیں اور اس کی گھنی پلکیں میرے گالوں پر خوفزدہ تتلیوں کی طرح پھڑپھڑانے لگیں۔ سرخ ہونٹوں کی خفیف سی لرزش میرے ہونٹوں میں سرایت کر کے پورے بدن میں الحمرا میں پھوٹتے جھرنوں کی مانند سرسرانے لگی۔ اس کے بدن سے سوکھی زمین پر گرنے والے بارش کے پہلے قطرے ایسی مہک اُٹھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی ہتھیلیاں میرے سینے پر پھیلا دیں اور سرگوشی میں بولی "کاش آج میں اپنے لباس پر کلوروفارم چھڑک کر آتی۔"

آہستہ آہستہ اس کے سُرخ ہونٹوں پر نیلے دھبے ابھرنے لگے جن کی موجودگی کا باعث وہ نیم خنک شام ہرگز نہ تھی جس میں ہم بمشکل سانس لے رہے تھے۔ یکبارگی بے شمار سیٹیوں کی آوازیں ہمارے کانوں میں اتریں۔ الحمرا بند ہوا چاہتا تھا۔

"آدیوس ..."

"دے نادا ..." اس نے سر جھٹکا "آج نہیں۔ میں کل صبح تمہیں بس سٹیشن پر خدا حافظ کہوں گی۔"

"تب تک یہ دھبے پھر سرخ ہو جائیں گے۔" میں نے اس کے ہونٹوں پر ہتھیلی رکھ کر کہا اور سلیپنگ بیگ اٹھا کر فصیل پر چلنے لگا۔ شہتیر کو عبور کر کے میں برج کے دروازے تک آیا اور پھر شگافوں سے بچتا ہوا سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ برج کے اندر پہنچ کر میں نے جھروکے میں سے جھانکا۔ مرسیڈس کھنڈروں کے درمیان آہستہ آہستہ چلتی ہوئی شیروں کے صحن کی جانب بڑھ رہی تھی۔

میری عارضی قیام گاہ اسی حالت شکستگی میں تھی جس میں آج سے پانچ روز قبل چھوڑ گیا تھا۔ چھت سے ٹکے پرندوں کے گھونسلے، فرش پر بکھرا جھروکا اور کونے میں خستہ اینٹوں کا ملبہ۔ میں نے سلیپنگ بیگ کھول کر ایک کونے میں بچھایا اور گھڑی سرہانے رکھ کر سگریٹ سلگا لیا.... ابھی صرف چند بجے تھے اور میں گیارہ بجے سے پیشتر سونے کا عادی نہ تھا۔ برج کا ایک جھروکا اس کھائی کی طرف تھا جسے "لوس الینوس" یعنی پن چکیوں کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ دوسری طرف جنت العریف کے انجیر اور پستے کے سرسبز درخت تھے۔ درمیان میں سے البیسین کے محلے کے چند قدیم مکان دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے جب سگریٹ کا آخری کش لگایا تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ غرناطہ کا قدیم حصہ یوں زرد ہو رہا تھا جیسے ہاتھی دانت کا بنا ہو۔ مغرب کی جانب ویگا کے تیس میل طویل میدان پر سیاہی کی چادر پاؤں پھیلا رہی تھی۔ خانہ بدوشوں کی غاریں اور مورش حویلیوں میں سربلند سرو کے درخت بتدریج تاریکی میں ڈوب رہے تھے۔ جوں جوں تاریکی بڑھتی گئی الحمرا کے غاروں اور کھائی میں بہتے دریائے حدرہ کا شور قریب آتا گیا۔ برج ہفت منزل، برج الحرب اور برج قمارش کے بھاری نقوش اندھیرے میں گم ہو رہے تھے۔ صرف الحمرا میں کام کرنے والے عملے کے رہائشی کوارٹروں میں روشنیاں جل رہی تھیں ورنہ جبل سبیقہ پر کھڑی تمام عمارتیں روپوشی کے عمل میں سے گذر رہی تھیں۔ ایک کوارٹر کی چمنی میں سے دھواں اٹھا تو اس تاریخی ماحول کے باوجود میرے معدے نے گھر کے دودھ کے ناشتے کے بعد سے خالی ہونے پر احتجاج کیا۔ میں نے ایک موم بتی جلائی اور اس کے بے در اور اندھیرے کوئیں چن دیا کہ روشنی کی کوئی کرن ان میں سے پھوٹنے نہ پائے۔ اس خود ساختہ شیڈ میں سے آتی مدھم مدھم روشنی باہر آ رہی تھی کہ مجھے یوں لگا جیسے میں پچیس برس پیشتر اپنے گاؤں کے کچے مکان میں سرسوں کے تیل سے جلتے ہوئے مٹی کے دیئے کی لو پھر سے دیکھ رہا ہوں۔ خشک گوشت اور ڈبل روٹی کا ڈنر نوش کرنے کے بعد احساس ہوا کہ میں خوراک کے ہمراہ کسی قسم کا مشروب لانا بھول گیا ہوں اور میں تو کھانے کے بعد پانی پینے کا اتنا عادی تھا کہ یورپ کے اعلیٰ ہوٹلوں میں طعام کے بعد چپکے سے غسل خانے میں جا کر پانی پی آتا تھا۔ میرا حلق بری طرح سوکھ رہا تھا مگر اس وقت دریائے حدرہ اور الحمرا کے سینکڑوں فواروں اور تالابوں کی موجودگی کے باوجود ان کے پانی کا حصول ایک ناممکن امر تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں نے حسب معمول کپڑے بدلے اور سلیپنگ بیگ میں لیٹ کر اس کی زپ ٹھوڑی تک چڑھا لی۔ میری تمام تر کوششوں کے باوجود موم بتی کی روشنی برج کی چھت کو لرزاں سایوں میں منقسم کر رہی تھی۔ پرندوں کے گھونسلے جھولتے تو روشنی اور سائے حرکت کرنے لگتے۔

اس برج میں لیٹے ہوئے مجھے جاوید نجم کا خیال آ گیا۔ راکھ کے رنگ کے چمکتے سرمئی بالوں والا جاوید نجم جو ان دنوں نیشنل کالج آف آرٹس لاہور میں فلسفہ تعمیر کا استاد ہے۔ اس نے ایک تاریخی حوالہ ثابت کرنے کی خاطر ہسپانیہ کا کونہ کونہ چھان مارا تھا۔ ابن حزم اور ابن خلدون کی تواریخ ہمیں بتاتی ہیں کہ جب کبھی تولیدو کے نواح سے عیسائی افواج آٹھ سو میل دور غرناطہ یا قرطبہ کی جانب پیش قدمی کرتیں

تو عرب سپہ سالاروں کو چھ گھنٹے کے اندر اندر ان کی قوت اور سمت کا علم ہو جاتا تھا۔ چنانچہ اگلے چند گھنٹوں میں اس فوج کے گرد و پیش واقع عرب حصاروں کے سپہ سالاروں کو اسے راستے میں ہی ختم کر دینے کا حکم مل جاتا اور یوں دشمن کو منزلِ مقصود پر پہنچنے سے پیشتر تباہ کر دیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان ہسپانیہ میں لڑی جانے والی بیشتر چھوٹی چھوٹی جھڑپیں تھیں۔ اب جاوید نجم کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اتنے طویل فاصلوں پر چار گھنٹے میں اطلاع کس طرح پہنچائی جاتی تھی جبکہ ایک تیز ترین گھڑسوار بھی یہ فاصلہ کم از کم دس روز میں طے کرے گا۔ چنانچہ اس نے تحقیق شروع کر دی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ان دنوں تولیدو، قرطبہ اور غرناطہ کے درمیان سینکڑوں برجوں کا ایک سلسلہ ہو گا جن پر متعین محافظ دشمن کو دیکھتے ہی دن کے وقت کسی چمکیلی دھات کے ذریعے اور رات کو مشعلوں کو روشن کر کے اگلے برج تک خبر پہنچا دیتے ہوں گے۔ اس طرح مسلمان امیر چند گھنٹوں کے اندر اندر سلطنت کے کسی دور دراز حصے میں حرکت کرتے ہوئے دشمن کی سرکوبی کا بندوبست کر لیتے۔ جاوید نجم نے اپنا نکتہ نظر ثابت کرنے کے لئے تولیدو سے غرناطہ تک کبھی پیدل اور بعض اوقات بیل گاڑیوں پر سفر کیا اور درجنوں ایسے برج دریافت کئے جن کی حفاظتی مقصدیت کا کسی کو علم نہ تھا۔ اسے متعدد ایسے برج ملے جو بالکل درست حالت میں قائم تھے اور اس نے سفر کے دوران میں کئی راتیں ان برجوں میں بسر کیں۔ اروِنگ بھی ان قدیم برجوں کے وجود سے واقف تھا۔ اس کی کہانی "زائرِ محبت" میں ایک ایسے اُلّو کا ذکر ملتا ہے جو غرناطہ اور قرطبہ کے درمیان سفر کرتے ہوئے ان پُرانے برجوں میں بسیرا کیا کرتا تھا۔

ایکدم میری آنکھوں کے عین اوپر روشنی کا ایک تیز گولا چھوٹا اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میرا اوّلین ردِّعمل یہ تھا کہ جلتی ہوئی موم سے بُرج کو آگ لگ گئی ہے۔ مگر یہ ایک بہت بڑی برقی روشنی تھی جو چھت میں گھونسلوں کی اوٹ سے میری آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ 'بُرج القندیل' 'بُرج العظیم' اور 'بُرج الاطفال' ایک ایک کر کے اسی طور روشن ہوئے اور پھر قصرِ الحمرا اور القصبہ کی عمارتیں بھی بقعۂ نور بن گئیں.... مجھے خیال ہی نہ رہا تھا کہ ہر منگل، جمعرات اور ہفتے کو نو بجے سے نصف شب تک الحمرا کے در و دیوار برقی روشنیوں سے منور کئے جاتے ہیں۔ ماریا کی غار سے نکلتے ہی مجھے الحمرا کا یہی رُوپ نظر آیا تھا اور اب میں اُسی کے ایک چکا چوند بُرج میں لیٹا یہ سوچ رہا تھا کہ اگلے تین گھنٹے

اس سرچ لائٹ کی روشن آنکھ میں آنکھیں ڈالے کیسے کیٹیں گے۔ اپنے وجود کو منکشف ہونے سے بچانا بھی ایک مسئلہ تھا۔ سرچ لائٹ کی موجودگی میں مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ایک روشن سٹیج پر کھڑا ہوں اور الحمرا میں داخل ہونے والے پہلے سیاح کی نظر مجھ پر ہی پڑے گی۔ تھوڑی دیر بعد سیاحوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی جو زیادہ تر شیروں کے صحن اور حرم کے حصوں تک محدود رہی۔ اگرچہ کھنڈروں کی جھاڑیوں میں بھی روشنیاں نصب تھیں مگر ادھر کسی سیاح نے رخ کرنے کی زحمت نہ کی.... اور یہ میرے لئے باعثِ اطمینان تھا۔ میں دم سادھے سلیپنگ بیگ میں لیٹا رہا مگر کبھی کبھار سر اٹھا کر شیروں کے صحن کو بھی ایک نظر دیکھ لیتا۔ ملائم روشنی سے منور یہ عمارت کچھ ایسا ناقابلِ یقین اور غیر حقیقی سا تاثر دے رہی تھی جیسے ٹھوس چونے کی بجائے یہ پیچ و خم، یہ نقش و نگار، یہ ملائم ستون سیال دُودھ سے ڈھلے ہیں اور ان کے دُودھیا بدن پہ اگر ایک باریک سی پن بھی چبھ جائے تو پوری عمارت جبلِ سبیقہ سے نیچے بہہ جائے گی۔

ایک طویل وقفے کے بعد جب میں نے اس دُودھیا صحن کو دیکھنے کے لئے سر اٹھایا تو میری نظر ایک متحرک سائے پر ٹھہر گئی جو الحمرا سے نکل کر میرے بُرج کی سمت میں چلا آ رہا تھا۔ غالباً کوئی سیاح تھا جو کسی اشد ضرورت کا بوجھ ہلکا کرنے کی خاطر کوئی تاریک گوشہ تلاش کر رہا تھا۔ اس سے پیشتر کہ میں سر نیچا کرتا اس کی نگاہ بُرج کی طرف اٹھی۔ اس کے چہرے کا رنگ یوں متغیر ہوا جیسے اس نے بھُوت دیکھ لیا ہو اور پھر جانے کونسی زبان میں دہائی دیتا وہ اندھا دھند بھاگ کھڑا ہوا۔ اس سانحے کے بعد میں نے سر اٹھانے کی جرأت نہ کی کیونکہ اس امر کا قوی امکان تھا کہ خوفزدہ سیاح کا بیان سُن کر الحمرا کے محافظ چھان بین کے لئے فوراً ادھر آ نکلیں گے۔ بہر حال خوش قسمتی سے میرا یہ خدشہ درست ثابت نہ ہوا۔ مجھے یقین تھا کہ تھر تھر کانپتے ہوئے سیاح نے محافظوں کو بتایا ہو گا کہ اس نے الحمرا کے ایک شکستہ بُرج میں ایک نیم سیاہ چہرہ دیکھا ہے اور انہوں نے بعد ادب گذارش کی ہو کہ جناب یا تو آپ نشے کی حالت میں ہیں اور یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محافظوں کی بھی سٹی گم ہو گئی ہو اور انہوں نے جان بوجھ کر ادھر کا رُخ نہ کیا ہو۔ مجھے رہ رہ کر اس غریب سیاح کی حالت پر ہنسی آ رہی تھی جسے مرتے دم تک کامل یقین ہو گا کہ اس نے ایک شب الحمرا کے ایک ویران بُرج میں کسی مُور کی رُوح کو منڈلاتے دیکھا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ جس لمحے اس نے میری جانب نگاہ اٹھائی تھی اگر میں اطمینان سے صرف "ہیلو" ہی کہہ دیتا تو وہ

صاحب ضرور ذہنی فوت ہو جاتے۔

پورے بارہ بجے میرے سر پہ چمکتا سرچ لائٹ کا سورج گل ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی بقیہ برجوں در قصر الحمرا میں بھی روشنیاں بجھتی چلی گئیں۔ میں نے اطمینان سے سگریٹ سلگایا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد پانی کی سرسراہٹ ایکدم یوں منقطع ہوئی جیسے کسی نے آواز کا بٹن گھما کر اسے بند کر دیا ہو ۔ ۔ ۔ ۔ دراصل الحمرا اور جنت العریف کے فوارے، جھرنے اور آبشاریں بند کر دی گئی تھیں۔ اب صرف دریا سے حدرہ اور زیر زمین نالیوں میں بہنے والے پانیوں کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ الحمرا کے در و دیوار پر گھمبیر تاریکی ایک سیاہ سیلاب کی صورت میں یوں آئی جیسے وہ اب تک صرف روشنیوں سے خائف ہو کر آسمانوں پہ معلق تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں ایک اتھاہ اندھیرے غار میں لیٹا ہوا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سیرا النزادا کی چوٹیوں سے آتی ہوئی سرد ہوا جو اس سے پیشتر جھونکوں کی صورت رواں تھی لمحہ بہ لمحہ تیز تر ہوتی گئی اور بالآخر الحمرا کے تاریک ایوانوں میں سائیں سائیں کرتی گونجنے لگی۔ میں نے مرسیڈس سے غلط کہا تھا کہ خوف کی جس گھر سے نکلتے ہی تعفن پارینہ بن جاتی ہے۔ ایک ایسی اجاڑ عمارات میں جس کی بنیاد ہی تعفن ہائے پارینہ پر ہے میری یہ حس پوری شدت سے جاگ اٹھی اور خنکی کے باوجود میرے جسم پر پسینے کے قطروں کی لاتعداد چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ میں بھی اب اسی کیفیت سے دوچار تھا جس کے تحت وہ سیاح برج میں میرا چہرہ دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اس وقت کوئی ذی روح مجھے بھی صرف "ہیلو" کہہ دیتا تو میں ہیلو کا "و" ختم ہونے سے پیشتر ہی برج پر سے حدرہ میں چھلانگ لگا دیتا ۔ ۔ ۔ ۔ دروازے کا ایک بوسیدہ کواڑ ہوا کے زور سے متواتر جھول رہا تھا اور کبھی کبھار برج کی دیوار سے جا ٹکراتا۔ میں نے اٹھ کر اس کے آگے دو اینٹیں رکھ دیں اور پھر ایک اور موم بتی جلا کر اینٹوں کے شیڈ میں رکھنے کی بجائے فرش پر جما دی۔ اب مجھے اس بات کی پرواہ نہ تھی کہ کوئی محافظ روشنی دیکھ کر ادھر آ نکلے گا بلکہ یہ خواہش ہی شاید اس دیدہ دلیری کا موجب بنی تھی۔ اپنا خوف کم کرنے کے لئے میں نے ایک اور سگریٹ کا سہارا لیا اور سر کے نیچے بازو رکھ کر لیٹ گیا۔

چند لمحوں بعد برج کے باہر کسی شے کے پھڑپھڑانے کی آواز آئی اور ساتھ ہی ایک ہیولا جھروکے میں سے اندر داخل ہو گیا۔ میں دم سادھے لیٹا رہا۔ یہ ایک کریہہ المنظر چمگادڑ تھی جو تھوڑی دیر برج میں ایک کٹی پتنگ کی طرح منڈلاتی رہی اور پھر اپنے مسکن میں ایک اور ذی روح کو لیٹا دیکھ کر باہر چلی گئی۔ میں

نے ہاتھ بڑھا کر موم بتی کو جو چمگادڑ کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے گل ہو چکی تھی دوبارہ روشن کر دیا۔

میرا خیال تھا کہ میں الحمرا میں شب بسری کے دوران اس برج میں بیٹھ کر اس لازوال قصر سے موسوم تاریخی اور رومانی داستانوں کو اپنے تصور میں دوبارہ زندہ کروں گا اور اس طرح ایک انوکھے تجربے میں سے گذروں گا۔ مگر اس ہیبت ناک ماحول میں تو یہ سراسر ناممکن تھا۔ یہاں مسئلہ صرف اتنا تھا کہ کسی طور خوف کی اس ننھی منی کونپل کو مسل دیا جائے جو یکدم تناور درخت بن کر مجھے یہاں سے فرار ہونے پر مجبور کر رہی تھی۔ میں وقت گذارنے کی خاطر چھت پر خط کوفی میں کندہ آیات قرآنی پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اتنے میں تین چار ننھی منی چڑیاں ایک جھروکے میں سے برج کے اندر آ گئیں۔ وہ فرش اور چھت کے درمیان غل مچاتی ہوئی اڑنے لگیں اور پھر ایک گھونسلے میں گھس کر چونچیں باہر نکال کر مجھے انتہائی حیرت اور معصومیت سے تکنے لگیں۔ ان میں سے ایک لگاتار موم بتی کے گرد پرواز کر رہی تھی اور چیں چیں کے شور سے برج سر پر اٹھا رکھا تھا۔ اس خیال سے کہ شاید روشنی اسے ناگوار گذر رہی ہے میں نے موم بتی گل کر دی۔ چڑیا نے شکریے کے طور پر ایک لمبی چیں کی اور گھونسلے میں بیٹھ گئی۔ ان ننھے منے پرندوں نے میرے ذہن میں اگتی خوف کی تمام کونپلوں کو نوچ کھایا تھا۔ ان کی لگاتار چہچہاہٹ سے میرے خوفزدہ اعصاب بالکل پرسکون ہو گئے۔ یہاں مجھے ایک شخص یاد آیا اور الحمرا میں شب بسری کے دوران ارونگ واشنگٹن کے سوا اور کون یاد آ سکتا ہے۔ وہ آج سے تقریباً ڈیڑھ سو برس پیشتر جب اس اجاڑ قصر میں رہائش پذیر تھا تو غرناطہ کے غریب غربا رات کو موم بتیاں جلا کر انہی برجوں میں بقول ان کے آسمانی مچھلیوں کا شکار کیا کرتے تھے۔ یہ آسمانی مچھلیاں وہ لاتعداد ابابیلیں اور چڑیاں تھیں جنہوں نے ان برجوں میں گھونسلے بنا رکھے تھے۔ یہ ہوائی مچھیرے بنسی کے کانٹے پر خوراک لگا کر برج میں بلند کرتے اور پرندے ان پر منہ مار کر فوراً شکار ہو جاتے۔

ان دنوں الحمرا کا قصر شاہی زوال کے اس دور سے گذر رہا تھا جب کوئی برج منہدم ہوتا تو کوئی نادار اور خستہ حال گھرانہ ان منقش ایوانوں میں آ کر چمگادڑوں اور الوؤں کا ہمسایہ بن جاتا اور قصر کے دریچوں میں اور روشندانوں پر پھٹے پرانے چیتھڑوں کے پرچم لہرانے لگتے۔ ارونگ کی "الحمرا کی کہانیاں" پڑھ کر مجھے حیرت ہوتی تھی کہ اس شخص نے چشم تصور سے معمولی واقعات کو اتنی پرکشش داستانوں

ہیں کیسے ڈھالا۔ مگر اُس شب یہ راز کھلا کہ آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے اس ویرانے کی تاریک راتوں میں تیز ہوا کے شور کو "پتھروں کے چوک میں دھیمی دھیمی آوازیں جیسے ہتھکڑیاں کھنکتی ہوں جیسے زنجیروں کی جھنکار ہو" کی صورت میں سُننا قرین از قیاس ہے اور ذرا سی آہٹ کو "بنو سراج کے مقتول سرداروں کی روحیں جو اپنے مقتل میں آکر اپنے قاتلوں کے خلاف اللہ سے انتقام کی فریاد کر رہی ہیں" میں بدل دینا قابلِ فہم۔ رات کے پچھلے پہر جب میرے ساتھی پرندوں نے چہچہانا بند کر دیا تو شدید سردی کے باوجود میں آہستہ آہستہ زندہ موت کے اس تجربے میں اتر گیا جسے نیند کہتے ہیں۔

دوسری صبح جب آنکھ کھلی تو میں حسبِ عادت سلیپنگ بیگ میں سر چھپائے خاصی دیر تک کاہلی سے اونگھتا رہا اور پھر مختلف آوازوں نے مجھے خبر کی کہ میں پانسیان کے بستر کی بجائے الحمرا کے ایک بُرج کے فرش پر لیٹا ہوں۔ پانی کے چلنے کی آواز اور پرندوں کا شور و غل یوں سنائی دے رہا تھا جیسے میں آبشاروں اور پرندوں سے بھرے ایک جنگل کے درمیان میں لیٹا ہوں۔ میں نے سلیپنگ بیگ چہرے سے ہٹایا۔ چھت سے لٹکے گھونسلوں پر کرنوں کا ایک جال بچھ رہا تھا۔ مہربان سورج جنت العریف کے سرو اور انجیر کے دھند آلود درختوں میں سے سر اٹھانے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ الحمرا جیسے گرد کے جنگل کی تاریکی میں سے اُبھر کر پیلی دُھوپ میں چمکنے لگا۔ دریائے حدرہ کے کنارے ایک نوجوان عورت صراحی نما مٹکے میں پانی بھر رہی تھی۔ فصیل کے ساتھ ایک کوارٹر کی چمنی میں سے دھواں اُٹھ رہا تھا اور ریڈیو پر کوئی ہسپانوی دُھن مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ جبل سبیقہ کی سرسبز ڈھلان پر معلق دُھند آہستہ آہستہ اُوپر اٹھ رہی تھی۔ میں نے سرہانے سے گھڑی نکال کر وقت دیکھا، سات بج رہے تھے۔ سلیپنگ بیگ تہہ کر کے میں نے کپڑے بدلے اور ایک موم بتی جلا کر اس پر اپنے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھ سینکنے لگا۔ اس کے بعد ناشتے کے طور پر پچھلی شب کی بچی کھچی ڈبل روٹی نگلی اور سگریٹ سلگا کر الحمرا کے کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔

نو بجنے میں دس منٹ پر حدرہ کے پانیوں اور زیرِ زمین چشموں کے دھم سروں میں یکدم اضافہ ہوا اور میں جان گیا کہ الحمرا کے صحنوں اور دالانوں میں پچھلی شب سے خاموش پڑے فواروں کو سیرا نوادا کی برف سے پگھلے ہوئے یخ بستہ اور شفاف پانیوں نے آبی نغموں کی زبان پھر سے عطا کر دی ہے۔ بُرج چھوڑنے سے پیشتر میں نے فرش پر بکھرے جھروکے کی ٹوٹی ہوئی ٹائلوں اور شکستہ اینٹوں کو اس انداز سے ترتیب دیا کہ بچھڑے ہوئے نقوش نے ایک دوسرے کو تھام لیا۔ خطاطی کے الفاظ نے اپنے

ٹوٹے ہوئے دائروں کو جوڑا اور ریزوں پر ریزے ڈیزائن کی ابتدائی صورت ابھر کر سامنے آگئی۔ اب اگرات اُتنی جہارت اور احتیاط سے اٹھایا جاتا جیسے میری والدہ کی بھر بھری روٹی کو ہتھیلی پر پلٹ کر توے سے اٹھاتی ہیں تو اسے برج کے اُس شگاف میں بآسانی لگایا جا سکتا تھا جہاں سے یہ سینکڑوں برس پہلے کسی طوفانی رات میں ٹوٹ کر گرا تھا۔ میں نے سلیپنگ بیگ کندھے پر ڈالا اور غیر معمولی کی جستجو میں میرا ساتھ دینے والے برج کی چھت اور فرش پر آخری نگاہ ڈال کر شگاف زدہ سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا فصیل کی دو شاخوں پر پڑے شہتیر کو عبور کر کے جب میں کھنڈروں کے میدان میں داخل ہوا تو سرخ مچھلیوں کے تالاب کے قریب الحمرا کے دو محافظ دھوپ میں کرسیاں ڈالے اونگھ رہے تھے۔ شیروں کے صحن، صحنِ حنا اور صحنِ دیوانِ خاص میں سے اتنی عجلت سے گذرا جیسے ان سے آنکھیں چرا کر نکل جانا چاہتا ہوں۔ مبادا اس قصر کا دلفریب طلسم مجھے ایک مرتبہ پھر اپنی گرفت میں لے لے۔ باب العدل سے باہر نکلتے ہوئے میں نے اُس کے ماتھے پر کندہ چابی کی جانب دیکھا جس کا نقش اب ہمیشہ کے لئے میرے دل پر ثبت ہو چکا تھا۔

تصور کی وہ کنجی جس کی مدد سے میں زندگی کے آخری دنوں میں الحمرا کے زنگ آلود قفل کھول کر اس کے رنگ برنگے ہوؤں میں واپس آ سکتا تھا۔ پتلے ستونوں کے مرمریں اجسام چھو سکتا تھا۔ سُرخ پتھروں میں سعید سروئے باغوں پر کھلتے جھروکوں میں سے جھانک سکتا تھا۔ شیروں کے فواروں کی مدھم بارشوں کی سرسراہٹ میرے کانوں میں اُتر سکتی تھی اور پھر اس کے شکستہ برج میں شب بسری کی یاد اُن بے خواب راتوں میں میرے پپوٹے بوجھل کر دے گی جو میں اپنے اس بستر میں مقید گزارتا ہوں جس پر بالآخر مجھے ابدی نیند سونا ہے۔

صحرا میں اُٹھتے ایک آوارہ بگولے کی مانند ہماری بس سیرا نوادا کی پہاڑیوں میں بل کھاتی سڑک پر نیچے ویگا میدان میں بچھے شہر غرناطہ سے آہستہ آہستہ بلند ہو رہی تھی۔

جبل ماہتاب پر پھیلے باغوں میں انگوروں کے سیاہ گچھے بندروں کی طرح شاخوں سے لٹک رہے تھے۔ سُرخ مرچوں کے قالین کھیتوں میں سُوکھ رہے تھے۔ انگور اور مالٹے کے باغوں میں کہیں کہیں کھجور کے درخت زرافوں کی طرح سر اٹھائے کھڑے تھے۔ عرب تہذیب کے وہ نمائندے جن کی جڑیں

ابھی تک اس سرزمین میں پھیلی ہوئی ہیں۔

سڑک کے دونوں طرف پھلوں کے بوجھ سے جھکے ہوئے انار کے درختوں کی قطاریں تھیں۔ ڈرائیور مخالف سمت سے آنے والی کسی کار یا بس کو راستہ دینے کی خاطر کچے راستے پر اترتا تو پکے ہوئے انار بس کے آہنی پیکر پر سرخ اولوں کی طرح مسلسل برسنے لگتے اور مسافر کھڑکیوں میں سے لپکتی شاخوں سے بچاؤ کے لیے کسی ماہر شمشیر زن کی مانند پہلو بدل کر ان کے وار بچانے لگتے۔ عرب شاعروں نے غرناطہ کے حسین چہرے کے گرد پھیلے انہی اناروں کو سرخ رخساروں سے تشبیہ دی ہے۔ مجھے صرف مجازاً ہی نہیں حقیقتاً "غرناطہ یاد آرہا تھا"۔ حسب وعدہ مرسیڈس مجھے آدیوس کہنے کے لیے بس سٹیشن پر آئی۔

"میں ابوعبداللہ تو نہیں جو ہمیشہ کے لیے غرناطہ چھوڑ رہا ہوں"۔ میں نے مرسیڈس کو بے حد اداس دیکھ کر کہا تھا۔ اور پھر تم ہسپانوی ہی تو ایسے موقعوں پہ کہتے ہو کہ یہ آفت غرناطہ کے چھن جانے کے صدمے سے کہیں کم ہے"۔

اس نے حسب معمول اپنی پیراسیوس آنکھیں جھپکیں اور سر جھٹک کر کہا "نہیں فلیمنکو... کم ازکم میرے لئے نہیں...!"

سڑک کے کنارے کھڑے چند دہقانوں نے ہاتھ کا اشارہ دیا اور بس ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ کھڑکیوں کے ساتھ بیٹھے مسافروں کی گودیں پہلے متعدد تربوز گرے پھر انہیں شراب کی کچی صراحیاں تھمائی گئیں اور اس کے بعد ان میں سے صرف ایک دہقان مرغیوں سے لدا پھندا ایک جال گھسیٹتا ہوا بس کے اندر داخل ہو گیا۔ ڈرائیور نے بریک سے پاؤں اٹھالیا۔

بس نے ایک موڑ کاٹا اور الاحمر کی شوخئ تحریر کا فریادی نقش الحمرا اور اس کے چاروں اور پھیلا غرناطہ میری نظروں کے سامنے آگیا۔ یہ جگہ اس مقام کے عین مقابل تھی جہاں ابوعبداللہ نے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں اور پیچھے مڑ کر الحمرا پر آخری نگاہ ڈالی تھی۔ ابدی جدائی کے اس لمحے اس کے ہونٹوں سے بے اختیار ایک سرد آہ نکلی اور یوں وہ مقام آج بھی بے چارگی اور شکست کی علامت کی صورت "مُور کی آخری آہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ شاید یہ قصر الحمرا کے سوگوار حسن کا طلسم ہے کہ جو بھی غرناطہ چھوڑتا ہے اُسے مُور کی آہ لگ جاتی ہے۔ اس کے دل میں بھی جدائی کا یہ لمحہ اسی طور کٹتا چلا جاتا ہے

غرناطہ سے دُور ہوتے ہوئے میرے احساسات بھی ابوعبداللہ سے مختلف نہیں تھے۔

آج ہونے اور نہ ہونے کے ابدی سوال کا جواب مجھے اثبات میں ملا۔ میں ہوں اور اس ہر کی درجہ سے میں نے غرناطہ دیکھا۔ گارسیا لورکا نے بھی غرناطہ دیکھا اور سُنا مگر وہ اس کی چاہت کی پاداش میں ہونے سے نہ ہونے کی تاریکیوں میں گم کر دیا گیا۔

"اپنے کمرے میں سے
میں فوارے کی سرگوشیاں سُن رہا ہوں
انگور کی ایک بیل
اور سُورج کی ایک کرن
دونوں سیدھے میرے دل میں اُترتے ہیں
ماہ اگست کی ہواؤں میں بادل تیرتے ہیں
اور میں اس وقت خواب دیکھ رہا ہوں کہ .....
میں فوارے کی سرگوشیوں میں قیدِ خواب تو نہیں دیکھ رہا"

("غرناطہ ۱۹۵۰ میں" گارسیا لورکا)

لورکا کے برعکس لاہور شہر کے درمیان میرے کمرے میں صوتی اور صُوری تاثر کچھ ایسا ہے کہ وہاں خواب دیکھنا تو کجا ذی ہوش رہنا بھی ایک معجزے سے کم نہیں۔ لیکن شاید واپسی پر صورتِ حال مختلف ہو۔ مجھے یقین تھا کہ اب غرناطہ دیکھنے کے بعد میں اُس کمرے کے کرخت ماحول میں بھی لورکا کے شعری حُسن کے سہارے کھڑکی سے باہر کریہہ المنظر جدید عمارتوں کی بجائے انگور کی شاخیں لٹکتی دیکھوں گا۔ میرے کانوں کو چیرتا چیختی چلاتی بدبودار ٹریفک کا اذیت ناک شور اُن فواروں کی سرگوشیوں میں بدلے گا جن کی سرسراہٹ الحمرا کے گردونواح میں میرے اندر جذب ہوئی تھی..... اور میں اُس وقت خواب دیکھوں گا اور مجھے یقین ہوگا کہ میں یہ خواب فوارے کی سرگوشیوں میں مقیّد ہی دیکھ رہا ہوں۔

میں نے پیچھے مُڑ کر اُس زندہ خواب کو ایک مرتبہ پھر دیکھا جسے الحمرا کہتے ہیں۔ ڈھلتی گرمیوں کی نشیلی دوپہر غرناطہ کو اپنی آغوش میں لے رہی تھی۔ سُورج کی پگھلتی روشنی میں اُونگھتے ہوئے الحمرا کے بُرج، چشمِ حیرت جھروکے، سُرخ اژدہا فصیل، جنت العریف کے دریچوں میں جھُولتے بلند سرو، جبل سبیقہ

کی سُرخ مٹی کو ڈھانپتے ہوئے سرسبز انجیر خزاں رسیدہ چناروں کے سُرخ پتے الوداعی ہتھیلیوں کی طرح کھلے۔ البسین کی قدیم حویلیوں کے سفید در و دیوار اور سُرخ ڈھلوان چھتیں دھوپ میں سُلگ رہی تھی۔ اُن کے پوشیدہ باغ چوکور سرسبز ٹکڑیوں کی صورت میں سفیدی اور سُرخی کی اِس تصویر میں علیحدہ ابھر رہے تھے۔ بُرج العقر، بُرجِ قمارش .... اور پھر مجھے اُس شکستہ بُرج کی ایک جھلک دکھائی دی جس کی چھت تلے میں نے پچھلی شب بسر کی تھی۔ جس کے فرش پر بکھری اینٹوں اور ٹائلوں کو میں نے یوں ترتیب دیا تھا کہ جھروکے کا ابتدائی نقشہ وجود میں آگیا تھا۔ ہو سکتا ہے میرے ہاتھوں سے ترتیب شدہ یہ نقش و نگار صدیوں تک یونہی فرش پر پڑے رہیں تا آنکہ ایک روز قدرت جبل سبیقہ پر ایستادہ اِس حسین عمارت کو انسانی نظروں سے اوجھل کر دے .... فضا میں مالٹے کے پتوں کی مہک معدوم ہوتی جا رہی تھی انار اور ان کے درخت بھی بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ میری آنکھیں الحمرا کو مسلسل دیکھنے سے تھکنے لگیں۔ سُرخ عمارتوں کا یہ حسین مجموعہ کبھی غرناطہ کے در و دیوار سے علیحدہ ہو کر میری جانب یوں اُٹھتا کہ باقی سارے منظر کو ڈھانپ لیتا اور کبھی اس طور پیچھے ہٹتا چلا جاتا کہ بالآخر میرے لئے اس کا تعین کرنا بھی مشکل ہو جاتا....
میں نے آخری مرتبہ اِس سوگوار حُسن کے فسوں کو اپنی وداعی نظروں میں اُتارا اور مُنہ موڑ کر اُن تیزی سے سرکتے پتھروں کو شمار کرنے لگا جن پر لکھے ہندسے اب میرے اور میرے گھر کے درمیان فاصلوں کا نہیں قربتوں کا پیام دے رہے تھے.... لیکن کونسا ایسا فسوں ہے؟ الحمرا.... جواب آیا.... الحمرا!

اُندلس میں اجنبی

بُل رنگ میں ہزاروں تماشائی دَم سادھے بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔ اُن سب کی نظریں ایک نُکتے پر منجمد تھیں۔ ایک ایسا نُکتہ جس کی زد میں ایک سُرخ پھاٹک اور اس کے کواڑ پر ہاتھ رکھے ایک بوڑھا آیا ہوا تھا۔ اچانک بگل کی تیز آواز بُل رنگ میں گُونج گئی۔ بوڑھے نے دائیں ہاتھ سے اپنا بوسیدہ ہیٹ اُتار کر ماتھے کا پسینہ پونچھا پھر بائیں ہاتھ سے اصطبل کا سُرخ پھاٹک زور لگا کر دھکیلا اور بڑی پھُرتی سے پیچھے ہٹ گیا... چشم زدن میں ایک بھاری بھرکم سیاہ بُل بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اصطبل میں سے سرپٹ دوڑتا ہوا اکھاڑے میں داخل ہو گیا.....

یہ سان سباستیان کا یونانی تھیٹر نما بُل رنگ نہ تھا۔ ہسپانیہ کی سرزمین پر میری آمد کے پہلے روز کی بُل فائٹ نہیں تھی.... اُس چمکتی دوپہر اور اِس شام کے درمیان ایک سو بیس واردانوں سے پُر شب و روز تھے جو میں نے ہسپانیہ کے وسیع سینے پر حرکت میں گذارے.... ہسپانیہ میں یہ میری آخری شب تھی اور میں بارسلونا کے پلازا دے توروس میں بُل فائٹ دیکھنے چلا آیا تھا... یُوں لگتا تھا جیسے وہی بُل رنگ ہے..... تماشائی بھی سان سباستیان کے ہیں... پھاٹک کھولنے والے بوڑھے کا چہرہ بھی وہی ہے.... کچھ بھی نہیں بدلا... پُورا بُل رنگ تماشائیوں کی تالیوں سے گُونج رہا تھا۔

غرناطہ سے نکلے ہوئے مجھے دس روز ہونے کو آئے تھے مگر میں وہاں سے سیدھا بارسلونا نہیں آگیا تھا۔ تقریباً ایک ہزار میل کی اس مسافت میں بے شمار قصبے آئے، درجنوں شہروں سے گذر ہوا۔ مگر میں گرد و پیش سے لاتعلق ایک ایسے [illegible] مانند ان سب کے درمیان میں سے گذرا

س کی آنکھیں تجلیوں سے یوں چکا چوند ہوئیں کہ وہ کوہ حو۔ سے اترتے ہوئے گرد و نواح کے
ب. و رح ٹیلوں اور پتھروں سے بے خبر چلتا رہا . . . کونسا ایسا فسوں ہے ؟

غرناطہ کے بعد پہلی شب مرسیہ میں بسر ہوئی جسے شہرت کے لحاظ سے ہسپانیہ کا بدقسمت ترین شہر کہنا چاہیئے۔ روایت ہے کہ مرسیہ میں آسمان اور زمین کے درمیان کوئی شئے قابل تعریف نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ایک زمانے میں فوج میں سارجنٹ کے عہدے پر ترقی پانے کے لئے ضروری تھا کہ درخواست دہندہ چور، بدمعاش یا مرسیہ کا باشندہ نہ ہو . . . لیکن ہمیشہ سے ایسا نہ تھا۔ مرسیہ کو اپنا شورش عہد یاد ہے جب یہاں کا ریشم اور رنگین ظروف اندلس بھر میں مشہور تھے۔ آج عربوں کی بنائی ہوئی لکڑی کی چرکھڑی جھیل الجفراس میں سے پانی نکال کر اس کی زمینوں کو سیراب کرتی ہے۔ سیلوں کھیلوں میں موروں اور عیسائیوں کی لڑائیوں کے مناظر سٹیج کئے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اب تو عیسائی ہی جیتتے ہیں۔ مرسیہ فلسفہ وحدت الوجود کے عظیم استاد محمد ابن عربی کا مولد ہے جن کی تصنیف "فتوحات مکیہ" کو دانتے کی "ڈیوائن کامیڈی" کا ماخذ کہا جاتا ہے۔ اگرچہ دانتے ابن عربی کی وفات کے پچیس برس بعد فلارنس میں پیدا ہوا لیکن اس کا استاد برونٹ ابن عربی کا ہم عصر تھا۔ برونٹ نے عربی زبان اندلس میں سیکھی۔ "فتوحات مکیہ" سے اتنا متاثر ہوا کہ پوری کتاب ترجمہ کر کے دانتے کو ذہن نشین کروا دی۔ ابن عربی کو جب الموحدین نے مرتد گردانا تو وہ ترک وطن کر کے دمشق چلے گئے جہاں اٹھتر برس کی عمر میں وفات پائی۔ حسب روایت مرسیہ کی جامع مسجد اب کلیسائے اعظم ہے جہاں میں نے شہر چھوڑنے سے قبل ایک موم بتی جلا کر اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔

مرسیہ سے چند کوس کی مسافت پر میں نے شام کے صحراؤں ایسا ایک منظر دیکھا۔ کھجور کے باغوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تاحد نظر پھیلا ہوا تھا۔ نیلے آسمان میں لاکھوں کنگرے دار پتے چھدرے ہوئے تھے۔ ڈوبتے سورج کے سایوں میں ہزاروں کھردرے تنے یوں سر جوڑے کھڑے تھے جیسے میدان حشر میں خلقت کا اژدحام۔ اک ہجوم نخیل۔ یہ ایلشے کے مشہور زمانہ کھجوروں کے باغ تھے۔ بل کھاتی ہوئی پانی کی کھائیوں کے کنارے اب بھی اسی ہزار سے زائد درخت کھڑے ہیں۔ ایلشے جو عربوں کی آمد سے پیشتر ایک وسیع صحرا تھا۔

اُس رات میں کوستا بلانکا یعنی ساحلِ سفید کے کنارے علی کانت کے خوشنما شہر میں پہنچا راستے میں کہیں کہیں ٹیلیوں اور چٹانوں پر مورش حصاروں کے کھنڈر نظر آتے ہیں۔ کوستا بلانکا بحرِ اوقیانوس کے کنارے پھیلی ہوئی ان ہزاروں جدید سربلند عمارتوں کے مجموعے کا نام ہے جو ہسپانوی سرزمین پر ہونے کے باوجود ہسپانوی نہیں ہے اگر ہے تو سکینڈے نیوین، فرانسیسی اور جرمن تہذیبوں کا ملغوبہ ہے۔ ٹھٹھرتی ہوئی ان اقوام نے جن کے جسم کوڑھیوں کی طرح گلابی چٹاخوں سے بھرے ہوتے ہیں کوستا بلانکا کو پرشنش آفتاب کا اوپن ایئر مندر بنا رکھا ہے۔ اس ساحل پر بیشتر عمارتیں ان کی ذاتی ملکیت ہیں۔ ایک انتہائی دلفریب قصبہ بینی ڈورن نام کا ہے جس کی آبادی گرمیوں کی آمد کے ساتھ ہی نیلے پڑتے اجسام کی یلغار سے نو ہزار سے پچاس ہزار تک جا پہنچتی ہے۔ یہاں آپ کو انگریزی شراب خانے ملیں گے۔ جرمن بینڈ کی دھنیں ساحل پر تیرتی ہیں شرابی سویڈش گلیوں میں گیت گاتے پھرتے ہیں۔ گلیوں کے نام تک غیر ہسپانوی ہیں۔ یہاں تک کہ شبینہ کلبوں میں ہسپانوی لوک گیت الاپنے والی خواتین اور زامبرا ناچنے والی لڑکیاں بھی جرمن یا سویڈش ہوتی ہیں.... کوستا بلانکا پر ایک بلا سویڈش لڑکیوں کی صورت میں بھی نازل ہوتی ہے جنہیں مقامی زبان میں "سویکا" کا نام دیا گیا ہے۔ سویکا کی آمد نے قدامت پرست ہسپانویوں کی ان راتوں کی نیند حرام کر رکھی ہے جو اُن کے نوجوان لڑکے ان سنہری بلاؤں کے بستروں میں گذارتے ہیں۔ صدیوں سے ہسپانوی رسم و رواج کے مطابق شادی سے پیشتر جسمانی میل ملاپ گناہ کبیرا سمجھا جاتا تھا پھر یہ سویکا وارد ہو گئی۔ جوان، سنہری بالوں والی، ہنستی ہوئی، اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے اِدھر اُدھر کی تانکنے پر یقین نہیں رکھتی۔ اختصار پسند ہے۔ ملتے ہی کہے گی "ٹھیک ہے"

علی کانت سے بارسلونا تک میں نے ساحلِ سمندر کے کنارے کنارے سفر کیا۔ درمیان میں ولنسیا کا تاریخی شہر بھی آیا۔ جمعرات کی شب جب میں اس کا کلیسائے اعظم دیکھنے گیا تو برآمدے میں "پانی کی کچہری" کا اجلاس ہو رہا تھا۔ نواحی علاقوں کے دہقان پانی کی تقسیم سے جنم لینے والے جھگڑوں کو اجتماعی طور پر خود ہی نپٹا رہے تھے۔ ایک قدیم روایت جس کا سلسلہ ابھی تک نہیں ٹوٹا۔ مور اسی جگہ جامع مسجد کے برآمدے میں بیٹھ کر "پانی کی کچہری" منعقد کیا کرتے تھے۔ مورش ولنسیا کے بارے میں علامہ شققندی کا بیان ہے کہ قریبی جھیل ال بوفیرہ سے آفتاب کی شعاعیں منعکس ہو کر شہر

پر اس طرح پڑتی تھیں کہ رمبلا میں روشنی بڑھ جاتی تھی۔

ولنسیا سے بارسلونا آکر میں نے یہ محسوس کیا جیسے قدیم تاریخ کے گہرے سمندروں میں غوطہ زن ہونے کے بعد اب میں سطح آب پر حال کی تازہ ہواؤں میں سانس لینے لگا ہوں۔ کاتولانا صوبے کا صدر مقام بارسلونا ایسا خوش نظر شہر ہے جہاں مقامی کہاوت کے مطابق قشتالیہ کا جاہل دہقان بھی آجائے تو شاعر ہو جائے۔ "رمبلا دے فلورس" کو بجا طور پر پھولوں کی سڑک کہا جاتا ہے۔ بندرگاہ میں ایستادہ کولمبس کے مجسمے سے شروع ہو کر یہ حسین گذرگاہ پلازا کاتولانا کے وسیع و عریض چوک پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔ رمبلا کے پہلو میں "باریو چینو" یا چینیوں کے محلے کا گنجلک جنگل پھیلا ہوا ہے جہاں صرف چینی نہیں رہتے۔ تنگ گلیاں روز روشن میں بھی تاریک رہتی ہیں۔ باریو چینو میں ہر سیاح کو صابن اور سگریٹ بیچنے والے غلیظ بچے ملیں گے۔ اگر آپ نے جذبۂ ترحم کے تحت سگریٹ خرید لیے تو بنسن اینڈ ہیجز کے بند پیکٹ میں سے یقیناً مقامی تار برانڈ سگریٹ برآمد ہوں گے جیسا کہ میرے ساتھ ہوا۔ ہر مکان کی چوکھٹ پر جھینگوں، مچھلیوں اور مینڈکوں سے بھری ٹوکریاں دھری ہوں گی۔ ان کے درمیان اُس چینی بوڑھے کی عمر جتنی ہسپانوی بوڑھیاں براجمان ہوں گی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جس روز اس نے اپنی زبان کھولی تھی بوجہ نقاہت انتقال کر گیا تھا۔ اس لیے ان عمر رسیدہ مائیوں کو بلانا خطرے سے خالی نہیں۔ ان مکینوں کے علاوہ باریو چینو میں ہزاروں بلیاں اس شان بے نیازی سے خرّ خرّ کرتی گھومتی ہیں جیسے خراماں خراماں کا لفظ انہی کے لیے محفوظ ہے۔ ان بلیوں کی گذر اوقات بوڑھیوں کی ٹوکریوں میں سے اچھلنے والی مچھلیوں اور مینڈکوں پر ہوتی ہے جنہیں وہ پرواز کے دوران ہی دبوچ لیتی ہیں۔ اسی باریو چینو میں مجھے وہ بیہودہ مصنف ملا جسے ہاتھیوں سے اتنا عشق تھا کہ بٹوے میں اپنی بیوی کی بجائے ایک ہاتھی کے بچے کی تصویر لیے پھرتا تھا۔ گفتگو کا موضوع کوئی بھی ہو وہ اس میں ہاتھیوں کا ذکر ضرور لے آتا.... حضرت موسےٰ اگر فرعون کے دربار میں اپنے عصا کو سانپ بنانے کی بجائے ہاتھی بنا ڈالتے تو وہ ضرور ایمان لے آتا..... امریکی تہذیب یقیناً تباہ و برباد ہو جائے گی کہ ان کے براعظم پر ہاتھی نہیں پائے جاتے...... اس لڑکی کی چال پرکشش ہے مگر ہتھنی جب جھومتی ہوئی چلتی ہے تو سبحان اللہ۔ میں نے جب بیوی کا پوچھا تو کہنے لگا اس نے طلاق کے لیے مقدمہ دائر کر رکھا ہے۔ کہتی ہے میں غلطی سے ہاتھی کی بجائے انسان پیدا ہو گیا ہوں اور

[redacted]

وہ یہ خطرہ ہرگز مول نہیں لے سکتی کہ کسی رات سوئے تو میرے ساتھ مگر دوسری صبح اس کے بستر سے ہاتھی برآمد ہو جائے۔

بارسلونا شہرۂ آفاق ماہرِ تعمیر گارڈی کی تخلیق کردہ چند نہایت محیّر العقل عمارتوں کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔ ان میں گارڈی پارک سرِفہرست ہے۔ اسے میں نے شام کے جھٹپٹے میں دیکھا تو یوں لگا جیسے یا تو میری بصارت میں گڑبڑ ہو گئی ہے یا شاید پارک کی عمارتیں کسی چھوٹے موٹے زلزلے کی بنا پر ٹیڑھی میڑھی ہو گئی ہیں۔ ایک اور عمارت گارڈی کا ڈیزائن کیا ہوا "مقدس خاندان کا کلیسا" ہے۔ کی تعمیر ۱۸۸۱ء میں شروع ہوئی تھی مگر ابھی تک ادھورا پڑا ہے۔ ہر سال اہالیانِ بارسلونا اس عجیب غریب طرزِ تعمیر کو دیکھ کر کشمکش و پیچ میں پڑ جاتے ہیں کہ کہیں وہ اس کی تعمیر جاری رکھ کر ایک شاندار حماقت کا ثبوت تو نہیں دے رہے چنانچہ ۱۸۸۱ء سے مذاکرے ہو رہے ہیں۔ اخباروں میں بحثیں چل رہی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ادھورا پڑا ہے۔

گارڈی کی مانند ایک اور ہسپانوی نژاد فنکار کی تخلیقات بھی ایسی ہیں جنہیں دیکھ کر گارڈی پارک یاد آ جاتا ہے یعنی یا تو اپنی بصارت پر شبہ ہوتا ہے یا پھر.... اور یہ پکاسو ہے جو مالاگا میں پیدا ہوا مگر ابتدائی تعلیم بارسلونا میں حاصل کی۔ کیوبزم کا بانی پابلو رُوئز پکاسو جو کمیونسٹ خیالات کا حامی ہونے کی بنا پر اپنا وطن چھوڑ کر فرانس میں رہائش پذیر ہو گیا تھا مگر جو ذاتی اختلافِ رائے کے حق سے کبھی دستبردار نہ ہوا۔ ۱۹۶۰ء میں جب رُوسی سفیر بذاتِ خود اس کے گھر لینن پرائز دینے کے لئے گیا تو پکاسو نے صرف اس لئے دروازہ نہ کھولا کہ اُسے رُوسیوں کے جدید مصوری کے بارے میں رویّے سے شدید اختلاف تھا۔ "میں نے تمام زندگی شدّت سے محبّت کرنے میں گذاری ہے۔ یہاں تک کہ اگر کل تمام دنیا ذی رُوحوں سے خالی ہو جائے تو میں ایک پھول سے پیار کروں گا، دروازے کے دستے سے محبت کروں گا۔" جب میں بارسلونا کے رو مونکاڈا میں واقع پکاسو میوزیم میں داخل ہوا تو مجھے اس کی تصویروں میں محبّت کی اسی شدّت کا احساس ہوا اور میں نے سوچا اگر واقعی کبھی دنیا تمام ذی رُوحوں سے خالی ہو جائے تو پکاسو کی ان تصویروں سے بھی تو پیار کیا جا سکتا ہے۔

"رمبلا دے فلورس" کو اگر سمرسٹ ماہم نے دنیا کی خوبصورت ترین سٹریٹ کہا تو اس نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا سچ بولا۔ پھول، پرندے اور کتابیں۔ اس دیدہ زیب سڑک کے درمیان گھنے درختوں

[redacted]

کی چھاؤں میں لکڑی کے سینکڑوں کھوکھے ہیں جن میں پکاسو کے رنگوں ایسے پھول ڈھیروں کے حساب سے ملتے ہیں۔ رنگ و خوشبو کے ان گھروں کے ساتھ فٹ پاتھ پر پرندوں کی مارکیٹ کا غلغلہ ہے۔ بڑے بڑے پنجروں میں بند ہزاروں چہچہاتے ہوئے خوش رنگ پکھیرو۔ بارسلونا کے باسی پہروں ان پنجروں کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی پسند کے پرندے کی عادات و اطوار کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ پھولوں اور پرندوں کے درمیان کتابوں کے سٹال ہیں۔ ایک روز باریو چینو جانے کے لئے رمبلا میں سے گذرا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بوڑھا ہسپانوی کولہوں پر ہاتھ رکھے بڑے خشوع و خضوع سے ایک متناسب اوزان کی لڑکی کے تناسب کو گھور رہا ہے۔ وہ لڑکی ایک بک سٹال کے آگے کھڑی ایک کتاب کے اوراق میں گم ہے۔ لڑکی کا کتا زبان لٹکائے بڑی بے بسی سے ایک پنجرے میں پھدکتے پرندوں کو دیکھ رہا ہے۔ پورے دو گھنٹے بعد جب واپس آیا تو بوڑھا ہسپانوی، لڑکی اور کتا بدستور اپنے مشاغل میں محو تھے۔

بارسلونا میں ہی ایک نہایت فرحت انگیز تجربہ ہوا۔ ایک صبح شیو بنانے کے لئے نل کھولا تو پیرس کی میڈم تزی کے کمرے کی طرح پانی کی بجائے صرف شُوں شُوں کی آواز برآمد ہوئی۔ برابر کے کمرے میں مقیم ایک امریکی سے شیو بنانے کے لئے پانی مانگا تو وہ الماری میں سے شیمپین کی ایک بوتل نکال لایا۔ ”اس پانسیان میں صبح سات بجے پانی؟“ اس نے میرا مگ شیمپین سے لبالب بھرتے ہوئے خوشدلی سے کہا ”شیو بنالو یا ... پی لو“

چنانچہ اُس روز زندگی میں پہلی بار اور فی الحال آخری مرتبہ میں نے بُلبلے چھوڑتی شیمپین ایسی مہنگی شراب سے شیو بنائی ... ظاہر ہے خاصے شش و پنج کے بعد کہ اسے بہتر استعمال میں کیوں نہ لایا جائے۔

بُوڑا بُل رنگ تماشائیوں کی ناہوں سے گونج رہا تھا۔ بارسلونا کا بُل رنگ!

آج ہسپانیہ میں میری آخری شب تھی۔ کل صبح چھ بجے مجھے بذریعہ بس فرانس کے راستے سوئٹزرلینڈ چلے جانا تھا جہاں کوہ ایلپس میں رنگینی اور بنیٹ ایکسپریس سوئے استنبول جاتی ہے۔

میں نے ڈان کیخوتے کی طرح اپنے ذہنی انتشار کی شدت سے مغلوب ہو کر مہم جوئی کی غرض سے سفر پہ کمر باندھی تھی۔ رعنائیوں کے لئے، اذیتوں کی تلاش میں ... محبتوں کی جستجو میں ... اور میں نے ان سب کو پا لیا تھا۔ کیخوتے اپنے پُر از شورش سفر کے اختتام پہ اپنے گاؤں کو لوٹا اور بظاہر مہم جوئی کے پاگل پن سے تائب ہو کر چپ چاپ اپنے بستر میں مقید ہو کر چند روز بعد مر گیا۔ اُس کے

کتبے پر تحریر تھا "اگرچہ اُس نے اپنی زندگی دیوانگی میں گذاری لیکن کم از کم وہ ایک ذی ہوش انسان کی طرح فوت ہوا"۔ میں بھی دیوانگی کی زندگی کے چند ماہ گذارنے کے بعد وطن واپس لوٹ رہا تھا ایک ذی ہوش انسان کی طرح روٹین میں جکڑے جانے کے لیے۔ بظاہر میں بھی مہم جوئی کے پاگل پن سے تائب ہو جاؤں گا مگر میرا ذہن اس فرزانگی سے ہمیشہ کلبلاتا رہے گا۔ اُس چینی فلسفی کی مانند جس نے خواب میں اپنے آپ کو ایک تتلی کے رُوپ میں دیکھا جو رنگوں کے ایک وسیع جنگل میں پرواز کر رہی ہے جہاں ہزاروں لاکھوں خوش رنگ پھول کھلے ہیں۔ رنگوں اور خوشبوؤں کے اس بظاہر لامحدود تجربے میں سے گذرنے کے بعد جب وہ بیدار ہوا تو اپنے آپ کو پھر ایک عام انسان پایا لیکن ایک فلسفی ہونے کی حیثیت سے وہ اس تبدیلی کا متحمل نہ ہو سکا اور بقیہ تمام عمر اسی سوچ میں گم رہا کہ کیا وہ ایک ایسا انسان ہے جس نے کبھی خواب دیکھا تھا کہ وہ ایک تتلی ہے یا یہ کہ وہ کبھی ایک تتلی تھا مگر اب خواب دیکھ رہا ہے کہ وہ ایک انسان ہے۔ میں فلسفی تو نہیں مگر میں بھی اندلس دیکھنے کے بعد بقیہ زندگی شاید اسی سوچ میں گم ہوں .... اور ان سوچوں کا آغاز ابھی سے ہو چکا تھا .... بارسلونا کے بُل رنگ میں .... جو تماشائیوں کی تالیوں سے گونج رہا تھا۔

یکدم روشنی ہوئی .... فلیش .... میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ میز کے سرے پر وہی بُل فائٹ والی لڑکی کیمرہ آنکھوں سے لگائے بیٹھی تھی .... اس نے کیمرہ آنکھوں سے ہٹایا اور ہاتھ ہلا کر زور سے کہنے لگی "بیوٹی بُل ...." تمام لوگ ہنسنے لگے۔ میں نے نظریں نیچی کر لیں۔ سنہری بالوں والی لڑکی .... آنے پا!"

مگر وہ تو رسان سباستیان تھا اور میں بارسلونا کے بُل رنگ میں تھا جو ابھی تک تماشائیوں کی تالیوں سے گونج رہا تھا۔ اکھاڑے میں داخل ہونے والا آخری بُل اپنی سیاہ آنکھوں سے اُس ریتلے میدانِ جنگ کا جائزہ لے رہا تھا جہاں اگلے چند لمحوں میں اسے یقینی موت کا سامنا کرنا تھا۔ مگر اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں سے جرأت کا ایسا لاوا اُبل رہا تھا جسے موت بھی دیکھ لیتی تو خوف سے سرد ہو جاتی۔

بُل فائٹنگ کے سیزن کے ساتھ ساتھ یہ گرمیوں کا آخیر بھی تھا۔ سُورج کب کا غروب ہو چکا تھا مگر بُل رِنگ کے درجنوں ستونوں پر نصب برقی روشنیاں اکھاڑے کو یوں چکا چوند کر رہی تھیں کہ ریت کا ذرہ ذرہ چمک رہا تھا سوائے کلیجی رنگ کے ان دھبوں کے جو اسی اکھاڑے میں مارے جانے والے پچھلے پانچ بُلوں کی موت کی نشاندہی کر رہے تھے۔ سان سباسٹیان کے برعکس بارسلونا کے بُل رِنگ میں براجمان تماشائی "انکسی نادو" یعنی بُل فائٹ کے دلدادہ نہ تھے۔ ان میں سے بیشتر وہ غیر ملکی سیاح تھے جو صرف اپنی البموں کو سجانے کی خاطر اِس رنگین قتل کی جُزیات کی تصاویر اتار رہے تھے، سُرخ شراب پی رہے تھے، بھُنی ہوئی مچھلی کھا رہے تھے ..... پاس بیٹھی لڑکیوں سے چُہلیں کر رہے تھے .... صرف بُل فائٹ نہیں دیکھ رہے تھے۔ مگر اس آخری بُل کی آمد سے اکھاڑے کی زمین یُوں لرزی۔ اُس کے سُموں کی دھمک اس طرح تمام شور پر حاوی ہوئی۔ موٹی کھال، چمکتی آنکھوں، چوڑے ماتھے، چربی سے بھرپور گردن اور مڑے ہوئے خطرناک سینگوں میں پنہاں حیوانی قوت نے ہر تماشائی کو اتنی شدت سے جھنجھوڑا کہ ہر سُو مکمل سکوت طاری ہو گیا۔ یہ ایک پیر اُفتادہ بُل تھا، ناقابلِ تسخیر! بہادر بُل۔ حیوانی قوت کے تودے میں چمکتی آنکھوں نے گیلری کے پیچھے کھڑے بُل فائٹر کے معاونین کو اس بُری طرح خوفزدہ کیا کہ وہ اکھاڑے میں اُترنے سے کترانے لگے۔ یہاں تک کہ تماشائیوں نے "آران کا دا۔ آران کا دا" یعنی بُزدل، بُزدل کے نعرے لگا کر انہیں اس گھٹاٹوپ آفت کا سامنا کرنے پر مجبور کر دیا۔

•

"میرے سامنے ایک سنسان سڑک دھوپ میں لیٹی ہوئی تھی۔ اِرد گرد خشک اور بنجر پہاڑ سر اٹھائے کھڑے تھے۔ ہر سُو ایک ہولناک سناٹا طاری تھا۔ صرف گرم لُو کی سائیں سائیں اور شاید میرے دل کے دھڑکنے کی آواز.... دھک .... دھک! اب کیا ہوگا؟ دھک! میں بدبخت قشتالیہ کی پتھریلی زمین پر آگ برساتے آسمان تلے بے یار و مددگار کھڑا تھا۔ ایک چھوٹا سا لطیفہ!"

بُل فائٹر کے معاونین اس گھٹاٹوپ آفت کی طرف ایک نیم دائرہ بنا کر بڑھے جس کے سائے سے بھی وہ گریزاں تھے مگر جونہی بُل ان کی جانب متوجہ ہوا، وہ انتہائی سراسیمگی کی حالت میں پیچھے ہٹنے لگے۔

بُل کی چکنی کھال موت کی اندھی وادیوں سے بھی سیاہ تر تھی۔

"آج میں نے قشتالیہ کے ان دور دراز رہگزاروں کے درمیان کوہستانی راستوں اور اجنبی گھاٹیوں میں گھرے اس شہر میں ایک لڑکی کو دیکھا تھا۔ وہ سفید شال میں لپٹی بالوں میں چنبیلی کے پھول سجائے بالیبو کے راستے پر چلتی گئی۔ اسے شاید کبھی خیال بھی نہ آئے گا کہ ایک ... ایک گمنام غیر ملکی ثریا کی پراسرار نسام ... اس کی آنکھوں سے نکلنے والی اداس کالی شعاعوں کی زد میں آیا تھا۔ تمام شب ثریا کا مترنم اور نسوانیت سے بھرپور نام میرے ذہن کی خاموش جھیل پر چاندی کی بارش کی طرح برستا رہا۔ ثوریا! ثوریا! ثوریا!"

معاونین کے پیچھے ہٹتے ہی تماشائیوں نے ایک مرتبہ پھر آران کا داد، آران کا دا... سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ بادلِ ناخواستہ انہیں آگے بڑھنا پڑا..... وہ سرخ کپڑے کو بے دلی سے لہراتے مگر بُل کے قریب آنے سے پیشتر ہی اسے سمیٹ کر ایکدم پسپا ہو جاتے..... ایک مختصر عرصے میں ہی وہ بُل کو تھکانے کی بجائے خوف اور دہشت سے چور خود ہی تھک چکے تھے..... تماشائیوں کی برانگیختگی کا یہ عالم تھا کہ اگر نشستیں ان کے نیچے سے کھسکا لی جاتیں تب بھی وہ اسی حالت میں اکڑوں بیٹھے رہتے۔ آخرکار ایک ایسا بُل جو قتل ہونے کے لیے نہیں قتل کر دینے کی نیت سے اکھاڑے میں داخل ہوا تھا۔

"کاؤنٹ جبرلین مجھے علم ہوا ہے کہ تمہاری افریقی ریاست سیوتا کے صحراؤں میں بے حد تند خو عقاب پائے جاتے ہیں۔ تم سیوتا واپس پر مجھے شکار کے لیے چند عقاب روانہ کر دو..... میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو افریقہ سے ایسے تند خو عقاب روانہ کروں گا جو آپ کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوں گے۔"

"ہے تورو۔ ہے تورو" لوگ رندھے ہوئے گلوں سے بُل کو داد دے رہے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک بُل اتنا تند خو ہو سکتا ہے۔ معاونین کے واپس جاتے ہی بُل نے پوری قوت کے ساتھ بھاگتے ہوئے اکھاڑے کا ایک چکر لگایا۔ متعدد بار لکڑی کی گیلری کو اپنے مڑے ہوئے تیز سینگوں سے رگیدا اور پھر درمیان میں آکر سموں سے ریت کو انتہائی وحشت سے اڑا...

۔ اب اس کا اصلی مدمقابل یعنی بل فائٹر گیلری سے نکل کر میدان میں آیا لیکن حسب توقع اور حسب روایت تالیوں کی بوچھاڑ کی بجائے اسے مکمل خاموشی کا سامنا کرنا پڑا۔ تماشائیوں نے آج اپنی تمام تر داد بل کے لیے مخصوص کر رکھی تھی۔

"پپوٹوں کی ٹٹولتی آنکھوں نے خبر کی۔ پہلے "لا" ہے۔ اس کے بعد "الہ" آتا ہے اور .... اور پھر تن مادر سے کٹنے کے بعد میرے کانوں میں اترنے والی پہلی آواز گونجی۔ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔ اندھیرے چھٹنے لگے۔ میرے گرد کا خلا بنفشی۔ ارغوانی سنگ مرمر کے نازک ستونوں کے ایک جنگل میں بدلنے لگا۔ شام کے صحراؤں میں ایک ہجوم نخیل۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سبز نیم تاریکی میں ہزاروں بنفشی۔ ارغوانی۔ سیاہ اور زرد کنول ایک غیر فانی شب کے خنک سکوت میں مرجھا رہے ہوں، ماند پڑتے جا رہے ہوں۔ مگر ان کا رنگ پھیکا پڑنے کی بجائے مزید شوخ ہو رہا ہے۔ کنول کے اس کملاتے ہوئے جنگل میں حسن بیمار کی سی دلکشی تھی۔ جیسے پوری مسجد ایک خاموش اور ٹھنڈی آگ۔ سنگ مرمر کی آگ میں جل رہی ہے۔ سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ مر چکا ہے۔ سرد ہو چکا ہے۔ مگر جل رہا ہے۔ اس میں حدت ہے حسن رفتہ کی"

انجام یہ کہ موت میری منتظر ہو.... لیکن ابھی نہیں۔ ابھی تو اس بل کو ایک عرصے تک اس اکھاڑے میں رہنا تھا۔ جرأت اور خوبصورتی کا ایک انمٹ باب تخلیق کرنا تھا۔ یہ اکھاڑا اس کا وطن تھا اور سامنے کھڑا بل فائٹر اسے یہاں سے نکالنے آگیا تھا۔ ان طاقتوں کی علامت جو تمام جائز اور ناجائز حربے استعمال کر کے اسے اس سرزمین سے جلاوطن کر دینا چاہتی تھیں ....

لیکن ابھی نہیں....

"سیپیدس کی خوشنما بالکونیوں کے سائے میں ایک لڑکی چلی آ رہی تھی ہسپانوی طرز کا بالوں کا جوڑا۔ ایک قہقہہ کی دستار کی طرح پُرپیچ اور بلند مگر چہرہ اجتناب کی بجائے ترغیب کی تصویر۔ جیسے ہر یاول کا ایک متناسب ٹکڑا کسی پائنو میں سے کٹ کر میری جانب رواں ہو۔ چال دیکھ کر احساس

ہوتا تھا کہ پیار جی کی ٹرائکر یٹ ناٹرلا نے نہیں اس کے جسم نے کی ہے۔

"یہ گئی بد بخت" اس نے سرگوشی کی"

بُل نامُٹر جو اس سے پیشتر دو بُل انتہائی مہارت اور خوبصورتی سے قتل کر چکا تھا بُل کے قریب آیا۔ سُرخ کپڑا جھٹک کر اُسے حملہ آور ہونے کی ترغیب دیتے کر ہی تھا کہ بُل "آنا فاناً" اس تیزی سے جھپٹا کہ سُرخ کپڑا بُل نامُٹر کے ہاتھوں سے گرتے گرتے بچا۔ لڑائی کے لئے غیر متوقع آمادگی کے اس اظہار نے بُل نامُٹر کو چوکنا کر دیا۔ یہ بُل اکھاڑے میں صرف کھیلنے نہیں آیا تھا۔ زندگی اور موت کی کشمکش کھیل تو نہیں کہلا سکتی۔

"بجلی ایک مرتبہ پھر چمکی تو دائیں ہاتھ پر سیرا مورینا کی جانب جاتی ہوئی سڑک کے کنارے "مدینۃ الزہرا۔ اس طرف" کا بورڈ نظر آیا مگر ہماری کار ماضی کے ان مزاروں کی بجائے قعبیل قرطبہ کے ساتھ اشبیلیہ جانے والی شاہراہ پہ مڑ گئی۔ بارش اب پھر تیز ہو چلی تھی۔ جب کبھی بجلی چمکتی کار کے شیشوں پر رینگتے پانی کے قطروں میں سے سیرا مورینا کی سیاہ چوٹیاں نظر آجاتیں۔ اس وقت مدینۃ الزہرا کے کھنڈروں میں سانپ رینگ رہے ہوں گے"

اب خوفزدہ بُل فائٹر اپنے حواس مجتمع کرنے کی خاطر پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور بُل کو پہلی مرتبہ ایک کھلونے کی بجائے ایک مدّ مقابل کی حیثیت سے پرکھا۔ برقی روشنیوں سے اب صرف اکھاڑے کی زینت ہی نہیں بل فائٹر کے چوڑے ماتھے پر نمودار ہوتے ہوئے پسینے کے قطرے بھی چمک رہے تھے۔ اُسے بُل فائٹ کے تمام آداب بالائے طاق رکھ کر اب ہر صورت اس بُل کو ختم کرنا تھا ورنہ بُل کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ اس بُل فائٹ کو اس کی زندگی کی آخری بُل فائٹ بنا کر ہی رہے گا۔ وہ کسی صورت بھی یہ اکھاڑا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

"بس کمی ہوتی تو گرد چھپے باغوں میں سرسراہٹ سی سُنائی دیتی جیسے ہوا زیتون کے درختوں

میں چپکے سے دبے پاؤں چل رہی ہے۔ کیا اُندلس کی شامیں آج سے سینکڑوں برس پیشتر بھی ایسی ہی سحر انگیز تھیں۔ اگر تھیں تو تبھی لوگ ان شاموں پر فدا ہوئے اور یہیں کے ہو رہے جب تک کہ نکالے نہ گئے۔"

بالآخر بُل فائٹر دل کڑا کر کے پھر آگے بڑھا اور میدان میں گردن اُٹھائے بُل کو شتکارا۔ بُل نے اس بلاوے کو کوئی اہمیت نہ دی اور اس کی موجودگی سے بے نیاز بدستور ان ہزاروں تماشائیوں کو دیکھتا رہا جن کے ہاتھوں میں پکڑے سُرخ رومال پورے رنگ میں پھڑپھڑاتے کبوتروں کی طرح لہرا رہے تھے۔

"کبھی کبھار بجلی خاموشی سے چمکتی اور شیروں کے صحن پر سے ایک سنہری سانپ کی طرح لہراتی ہوئی گزر جاتی۔ تھوڑی دیر بعد سبز اور یخ بستہ ہوائیں الحمرا کے ایوانوں میں پاگل روحوں کی طرح چیخنے لگیں۔ سرو کے درخت دوہرے ہو کر بھیگی ہوئی سُرخ چھتوں کو چھونے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے بادل چھٹ گئے۔ سورج کی کرنیں ایک مرتبہ پھر شیروں کے صحن میں آنکلیں۔ مگر بصد حیرت میں نے دیکھا کہ الحمرا اب سفید نہیں تھا.... بلکہ تمام عمارت سُرمئی رنگ کی تھی.... جیسے دھواں لگا ہو کہ ٹوپاز کا پتھر ایک انتہائی مختصر وقفے کے بعد سرمئی رنگ بھی پھیکا پڑنے لگا جیسے مسامدار پتھر اسے ہولے ہولے چوس رہے ہوں اور پھر اس کی جگہ ہلکا گلابی رنگ الحمرا کی دیواروں سے پھوٹنے لگا۔"

بُل فائٹر ندامت کے بوجھ تلے دبا بُل سے مخاطب ہوا "ہے ہے...." بُل اپنے سُم ریت پر پٹخ کر اتنی سُرعت سے اس کی جانب بڑھا کہ بُل فائٹر اس کے قریب آنے سے پیشتر ہی سرخ کپڑا سمیٹ کر ایک طرف ہو گیا۔ ابھی وہ سنبھلنے نہ پایا تھا کہ بُل ایک مرتبہ پھر تیزی سے مڑ کر اس پر حملہ آور ہو گیا۔ انتہائی کوشش کے باوجود بُل فائٹر اس کا وار مناسب طریقے سے نہ روک سکا اور بڑھتے ہوئے سینگوں سے بچنے کی خاطر اچھل کر ایک جانب ہو گیا.... اس بُل کے قریب پھٹکنا کھلی خودکشی تھی.... اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ پکاڈور یعنی گھڑسوار نیزہ برداروں کو بُلا کر بُل کو برچھیوں سے پہلے بُری

طرح گھائل کیا جائے اور پھر اس کا کام تمام کر دیا جائے۔ بل نے اپنی جرأت سے لوگوں کے دل موہ لیے تھے۔ وہ یقینی موت کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کی بجائے سینہ سپر تھا۔

"فرڈیننڈ سے کہہ دینا جو سلاطین غرناطہ اسے خراج دیتے تھے وہ مر چکے۔ ہماری ٹکسالوں میں اب سکوں کی بجائے تلواریں ڈھلتی ہیں"

گھوڑوں پر سوار پہلا نیزہ بردار ابھی اکھاڑے میں داخل ہی ہوا تھا کہ بل نے آگے بڑھ کر اپنے تیز سینگوں سے گھوڑے کا رُوئی دار لبادہ پھاڑ کر اسے زمین پر گرا دیا۔

"فرڈیننڈ سے یہ بھی کہہ دینا کہ اگر وہ ہمارے ہتھیار چاہتا ہے تو خود آ کر ہم سے چھین لے"

دوسرے اور پھر تیسرے نیزہ بردار کا بھی یہی حشر ہوا۔ بل فائٹ کے منتظمین کے لیے یہ صورت حال انتہائی تشویشناک تھی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس بل کو صرف اجتماعی طور پر ہی گھائل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ بیک وقت چار نیزہ بردار میدان میں آئے اور بل کو گھیر کر اپنی تیز برچھیاں اس کی موٹی اور طاقتور گردن میں اُتار دیں۔ چار سُرخ فوارے الحمرا میں اُبلتے جھرنوں کی طرح فضا میں چھوٹے اور اکھاڑے کی ریت پہلی مرتبہ اس آران کا دابل کے خون سے آشنا ہوئی۔

"اسی باب البیرہ کی بلند محراب کے نیچے سے غرناطہ کا جری سپہ سالار موسےٰ زرہ بکتر اور بھاری تلوار کے بوجھ تلے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ویگا کے وسیع میدان میں داخل ہوا تھا اور تن تنہا دشمن سے لڑتا ہوا شینل کے پانیوں میں اتر گیا تھا"

فضا میں بلند چار خون آلود نیزے بل کو گھائل کرنے کے بعد اصطبل کی طرف واپس لوٹ رہے تھے۔ بل فائٹر دوبارہ اکھاڑے میں داخل ہوا تو حسب روایت بل سے کھیلنے کی بجائے فوراً ہی

صدرِ قتل گاہ سے اس بلائے ناگہانی کو ہلاک کر دینے کی اجازت چاہی۔ تماشائیوں نے اس قدیم داستان کی خلاف ورزی پر پُرجوش احتجاج کیا مگر بے سود۔۔۔۔ بُل فائٹر نے اجازت ملنے پر ایک ہاتھ میں سرخ کپڑا اٹھایا اور دوسرے میں تلوار سونت کر زخمی بُل کی جانب آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔

”غرناطہ کے گرد پھیلے ہوئے تمام باغوں اور فصلوں کو آگ لگا دی گئی اور دیہات مسمار کر دیئے گئے۔ تاریک راتوں میں عبداللہؑ اس کے رفقاءُ الحمرا کے جھروکوں سے دیکھا کرتے۔ بلند ہونے والے ان شعلوں کو بے بسی سے دیکھتے جو ان کی خوراک کی ترسیل کو خاک کر رہے تھے۔ موسم سرما کے اوائل میں ہی برفباری شروع ہو گئی اور باہر کی دنیا کے ساتھ تمام راستے مسدود ہو گئے۔“

بُل فائٹر آگے بڑھ رہا تھا۔ بُل نے لرزاں دستِ قاتل کو اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا تو پیچھے ہٹنے کی بجائے یوں والہانہ پن سے آگے بڑھا کہ قاتل کے ہاتھ بھی مسرت سے ہم آغوشی کی اس شدید چاہت کے مظاہرے سے کانپنے لگے۔ بُل فائٹر نے ایڑیوں سے اپنی طاقت کو سمیٹا، پورے جسم میں سے کھینچتا ہوا تلوار کی نوک تک لایا اور پھر تلوار بُل کی گردن میں گھونپ دی۔ دستے پر بھنچی پسینے سے تر مُٹھی بُل کے جسم میں اُترتی تلوار کی راہ میں حائل کٹتی رگوں اور آنتوں کے رقصِ بسمل کی تھرتھراتی ہوئی تڑپ سے آشنا ہوئی۔۔۔۔ کانپی اور یکلخت یوں کھل گئی جیسے دستے میں بجلی دوڑ گئی ہو۔ بُل فائٹر گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ بُل کا سیاہ وجود جیسے پتھرا گیا ہو لیکن وہ زمین پر گرا نہیں۔ اس کی باچھوں سے سیاہ سیّال رِسنے لگا اور پھر منہ سے خون کا ایک سیلاب بہہ نکلا۔ تلوار کی نوک پھیپھڑوں تک پہنچ کر انہیں کاٹ چکی تھی مگر گرنے کی بجائے وہ خلافِ توقع کھڑا رہا اور گردن اکڑائے اپنے گرد ”ہے تورو۔ ہے تورو“ کے نعرے لگاتے تماشائیوں کو دیکھتا رہا۔ مجھے مار کر تم اس بُل رِنگ سے دنیا بھر کی خوبصورتیوں کا خاتمہ کر دوگے۔ اُس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔۔۔۔ بُل فائٹر نے جھنجھلا کر اپنے معاون سے دوسری تلوار لی اور پھر روائتی انداز میں آگے بڑھنے کی بجائے ایک وحشی جانور کی طرح بُل پر جھپٹ پڑا۔ پہلا وار اوچھا پڑا۔ تلوار ایک ہڈی سے چیخ کر ہوا میں تیری اور پھر اکھاڑے کی ریت میں کھُب گئی۔ بُل فائٹر تماشائیوں کے طعنوں کی بوچھاڑ میں دانت کچکچاتا

ایک اور تلوار اٹھا لایا اور ساکت کھڑے بُل کی زخمی گردن پر بھرپور وار کرنے لگا۔ تلوار کٹی ہوئی آنتوں اور انتڑیوں میں اُترتی، باہر آتی اور اس سے پیشتر کہ اس کی نوک سے لہو کا پہلا قطرہ زمین پر گرے دوبارہ بُل کے جسم میں داخل ہو جاتی .... متعدد ضربوں کے بعد بُل کے قدم بے اختیار لڑکھڑانے لگے۔ بُل فائٹر پیچھے ہٹا اور ایک تحقیر آمیز مسکراہٹ لبوں پر سجائے کولہوں پر ہاتھ رکھ کر بُل کے گرنے کا انتظار کرنے لگا.... بُل اپنی پچھلی ٹانگوں کو بار بار سیدھا رکھنے کی کوشش کرتا مگر وہ بُری طرح لرز رہی تھیں۔ اُسے اب ہر صورت گر جانا چاہئے تھا مگر اس نے اپنے بوجھل جسم کو تھکن سے چور ٹانگوں پر کسی طور سنبھالے رکھا.... گرا نہیں! بل فائٹر نے نفرت سے ریت پر تھوکا اور قریب جا کر لہو سے رِستے گوشت پر ایک اور بھرپور وار کیا۔ اب تلوار کی نوک نے جیسے اس کی ٹانگوں کی پوری قوت باہر کھینچ لی ہو.... بُل اسی دم لڑکھڑا کر ریت پر پھیلے اپنے ہی خون میں گر گیا....

بُل فائٹر نے ہاتھ اٹھا کر حسب روایت اپنے اس کارنامے کی داد چاہی مگر اس کے بدلے میں بپھرے ہوئے تماشائیوں نے اس پر جوتوں اور بوتلوں کی بارش کر دی۔ یہ کھیل نہیں تھا صرف قتل تھا.... اس افراتفری میں کسی نے یہ نہ دیکھا کہ بُل نے پہلے بمشکل اپنی گردن اٹھائی اور پھر کسی نامعلوم طاقت کو بروئے کار لا کر اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ بُل کے کھڑے ہوتے ہی پورے بُل رِنگ میں موت کی خاموشی طاری ہو گئی۔ تماشائی کسی فلم کے ساکت منظر کی طرح گم سُم اور بے حس و حرکت ہو گئے۔ بُل فائٹر نے اس فوری سکوت سے حیرت زدہ ہو کر خاموش تماشائیوں کی جانب دیکھا اور پھر ان کے زاویۂ نگاہ کا پیچھا کرتے ہوئے اس مقام کی جانب مڑا جہاں بُل کی لاش ہونی چاہئے تھی۔

اس نے بُل کو دیکھا ضرور مگر ریت پر مُردہ حالت میں نہیں بلکہ اپنی طرف دوڑتے ہوئے .... اور اگلے لمحے بُل کے خون آلود سینگ اس کے جسم میں اتر رہے تھے۔ بُل کا پورا بدن سینگوں کی راہ میں حائل کٹتی رگوں اور آنتوں کے رقصِ بسمل کی تھرتھراتی ہوئی تڑپ سے آشنا ہوا.... ساکت منظر ایک دھماکے سے حرکت میں آیا اور تماشائیوں نے "بیے تورو۔ بیے تورو" کے تحسین آمیز نعروں سے بُل رِنگ کے در و دیوار ہلا دیئے۔ گیلری سے فوراً معاونین اکھاڑے میں داخل ہوئے اور اپنے زخمی ساتھی کو اٹھا کر باہر لے گئے۔

بُل کا سیاہ بدن خون سے لتھڑا ہوا تھا۔ پہلی تلوار ابھی تک اس کی گردن میں پیوست تھی مگر وہ

اسی حالت میں گیلری کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ دوڑنے لگا۔ وہ جدھر سے گذرتا تماشائی اس پر پھول برسے اور رومال اور ہیٹ نچھاور کرنے لگتے۔ اس کے پیچھے منہ اور گردن سے بہنے والا خون ریت پر نقش و نگار بنا رہا تھا۔ جرأت اور استقامت کے ایسے نقش جو صدیوں تک روشن رہیں گے۔ اس کی دھندلاتی ہوئی نظریں آخری مرتبہ اس اکھاڑے کا دیدار کر رہی تھیں جہاں سے اُسے زبردستی نکالا جا رہا تھا۔

"بس سٹیشن پر جا کر کسی بھی سمت کو جاتی ہوئی بس پر سوار ہو جاؤں گا... منزل کا تعین کئے بغیر کہ مقصد صرف اپنی بینائی سے محروم ہوتی ہوئی آنکھوں کو آخری مرتبہ اپنے پیارے وطن کے دھندلے نقش و نگار دکھانا ہے۔ بوڑھے جسم سے اس دھرتی کو چھونا ہے جس میں میرے دوستوں میرے پیاروں کا خون جذب ہے..."

اس دوران سادہ کپڑوں میں ملبوس بُل رنگ کے چند ملازمین ہاتھوں میں خنجر لئے اکھاڑے میں اُترے اور بُل کو گھیرے میں لے کر اس پر پل پڑے۔ بُل کے زمین پر گرتے ہی ایک کڑیل ہسپانوی نے اس کی شہ رگ کاٹ دی۔ ستونوں سے بندھی روشنیاں گُل ہو گئیں اور اکھاڑے کو تاریکی نے لپیٹ میں لے لیا۔
اُس شب بارسلونا کے پلازا دے تورو میں کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو بُل کی موت پر اشکبار نہ ہوئی ہو۔ ایک ایسا بُل جس نے اس اکھاڑے کو جرأت اور خوبصورتی سے روشناس کروایا تھا۔ اُسے مرنا نہیں چاہیئے تھا مگر مخالف قوتوں نے اس کی بے جگری کے باوجود اُسے جلا وطن کر دیا کہ وہ اس اکھاڑے میں کسی اور کو فتح مند نہیں دیکھ سکتے تھے۔ تماشائی جنہوں نے پوری بُل فائٹ عالم اضطراب میں کھڑے ہو کر دیکھی تھی بوجھل قدموں سے باہر نکلنے لگے۔ اکھاڑے کے ملازمین بُل کی خون آلود لاش کو رسّوں میں جکڑ رہے تھے۔ بُل کی مردہ آنکھیں کھلی تھیں۔
اصطبل کا دروازہ کھولنے والے بوڑھے نے خچروں کو چابک سے پیٹا اور وہ رسّوں میں جکڑے مُردہ بُل کو آہستہ آہستہ گھسیٹنے لگے.... بُل کے گھسٹنے سے ریت پر ایک راستہ سا بنتا چلا جا رہا تھا جو اُس کے ہونے کا.... اُس کے وجود کا.... اس کی رہگذر کا پتہ دے رہا تھا.... ایک ملازم ایک لمبے

بُرش کی مدد سے ریت پر سے اس راستے کو بھی مٹاتا چلا جا رہا تھا تاکہ اس کے وجود کا کوئی ثبوت کوئی نشان باقی نہ رہے۔ تجرّ اصطبل کے دروازے میں داخل ہوئے تو اکھاڑے میں گھسٹتے بُل کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔۔۔۔ اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں کھلی تھیں۔

اے مخاطب دیکھو اور جب تو دیکھے گا
کہ قصرِ الحمرا سے تجھ تک گل و لالہ کا سلسلہ قائم ہے۔

— ۱۲ر نومبر ۷۵ء —

لاہور